اقبالؒ کا تصوّرِ دین

شفیق الرّحمٰن ہاشمی

اقبالؒ کا تصوّرِ دین

پروفیسر شفیق الرحمٰن ہاشمی

اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

۱۷۸۱- حوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

© اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

نام کتاب : ——— اقبالؒ کا تصورِ دین

نام مصنف : ——— پروفیسر شفیق الرحمٰن ہاشمی

بار اول : ——— ۱۹۹۰ء

بار دوم : ——— ۱۹۹۶ء

مطبع : ——— روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

قیمت : ——— ۹۵/۰۰ روپے

ناشر

اسلامک بک فاؤنڈیشن

۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرستِ مضامین

ابواب	مضامین	صفحہ
	دیباچہ	۷
پہلا باب ـــــ	اللہ تعالیٰ کی حاکمیت	۱۵
	۱۔ حاکمِ اعلیٰ اور معبودِ حقیقی "اللہ تعالیٰ"	۱۵
	۲۔ اسلام کا آئین ـــ قرآن پاک	۲۱
	۳۔ مقصودِ رسالت	۲۴
	۴۔ توحید	۳۰
	۵۔ اطاعت	۳۹
	۶۔ عشقِ رسولؐ	۴۳
دوسرا باب ـــــ	ملتِ اسلامیہ اور اس کا مقصد	۵۷
تیسرا باب ـــــ	ارکانِ اسلام کی حقیقت	۷۳
	۱۔ ایمان باللہ ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ	۷۴
	۲۔ نماز	۸۰
	۳۔ روزہ	۸۵
	۴۔ حج	۸۷
	۵۔ زکوٰۃ	۹۰
چوتھا باب ـــــ	دین اور قوت	۹۴

مضامین — صفحہ

پانچواں باب ——— مردِ مومن کی صفات ۱۰۱

۱۔ خود می ۱۰۱

۲۔ فقر ۱۱۳

۳۔ یقینِ محکم ۱۲۸

۴۔ جرأت و قوت ۱۳۹

۵۔ سخت کوشی ۱۴۴

۶۔ خطر پسندی ۱۵۳

۷۔ عزم و توکّل ۱۵۵

۸۔ ذوقِ تحقیق و تجسّس ۱۵۶

۹۔ مردِ مومن کی بعض دیگر صفات ۱۵۹

چھٹا باب ——— عبادت ۱۶۹

ساتواں باب ——— اسلام اور اجتماعیت ۱۷۳

آٹھواں باب ——— امامت ۱۸۰

۱۔ صداقت ۱۸۱

۲۔ عدالت ۱۸۲

۳۔ شجاعت ۱۸۳

۴۔ بلندیٔ نگاہ ۱۸۵

۵۔ دلنوازیٔ سخن ۱۸۶

۶۔ سوزِ دروں ۱۸۷

نواں باب ——— اسلام میں عورت کی حیثیت ۱۹۳

دسواں باب ——— دین کے متعلق غلط تصوّرات ۲۱۱

۱۔ تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ۲۱۲

مضامین	صفحہ
۲۔ خانقاہی نظام	۲۶۴
۳۔ مشرکانہ رسوم وعقائد	۲۹۱
۴۔ دین وسیاست کی علیحدگی	۳۱۵
گیارہواں باب ——— روایاتِ ملّیہ	۳۳۰
۱۔ صبر واستقامت	۳۳۰
۲۔ شوقِ شہادت اور بہادری	۳۳۴
۳۔ حق گوئی و بے باکی	۳۳۸
۴۔ اطاعتِ امیر	۳۴۱
بارہواں باب ——— مسلمان کا نصب العین ۔ اعلائے کلمۃ اللہ	۳۴۴
۱۔ شہادتِ حق	۳۴۵
۲۔ امانتِ خلافت	۳۵۰
۳۔ جہاد	۳۵۲


محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم
حامد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

دیباچہ

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دین براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا۔ اس لئے ان کے ذہنوں میں دین کے متعلق کسی قسم کا ابہام نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اُن کے سامنے تھا۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں دین کی عملی تفسیر اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس لئے وہ خود بھی اس مکمّل دین پر عمل پیرا رہے اور آئندہ نسلوں کو بھی یہ امانت مِنۡ وَعَنۡ تفویض کر کے دُنیا سے رُخصت ہوئے۔

بعد کے ادوار میں مختلف ممالک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے، غیر مسلموں کے ساتھ ان کے روابط بڑھے، خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی، مسلمان کئی سیاسی اور مذہبی گروہوں میں تقسیم ہو گئے، دین کو جو غلبہ اور اقتدار خلفائے راشدین کے زمانے میں حاصل تھا باقی نہ رہا تو اس کے متعلق فکری ہم آہنگی بھی مفقود ہو گئی جو صحابۂ کرامؓ میں موجود تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کی تشریح و تفسیر میں اختلاف رُونما ہونے لگا، مسلمانوں کی سوچ اور فکر کے دھارے مختلف سمتوں میں بہنے لگے اور دین اور سیاست کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

اسلام میں مختلف مذاہب سے جو لوگ داخل ہوئے وہ بعض مشرکانہ رسوم بھی اپنے ساتھ لائے جو دین میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی گئیں۔ بادشاہت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تو اسلام میں بہت سی جاہلانہ رسوم عود کر آئیں جو جاہلی معاشرے کا خاصہ تھیں اور جنہیں اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ بادشاہت ہی کے زیرِ سایہ امراء، حکّام اور اہلِ لشکر کے علاوہ ایک ایسا

طبقہ وجود میں آیا جسے قرآن کے الفاظ میں " مُتْرَفِیْن " کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اِن کی زندگیوں میں جاہلانہ رسوم نے گھر کیا اور پھر ان کی رسوم وعادات تہذیب و معاشرت کا حصّہ بن گئیں اور عوام النّاس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بادشاہت کا چونکہ ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی سرپرستی میں جو بھی ادب، فلسفہ اور علوم وفنون مرتّب ہوئے ان میں اسی مزاج کا عکس نظر آتا ہے۔ حتّٰی کہ رقص، موسیقی، تصویر کشی میں مسلمانوں کی مہارت کو ترقی کا نام دیا گیا اور جن بادشاہوں نے ان فنون کی سرپرستی کی، ان کے ان کارناموں کو اسلامی تہذیب وتمدّن کی خدمات میں شمار کیا گیا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر دین دار طبقے نے سیاست سے بالکل لاتعلقی اختیار کر لی جس سے معاشرے میں ایک مایوسانہ نقطۂ نظر پھیلا۔ اسلامی علوم وفنون میں جمود اور تنگ خیالی آ گئی۔ اور ساری دین داری چند مذہبی اعمال تک محدود ہو کر رہ گئی، پوری زندگی جہاد میں بسر کرنے اور دینِ حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کا جذبہ دلوں سے محو ہو گیا۔ بادشاہوں نے درباری اور دنیادار علماء کی مدد سے ایسے غلط تصوّرات کی خوب سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایسی ایسی بدعات رواج پا گئیں جنہیں اگر شرکِ جلی کا نام نہ بھی دیا جا سکے تو انہیں شرکِ خفی کے زُمرے سے نہیں نکالا جا سکتا۔ مسلمانوں کی توجہ خالص خدا پرستی سے ہٹ کر بادشاہ پرستی، اکابر پرستی اور مقابر پرستی کی طرف مبذول ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام نے مسلمانوں پر تسلّط حاصل کیا تو انہیں مسلمانوں کی ابتدائی مزاحمتوں کے بعد حکومت کرنے میں کسی قسم کی دِقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ مسلمان پہلے ہی سے غلامی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان غیر اقوام کو مسلمانوں ہی میں سے ایسے ایسے مفکّر مِل گئے جنہوں نے قوم کو اسی حالت پر قانع رہنے کا درس دیا اور حکمرانوں کی اطاعت کے متعلق قرآن وحدیث سے دلائل تلاش کر کے لوگوں کو غیر مسلم حکمرانوں کے تحت غُلامانہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔

علّامہ اقبال کے نزدیک غلامی صرف اس بات کا نام نہیں کہ مسلمانوں پر کوئی غیر قوم تسلّط حاصل کر کے انہیں اپنا محکوم بنا لے۔ بلکہ مسلمانوں کا غیر اللہ کی اطاعت پر مجبور رہنا یا اپنی ذہنی پستی کی وجہ سے خود کو ان کے غیر شرعی احکام کا پابند بنا کر اپنے آپ کو آزادیٔ فکر وعمل سے محروم

کرلینا بھی غُلامی ہے۔ خواہ ایسے حاکم اور پیشوا مسلمان ہی کیوں نہ ہوں ؎

دَورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم — اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اِس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور — سینکڑوں صدیوں سے خُوگر ہیں غُلامی کے عوام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پُختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں عوام

ان ساری باتوں کے باوجود امتِ مسلمہ میں اولیاء اللہ اور علماءِ حق کا ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہا ہے جنہوں نے غیر اللہ کی پرستش کی بجائے خدا کی پرستش کا درس دیا اور دین کو اس کی اصلی روح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان بزرگوں ہی کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور میں قلبِ سلیم رکھنے والے مسلمانوں کے لئے شرک و بدعت کے غبار میں حقیقی دین کو پہچاننا کبھی مشکل نہیں رہا۔

ایسے ہی دین کا فہم و ادراک اور ملّتِ اسلامیہ کا درد رکھنے والے مسلمان رہنماؤں میں ایک علامہ اقبال بھی تھے۔ انہوں نے دین کے متعلق جو تصوّر پیش کیا ہے اس کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد کتاب و سنّت سے براہِ راست دین کا مفہوم اخذ کرنے والوں اور اپنے اپنے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کی کورانہ تقلید کرنے والوں کے دینی تصوّرات کا واضح فرق معلوم ہو جاتا ہے ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

علامہ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں دین کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں یک جا کر کے زیرِ نظر کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حاکمِ اعلیٰ اور معبودِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے علاوہ انسان جن کو بھی حکمران سمجھ کر ان کی غیر مشروط اطاعت کا دَم بھرتا ہے وہ سب کے سب بتانِ آذری ہیں۔ قرآنِ پاک کی تعلیم، توحید کا مطلب، رسالت کا مقصود، اطاعت کا مفہوم اور عشقِ رسولؐ کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ، خالق، مالک اور رازق مانا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی لائی ہوئی شریعت پر خود بھی عمل کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

دوسرا باب "ملتِ اسلامیہ اور اس کا مقصد" ہے۔ دوسری اقوام کی طرح ملتِ اسلامیہ رنگ، نسل یا وطن کی بنیاد پر عرضِ وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کی تشکیل کلمۂ توحید پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوّت کا دروازہ بند کر کے کارِ نبوّت امّتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ امّت شاہد علی الاقوام ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ عطا ہوا ہے اسے دوسروں تک پہنچائے۔

تیسرا باب "ارکانِ اسلام کی حقیقت" ہے۔ ارکانِ اسلام محض مقصود بالذّات نہیں بلکہ مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہیں اور وہ مقصود اقامتِ دین یا پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنا اور خلافتِ الٰہی کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ ایمان باللہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اس مقصد کے لئے مردِ مومن کو تیار کرنے کے لئے اس کی تربیت کرتے ہیں۔

چوتھا باب "دین اور قوّت" ہے۔ دین کو غالب کرنے اور اسے نافذ کرنے کے لئے قوّت، طاقت اور اقتدار کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر دین کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ دین اپنی شان و شوکت کے ساتھ اسی وقت جلوہ گر ہوتا ہے جب حکومت کا نظم و نسق اس کی ہدایات کے مطابق چلایا جائے۔ دین کے بغیر حکومت اور اقتدار زہرِ ہلاہل ہے لیکن جب یہی قوّت اور طاقت دین کی حفاظت میں استعمال کی جائے تو ہر زہر کا تریاق بن جاتی ہے۔

پانچواں باب "مردِ مومن کی صفات" ہے۔ اسلام مردِ مومن میں خودی، فقر، یقینِ محکم، جرأت و قوّت، سخت کوشی، خطر پسندی، عزم و توکّل، ذوقِ تحقیق و تجسّس اور بعض دیگر صفات پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ہر میدان میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کر کے نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم کرنے کے قابل ہو سکے۔

چھٹا باب "عبادت" ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ محض ارکانِ اسلام کی پابندی سے ہی عبادت کا حق ادا نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور سنّتِ رسولؐ کی اتّباع کرنے کا نام عبادت ہے۔ مسجد میں نماز پڑھ لینا اور مسجد سے باہر اپنے نفس، زمانے یا خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کی اطاعت کرنا خدا کی بندگی نہیں بلکہ زمانے کی بندگی ہے۔ اسلام اس قسم کے تضاد اور منافقت کو پسند نہیں کرتا۔

ساتواں باب " اسلام اور اجتماعیت " ہے ۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو انفرادی زندگی کی بجائے اجتماعی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لئے نماز باجماعت فرض کی گئی ہے اور حج کے موقع پر پوری دُنیا کے مسلمانوں کو اجتماع کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا اتحاد تفرقہ پرستی کو خیرباد کہنے اور حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لینے سے وجود میں آسکتا ہے ۔ یہ اتّحاد صرف علاقائی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کا ہونا چاہیئے۔ ہر مسلمان کو جماعت سے وابستہ رہ کر اسلام کی بالادستی کے لئے کام کرنا چاہیئے۔

آٹھواں باب " امامت " ہے ۔ مسلمانوں کا سربراہ ، امیر یا امام ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے کچھ خاص صفات درکار ہوتی ہیں۔ جو شخص ان صفات سے متّصف ہو ، امامت یا امارت کی ذمّہ داری اسی کو سونپی جائے اور وہ صفات یہ ہیں کہ صادق اور امین ہو ، عادل ہو ، شجاع ہو ، صاحبِ نظر ہو ، شیریں سخن اور صاحب درد ہو۔

نواں باب " اسلام میں عورت کی حیثیت " ہے ۔ اسلام نے عورت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے ۔ اور اسے بحیثیت ماں ، بیٹی اور بیوی بڑا بلند مقام عطا کیا ہے ۔ عورت کی اوّلین ذمّہ داری گھر کی نگہداشت اور بچّوں کی تربیت ہے ۔ عورت کے لئے بہترین نمونہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ عورتوں نے اپنے اصل منصب کو نہیں پہچانا اس لئے ان کی گود میں پلنے والا کوئی بچّہ حُسینؓ نہیں بن سکا۔ دورِ جدید کے فرعونوں کی یہ حکمتِ عملی ہے کہ وہ عورتوں کو بے پردہ کر کے رونقِ محفل بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ بچّوں کی صحیح تربیت کر کے مجاہد پیدا نہ کر سکیں اور اس طرح ان کی خدائی کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہے ۔ اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اقامتِ دین کا فریضہ سرانجام دینا مَردوں کی طرح عورتوں کی بھی ذمّہ داری ہے اور وہ یہ ذمّہ داری اس طرح پوری کر سکتی ہیں کہ بچّوں میں مردِ مومن کی صفات پیدا کریں جو امام حسینؓ کی طرح باطل سے ٹکرا جانے کا عزم لے کر اٹھیں اور دنیا میں اسلام کو غالب کرنے کا فریضہ سرانجام دیں ۔

دسواں باب " دین کے متعلق غلط تصوّرات " ہے ۔ مرورِ ایّام کے ساتھ دین میں ایسے ایسے غلط تصوّرات شامل ہو گئے ہیں جن کا دینِ حنیف سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں پہلی بات تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ہے ۔ اسلام مردِ مومن کو اللہ کے سپاہی کے طور پر زندگی گزارنے ، طاغوتی

طاقتوں کا مقابلہ کر کے نظامِ باطل کو مٹانے اور نظامِ حق قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ابتدائی دَور میں تصوّف شریعت سے الگ کوئی چیز نہ تھا۔ شریعت کے تحت جہاد، فقر اور زہد و تقویٰ میں کمال حاصل کرنے کا نام تصوّف تھا۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ہو گئی جن کے ذریعے جہاد کا جذبہ ختم ہو گیا اور محض تسبیح و مناجات کے ذریعے اصلاحِ نفس کو تصوّف کا حاصل سمجھ لیا گیا۔ جس سے مسلمانوں میں بے عملی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

دوسرا غلط تصوّر "خانقاہی نظام" ہے۔ یہ بھی تصوّف کا ہی ایک پہلو ہے۔ جس نے آہستہ آہستہ قبر پرستی اور ولی پرستی کے لئے راہ ہموار کی۔ اس طرح جو امور بیت اللہ کے لئے مخصوص تھے وہ سارے کے سارے مزاروں کے لئے انجام دیئے جانے لگے اور مسلمانوں کی توجہ اپنے اصل مقصد یعنی دین کی بالادستی قائم کرنے کے لئے جہاد سے ہٹ گئی۔

تیسرا غلط تصوّر "مشرکانہ رسوم و عقائد" ہیں۔ جو دین انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے ہٹا کر خالص اللہ کی پرستش کا درس دینے کے لئے آیا تھا اس میں وسیلۂ تقرب الی اللہ کے بہانے ایسی ایسی مشرکانہ رسوم داخل کر دی گئیں جن کو مٹانا تمام انبیاء و رُسل کا مقصد رہا ہے۔ غیر اللہ کو حاجت روا سمجھ لیا گیا، جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے خاص تھیں بندگانِ خدا کو ان سے متصف کر دیا گیا اور جو اعمال اللہ کے لئے مخصوص تھے وہ اس کے بندوں کے لئے سرانجام دیئے جانے لگے۔

چوتھا غلط تصوّر "دین و سیاست کی علیحدگی" ہے۔ اسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے جو کاروبارِ حکومت سے لے کر انسان کی نجی زندگی تک کے معاملات میں رہنمائی کرتا ہے۔ سیاست کو دین سے الگ تصوّر کر لیا گیا تو کسی مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی مکمّل اطاعت ممکن نہ رہی۔ دین سے برگشتہ انسان اپنی مرضی کے قوانین نافذ کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے کی بجائے اپنی خدائی کا ڈنکا بجانے لگے۔ ایسی صورتِ حال میں محکوموں کی زبان پر اگرچہ خدا کا نام ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ حکمران کی بندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ حقیقی بندگی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے سے ادا ہو سکتا ہے۔

گیارہواں باب "روایاتِ ملّیہ" ہے۔ ہر قوم کا حال ماضی سے وابستہ ہوتا ہے اور حال سے اس کا مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ جو قوم ماضی کی شاندار روایات کو فراموش کر دیتی ہے وہ زوال کے قریب

ہو جاتی ہے۔ لازوال زندگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں کی یاد تازہ رکھی جائے۔ ہمارے اسلاف نے دینِ متین پر عمل کرتے ہوئے جو عظیم الشان روایات قائم کی ہیں وہ ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ہمیں ان روایات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں تاریخِ اسلام سے صبر و استقامت، حق گوئی و بے باکی، بہادری و شوقِ شہادت اور اطاعتِ امیر کے ذریعے نظم و ضبط کی چند ایمان افروز روایات کا تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ مسلمان انہیں مشعلِ راہ بنا سکیں

بارہواں باب "مسلمان کا نصب العین۔ اعلائے کلمۃ اللہ" ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمان کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ یا اقامتِ دین ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے ملک میں اور پھر دنیا میں اللہ کے کلمہ کو بلند کرے اور اس مقصد کے لئے اپنی پوری زندگی جہاد میں بسر کرے تاکہ روئے زمین جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے مسجد کا درجہ دیا ہے کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرا کر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کام کرنے کی مکمل رہنمائی ہمیں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو اس کسوٹی پر پرکھ سکیں اور دین کو غالب کرنے کے لئے اسی طرح جد و جہد کریں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔

امید ہے یہ کتاب مسلمان کو اپنا نصب العین متعین کر کے نئے ولولے کے ساتھ اسے حاصل کرنے کے لیے متحرک اور فعال ہونے میں معاون ثابت ہوگی اور اس کا مطالعہ ہر مسلمان کو اپنے کردار کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوگا۔

آخر میں میں ان مؤلفین و مصنفین کا شکریے کے ساتھ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی کتاب سے اس کتاب کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں علامہ اقبال کے شعری مجموعۂ کلام کے علاوہ ان کی کتاب تاریخِ تصوف مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی۔ مکاتیبِ اقبال: اقبال اکادمی کراچی۔ تاریخِ اسلام: عبدالرحمٰن شوق۔ تجلی: شاہ بلیغ الدین۔ تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور تقویۃ الایمان: مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ مجھے ان تمام مضمون نگاروں اور مصنفین کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جن کی نگارشات

کسی کتاب یا رسالے میں میری نظر سے گزریں اور ان کی کچھ باتیں اس کتاب میں کام آئیں۔

شفیق الرحمٰن ہاشمی

۱۶، فروری ۱۹۸۷ء

پہلا باب

اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت

حاکمِ اعلیٰ اور معبودِ حقیقی "اللہ تعالیٰ"

دنیا پر حکمرانی کرنے کی اصل حقدار وہ ذات ہو سکتی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہو اور اس کے تمام گوشوں سے واقف ہو، جس کی اپنی کوئی غرض اور خواہش نہ ہو، جو کسی کی محتاج نہ ہو، جو دنیا کو روشن کرنے کے لئے سورج کو تابندگی دے سکے، جو انسانوں کی تمام ضروریات سے واقف ہو اور انہیں پورا کرنے کے لئے چیزوں کو عدم سے وجود میں لا سکے، جو علیم و خبیر اور غیر فانی ہو تاکہ لوگوں کی مستقبل کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ سکے۔ چونکہ یہ صفات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس لئے وہی حاکمِ اعلیٰ ہے۔

قرآن پاک میں ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف)، اپنا حکم چلانا صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ بندوں کو تو اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ کیونکہ بندوں کے لئے صحیح طریقِ زندگی یہی ہے۔ مگر بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے۔ اس کی ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ وہ اس کے ایک ایک ذرّے سے باخبر ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں کام کر رہی ہیں، سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ سورج، چاند، ستارے اسی کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دریا، سمندر اور پہاڑ اسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ان سب چیزوں کا

مالک ہے۔ انسان کو اسی نے پیدا کیا ہے اور دنیا کی تمام چیزیں جو اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اس کے لئے مسخر کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ رہنے والی ہے۔ باقی تمام چیزیں فانی ہیں۔ اس کا کوئی ہمسر اور ثانی نہیں۔ وہ مالک ہے اور تمام انسان اس کی رعایا ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں اور باقی تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ اس لئے اس کی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے بندوں پر کسی کو حکم چلانے کا اختیار نہیں ہے۔ کوئی بادشاہ ہو یا شاہی خاندان، کوئی فرد حکمران ہو یا کوئی جمہوری ادارہ، کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا بنایا ہوا قانون خدا کے بندوں پر چلائے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ کر اپنا قانون چلائے تو وہ باغی کہلائے گا اور جو لوگ برضا و رغبت اس قانون کو تسلیم کریں گے وہ بھی سرکش کہلائیں گے۔

اگر ہم کسی انسان یا ادارے کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر کے قانون سازی کے مکمّل اختیارات اسے سونپ دیں تو یقیناً وہ ایسا قانون بنائے گا جس سے اس کی اپنی اغراض اور خواہشات پوری ہوں خواہ وہ عوام کے لئے مفید ہو یا نہ ہو۔ یوں انسان دنیا میں انسان کا غلام بن کر رہ جائے گا۔ طاقتور کمزور کا استحصال کرے گا اور اس طرح معاشرے میں فتنہ و فساد برپا ہو گا۔ اس لئے انسان کا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا بندہ بنا کر بھیجا ہے اور اپنے ہی احکام کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ دنیا میں غیر اللہ کی اطاعت بدترین غلامی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت بہترین آزادی ہے۔ اس لئے مسلمان کسی کی غلامی قبول نہیں کرتا۔ نہ وہ خود کسی کا غلام ہوتا ہے نہ اس کا کوئی غلام ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف خدا کے آئین کا پابند بناتا ہے۔

انسانی عقل نہ تو مستقبل کی ضروریات کا لحاظ رکھ سکتی ہے اور نہ ہی دوسروں کا فائدہ دیکھ سکتی ہے۔ اس لئے انسان کا بنایا ہوا قانون کسی طرح بھی انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔

جب غیر اللہ کا قانون نافذ ہو تو طاقت ور کمزور پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرنا ہی کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اس نے بذریعہ وحی انسانوں کو جو آئین دیا ہے، انسانیت کا مفاد اسی پر عمل کرنے میں ہے۔ چونکہ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اس لئے اس نے جو آئین دیا ہے اس میں کسی خاص طبقے کا فائدہ نہیں بلکہ سب انسانوں کا فائدہ مضمر ہے۔

انسان مختلف جذبات رکھتا ہے۔ کسی سے اس کی دوستی ہوتی ہے۔ کسی سے دشمنی ہوتی ہے۔ کبھی اس کے سامنے اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ کبھی اپنے اعزہ و اقربا کا مفاد پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا بنایا ہوا قانون عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی غرض نہیں۔ اس لئے اس کا قانون سب کے لئے یکساں ہوگا۔ صرف اسی کے بنائے ہوئے قانون سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں ؎

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس
عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح و اندر ہم مصاف
وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتواں قاہر شود
زیرِ گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوا اللہ کافری است ۔

مسلمان ہر مقام سے بے نیاز ہوتا ہے ۔ نہ وہ کسی کا غلام ہوتا ہے نہ اس کا کوئی غلام ہوتا ہے، مسلمان بس آزاد ہوتا ہے ۔ اس کا ملک اور آئین خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اپنا خیال رکھنے والی عقل غیر کی بہتری سے غافل ہوتی ہے ۔ وہ اپنا فائدہ دیکھتی ہے اور غیر کا فائدہ نہیں دیکھتی۔ اللہ تعالیٰ کی وحی سب کا فائدہ دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب کا فائدہ اور بہتری ہوتی ہے۔ وہ صلح اور جنگ میں عادل ہوتی ہے۔ وہ دور و نزدیک کے ساتھ نہ تو کسی قسم کی رعایت کرتی ہے اور نہ کسی کا خوف رکھتی ہے ۔ جب حکم دینے والا اور منع کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ہو تو طاقتور کمزور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ دنیا میں حکمرانی غالب اور طاقتور کی ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کے سوا غیر کی حکمرانی کفر ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کے شرف کو اس طرح قائم رکھا کہ اسے اپنے سوا کسی کے آگے نہ جھکنے کا حکم دیا۔ لیکن انسان اپنی کم نگاہی سے اس شرف کو بحال نہ رکھ سکا اور اس نے غیر اللہ کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈال کر اپنے آپ کو قعرِ مذلت میں گرا لیا۔ اس کے پاس عزت و شرف کا جو موتی تھا اسے اس نے حاکموں اور بادشاہوں کی نذر کر دیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی غلامی اور بندگی کرنے کی بجائے دنیوی حکمرانوں کی غلامی اختیار کر لی۔ انہوں نے اسے اللہ تعالیٰ کے آگے جھکانے کی بجائے اپنے آگے جھکایا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرانے کی بجائے اپنے احکام منوائے اور اس قسم کی غلامی اختیار کرنے والوں نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی غلامی کر کے اپنے آپ کو اپنے اصل مقام سے کس قدر گرا رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ کتے کتوں کے آگے سر نہیں جھکاتے لیکن انسان ایسا گیا گزرا ہے کہ وہ

اس معاملے میں ان کی زندگی سے بھی سبق حاصل نہیں کرتا اور یہ نہیں سوچتا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اسے صرف اسی ذات کے آگے سر جھکانا چاہیئے اور غیر اللہ کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت وَلے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
مَن ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

آدمی نے اپنی کم نگاہی سے آدمی کی بندگی کی۔ اس کے پاس موتی تھا لیکن اس نے بادشاہوں کی نذر کر دیا۔ یعنی وہ غلامی کی عادت میں کتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کُتے نے کسی کتے کے آگے سر جھکایا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اور بندگی اسی صورت میں ہوتی ہے جبکہ ملک میں مکمل اسلامی نظام نافذ ہو اور ملک کے تمام قوانین کتاب و سنّت کے مطابق ہوں۔ اگر ملک میں اسلامی قانون نافذ نہ ہو تو کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ معاشی، معاشرتی، عائلی اور بہت سے ایسے معاملات ہوں گے جن میں اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی اطاعت کرنی پڑے گی جو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے علی الرغم کسی فردِ واحد یا ادارے کے بنائے ہوئے ہوں گے۔ ایسی صورت میں کوئی شخص خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کیسے دعویٰ کر سکتا ہے! زبان سے کوئی کتنا ہی اللہ اللہ کرنے والا ہو حقیقت میں اس کا معبود وہی حکمران قرار پائے گا جس کے احکام کی وہ اطاعت کر رہا ہے۔

گرچہ بر لب ہائے اُو نامِ خُدا ست !!!
قبلۂ او طاقتِ فرماں روا ست

گرچہ اس (محکوم) کے لبوں پر خدا کا نام ہوتا ہے لیکن اس کا قبلہ فرماں روا کی طاقت ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو اپنے

عبودیت کا اظہار کرنے کے لئے اسی کی بندگی کرنی چاہیئے کیونکہ وہی اکیلا کائنات کی تمام قوتوں کا مالک ہے۔ انسان کی دعاؤں کو پورا کرنا یا نہ کرنا اسی کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص اس کے اس اختیار کے آگے دَم نہیں مار سکتا۔ وہ انسان کی قسمت کا مالک ہے۔ کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ کسی کی قسمت کو بگاڑ یا سنوار سکے۔ وہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزّت و تکریم بخشی ہے اور اسے دنیا میں اپنا نائب بنایا ہے۔ اس کی نیابت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ سمجھے اور اسی کے احکام بجا لائے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس کی ذات کے سوا تمام چیزیں فانی ہیں۔ حکم اُسی کے لئے ہے اور اُسی کی طرف لَوٹ کر جانا ہے۔

حاکم اور معبود وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی ہو۔ جسے کبھی اونگھ اور نیند نہ آتی ہو۔ جو کسی کی محتاج نہ ہو۔ جو ہر وقت موجود ہو اور ہر پکارنے والے کی پکار کو سُن سکے۔ ایسی ذات صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔ کائنات میں کوئی اُس کا ہم سر نہیں۔ اُسے فنا نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔ اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ ہر پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر اور موجود ہے۔ یہ صفات چونکہ کسی اور ذات میں نہیں پائی جاتیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں حاکم نہیں۔ اسی لئے اس کے سوا کسی دوسرے کو معبود سمجھ کر پکارنے سے منع کیا گیا ہے ؎

آہ اے مردِ مسلماں کیا تجھے یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَر

جو شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معبود سمجھ کر اس کے آگے جھکتا ہے وہ اپنی تذلیل کا

سامان خود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو عزّت و آبرو قائم رکھنے کے لئے اسے اپنے سوا کسی کے آگے جھکنے کا حکم نہیں دیا۔ حقیقت میں انسان کا شرف اسی میں ہے کہ وہ خدائے واحد کے سوا کسی کے آگے سجدہ ریز نہ ہو۔ اپنی دعاؤں میں اسی کو پکارے اور اسی کی بندگی کا اہتمام کرے۔

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ جس سے ہو ہر سجدہ تجھ پر حرام

○

اسلام کا آئین "قرآنِ پاک"

اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق ہے۔ اس نے ہماری رہنمائی کے لئے دنیا میں پیغمبر بھیجے۔ آخر میں سرورِ کونین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرما کر نبوّت کا دروازہ بند کر دیا۔ آپؐ پر آخری کتاب قرآنِ پاک نازل کر کے دین کو مکمّل کر دیا اور اس کی حفاظت کا خود ذمّہ لے کر اسے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔ یہ ایسی مکمل اور جامع ہدایت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور ضابطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس میں زندگی کے ایسے بنیادی اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جو قیامت تک ہونے والے تغیّرات کا حل پیش کر سکتے ہیں۔ مسلمان اس پر عمل کر کے دونوں جہانوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب قرآن پاک کو اپنا ضابطۂ حیات بنایا، اس پر عمل کیا، اس کے پیغام کو لے کر اٹھے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جہاد کیا تو وہ سربلند ہو گئے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ان کے زیرِ نگیں آگئیں اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان سچّا ہو گیا کہ "میں جس کلمے کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں اس کو مان لوگے تو ایک دن قیصر و کسریٰ کے تخت کے وارث بن جاؤ گے"۔ اس وقت اگرچہ یہ بات بڑی ناممکن سی معلوم ہوتی تھی لیکن چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ جنہیں قبائلی نظام سے زیادہ کسی چیز کی خبر نہ تھی وہ نہ صرف ان سلطنتوں کے وارث بنے بلکہ انہوں نے دنیا کو جہانگیری و جہانبانی کے گُر سکھائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے

قرآن پاک پر عمل کیا۔ اس کے حرام کو حرام اور اس کے حلال کو حلال جانا۔ قرآن نے جس چیز سے روکا وہ رک گئے اور جس چیز کے کرنے کا حکم دیا وہ کر گزرے۔ قرآن پاک پر اسی عمل کا نتیجہ تھا کہ ان کے کردار میں اتنی پختگی پیدا ہوئی کہ حق کے راستے میں نہ ان پر کسی کی دھمکیوں کا اثر ہوتا تھا نہ انہیں روپے پیسے سے خریدا جا سکتا تھا نہ وہ اپنے خلاف الزامات اور اتہامات کو خاطر میں لاتے تھے اور نہ کسی اور طریقے سے مرعوب ہوتے تھے۔ قرآن پاک کی تعلیم نے ان کے دل سے خوفِ خدا کے سوا سب خوف نکال دیئے تھے۔ لیکن جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی، قرآن پاک کے دیئے ہوئے قانون کی جگہ بادشاہوں کے اپنے احکام جاری ہونے لگے تو لوگوں کے کردار میں وہ پختگی نہ رہی۔ حق گوئی کی جگہ تملّق اور خوشامد نے لے لی۔ دلوں میں غیر اللہ کا خوف سما گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امّتِ مسلمہ آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو گئی۔ جو قوم کبھی خود حکمران تھی محکوم بن کر رہ گئی ؎

وہ معزّز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

مسلمان اگرچہ زمانے کی گردش کا گلہ کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی موجودہ پستی کا سبب قرآن پاک سے دوری ہے۔ اگر اب بھی مسلمان اس پر عمل کرے اور حکومت کی سطح تک ہر معاملے میں اس سے رہنمائی حاصل کرے تو آج بھی وہ اپنی موجودہ حالت کو تبدیل کر کے دنیا میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی!
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی!

تو قرآن کو چھوڑ کر ذلیل ہوا لیکن زمانے کی گردش کا گلہ کرنے لگا۔

قرآنِ پاک کا وعدہ ہے کہ "اگر تم سچے مومن بن جاؤ تو تم ہی غالب رہو گے" اس کا یہ وعدہ سچا ہے، اگر آج ہم اس کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو صدق دل سے قبول کر لیں اور خلوص کے ساتھ اس پر عمل کریں، اسے صرف اپنی نجی زندگی تک محدود نہ رکھیں بلکہ حکومت کا نظام چلانے کے لئے بھی

اس کے ضابطوں پر عمل کریں، اس کی تلاوت کے ساتھ ساتھ سوچ سمجھ کر اس کے احکام پر عمل کریں تو آج بھی ہم دنیا کی قوموں میں باعزّت مقام حاصل کر سکتے ہیں ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست !
آں کتابِ زندۂ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃً للعالمیں ؐ
گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے ؛ دنیا میں تیری شان و شوکت کا راز کیا ہے ؛ وہ زندہ کتاب قرآن حکیم ہے جس کی حکمت قدیم اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کے لئے آخری پیغام ہے اور اسے " جہانوں کے لئے رحمت " حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم لے کر آئے ہیں۔ اے مسلمان اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو قرآن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔

قرآن پاک دلوں کی دنیا بدلنے اور انسانوں کو انسانیت کے بلند مقام سے آگاہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے انسانوں کو کامیاب زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا۔ مسلمانوں نے اس پر عمل کیا تو دنیا کے حکمران بن گئے۔ قرآن کا مقصد انسان کی سراپا اصلاح ہے ۔ یہ مردہ دلوں میں زندگی کی رُوح پھونکتا ہے اور انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کراتا ہے ۔ یہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تعیّن کر کے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم کرتا ہے۔ یہ انسان کو اپنی آخرت بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزاء قرار دے کر انسان کو نیک اعمال پر ابھارتا ہے ۔ یہ جہاد کا درس دے کر مسلمان کو فعّال اور متحرّک بناتا ہے ۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن پاک کی ان تعلیمات کو چھوڑ دیا اور صوفی و ملّا کے اسیر ہو گئے ۔ کسی معاملے

میں قرآن پاک کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کی بجائے انہوں نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ فلاں صاحب اور فلاں صاحب کی کیا رائے ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں شخصیت پرستی راہ پا گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کا بندہ بننے کی بجائے مذہبی پیشواؤں کا اسیر اور غلام بن گیا۔ اب حال یہ ہے کہ قرآن پاک پر عمل کرنے کی بجائے ہم نے اسے مختلف مواقع پر تلاوت کے لئے محدود کر دیا ہے۔ مختلف رسوم کی ادائیگی کے وقت اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس سے برکت حاصل ہو اور کسی قریبِ مرگ شخص کے پاس اس لئے تلاوت کرتے ہیں کہ اس کی سورۂ یٰسٓ سے اسے نزع کی تکلیف سے رہائی مل جائے۔ افسوس ہے کہ جو قرآن زندگی عطا کرنے کے لئے آیا تھا ہم نے اُسے صرف موت میں آسانی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا ؎

بہ بندِ صوفی و مُلّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بہ آیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری

تو صوفی و مُلّا کے بندھنوں کا اسیر ہے اور قرآن پاک کی حکمت سے زندگی حاصل نہیں کرتا تجھے اس کی آیات سے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کہ اس کی سورۂ یٰسین سے مرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

○

مقصودِ رسالت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے صرف قرآن پاک ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اپنی امت کو دینِ کامل کی تعلیم دیں اور اس پر عمل کر کے دکھائیں ؎

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

ہمارا وجود آپؐ کی رسالت کی وجہ سے قائم ہے۔ آپؐ کی رسالت ہی سے ہمیں ہمارا دین اور آئین ملا۔ آپؐ نے اس دین اور آئین کو ہم تک پہنچانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اس پر عمل کیا اور پورے معاشرے میں اسے عملاً نافذ کر کے دکھایا۔ قرآن پاک میں ہے:

لَقَدْ كَانَ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین و شریعت کو سمجھنے کے لئے ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آپؐ نے قرآن پاک کی جو تشریح و تفسیر بیان کی اسے مِن و عَن قبول کرنا ہوگا۔ انہیؐ کو اپنا ہادی اور رہنما بنانا ہوگا۔ محض زبان سے عاشقِ رسولؐ ہونے کا دعویٰ کرنا اور عمل کے وقت غیروں کے حکم پر چلنا عشق نہیں بلکہ سراسر شر ہے جسے دینِ حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ؎

بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

اپنے آپ کو مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا کہ وہ سراپا دین ہیں۔ اگر تو انؐ تک نہ پہنچے یعنی ان سے دین حاصل نہ کرے تو تیری زندگی اسی طرح سراپا شر ہے جس طرح ابولہب کی زندگی تھی۔

قرآن پاک میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ بات مشرکوں کو ناگوار گزرے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے تمام دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انسان نے اپنے خالقِ حقیقی کو فراموش کر کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کو خدا کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ بت پتھر کے تراشے ہوئے بھی تھے اور رنگ، نسل، زبان اور وطن کے بت بھی تھے جن کی پرستش پتھر کے بتوں سے کم نہ ہوتی تھی۔ ان بتوں کے تحفظ کی خاطر قبائل میں خوں ریز لڑائیاں بھی ہوئیں۔ انسان انسان کے ہاتھوں رسوا تھا۔ طاقتور کمزوروں کا استحصال کرتے تھے۔ مظلوموں کی دادرسی کہیں نہ ہوتی تھی۔ انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ چاروں طرف ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اتنے میں وہ آفتابِ نبوّت طلوع ہوا تو تاریکی کے بادل چھٹ گئے۔ نورِ نبوّت کی ضیا پاشیوں سے تمام عالم جگمگا اٹھا۔ طاغوتی طاقتوں کو جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کُھل کھیل رہی تھیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ کمزوروں اور ناتوانوں کو سہارا مل گیا۔ خدا سے برگشتہ انسان پھر خدا کی طرف رجوع کرنے لگے۔ غلامی کی زنجیریں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں۔ ایک خدا اور رسول کو ماننے والے ایک امّت بن گئے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن بھائی بھائی بن گئے۔ رنگ و نسل اور زبان کے بت پاش پاش ہو گئے۔ پتھر کے بت اوندھے منہ گر پڑے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِل کا نعرہ بلند ہوا تو چاروں طرف حق کا بول بالا ہونے لگا۔ سسکتی ہوئی انسانیت میں پھر جان پڑ گئی۔ اب کسی انسان کو دوسرے انسان پر رنگ، نسل، زبان، مال و دولت یا جاہ و حشمت کی بنا پر فضیلت نہ رہی بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری معیارِ فضیلت قرار پائے۔ مظلوموں کی دادرسی ہونے لگی۔ حق داروں کو ان کے حق ملنے لگے۔ بڑے بڑے متکبّروں کی گردنیں جھک گئیں۔ دلوں کے زنگار دُھل گئے۔ اعمال و کردار پر سے شرک و بدعت کی گرد صاف ہو گئی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد پورا ہو گیا کہ میں نے انہیں اس لئے مبعوث کیا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ تمہارا تزکیۂ نفس کریں۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور دینِ حق کو تمام اَدیان پر غالب کر دیں ؎

بُود انساں دَر جہاں انساں پَرست
ناکس و نابود مند و زیردست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش!!
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

تا امینے حق بحق داراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد

مُرسلان و انبیا آبائے او
اکرم او نزدِ حق اتقائے او

کُلُّ مُؤمِنِ اِخوَۃٌ اندر دِلش
حُرّیت سرمایۂ آب و گِلش

ناشکیبِ امتیازات آمدہ
دَرنہادِ او مساوات آمدہ

دنیا میں انسان انسان کی بندگی کرتا تھا۔ وہ بڑا کمزور، ناچیز اور ناتواں تھا۔ قیصر و کسریٰ کا دبدبہ اس کے لئے رہزن تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ کاہن، پاپا (عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما)، بادشاہ اور امیر، ایک شکار کے لئے سو شکاری تھے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے حق داروں تک ان کا حق پہنچایا اور غلاموں کو بادشاہوں کا تخت عطا کیا۔ آپؐ کے آبا و اجداد رسول اور نبی تھے۔ آپؐ کے نزدیک وہی معزز ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک متقی اور پرہیزگار ہے۔ آپؐ کے دل میں اخوت کا جذبہ تھا اور انسان کی آزادی آپؐ کا سرمایہ تھا۔ آپ امتیازات اور اونچ نیچ کے فرق کو برداشت نہ کرنے والے بن کر آئے تھے۔ آپ کی فطرت میں کامل مساوات تھی۔

اللہ تعالیٰ کو حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر لینے کے بعد شریعتِ محمدیہ کے تحت جو حکومت قائم ہوتی ہے اس میں امیر، غریب، بادشاہ اور فقیر سب برابر ہوتے ہیں۔ معاشرے کا کوئی بڑے سے بڑا فرد بھی قانون سے

بالاتر نہیں ہوتا۔ حتّٰی کہ سربراہِ مملکت کے خلاف بھی عدالت میں دعوٰی دائر کر کے اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال بیان کرتے ہوئے علّامہ اقبال لکھتے ہیں کہ سلطان مراد نے ایک معمار کو مسجد کی تعمیر کے کام پر لگایا۔ جب مسجد مکمّل ہوئی تو بادشاہ کو پسند نہ آئی۔ بادشاہ نے غصّے میں آکر معمار کا ہاتھ کٹوا دیا۔ معمار نے قاضی کی عدالت میں دعوٰی دائر کر دیا۔ قاضی نے فریقین کے دلائل اور شہادتیں سماعت کرنے کے بعد قصاص میں بادشاہ کا ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے فیصلہ سن کر آستین سے ہاتھ نکالا اور قاضی کے حکم کی تعمیل کے لئے آگے بڑھایا۔ معمار نے قرآن پاک کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَان (اللہ تعالٰی تمہیں انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے) تلاوت کی اور کہا مجھے انصاف مِل گیا اب میں احسان کرتا ہوں اور بادشاہ کو معاف کرتا ہوں ؎

گُفت قاضی فِی الْقِصاص آمد حیٰوۃ
زِندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عَبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شُنید !!
دَستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مدّعی را تابِ خاموشی نماند
آیۂ بِالْعَدْلِ وَالْاِحسان خواند
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش !!
از برائے مصطفٰے بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسندِ دیبا یکے ست

قاضی نے قرآن پاک کی "قصاص" والی آیت پڑھی اور کہا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ اس قانون سے زندگی مستحکم ہوتی ہے۔ غلام مسلمان آزاد مسلمان سے کمتر نہیں ہے۔ بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ رنگیں نہیں ہے۔ جب مراد نے یہ محکم آیت سنی تو اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالا۔ مدعی کو خاموش رہنے کی تاب نہ رہی۔ اس نے بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ والی آیت پڑھی اور کہا میں نے خدا کے لئے اسے بخش دیا۔ میں نے مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے اسے بخش دیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قانون کی شان دیکھو۔ چیونٹی نے سلیمان علیہ السّلام پر فتح پائی۔ قرآن کی نظر میں غلام اور آقا ایک ہیں۔ چٹائی اور ریشم کی گدی برابر ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم دو جہانوں کے سردار تھے۔ آپؐ کے مرتبے کا آدمی نہ آج تک پیدا ہوا نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔ لیکن آپؐ ہمیشہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مِل کر بیٹھتے۔ یہاں تک کہ باہر سے آنے والے اجنبی اشخاص کے لئے آپؐ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ آپؐ اپنے غلام کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پر کھانا تناول فرماتے اور کسی قسم کی برتری کا اظہار نہ کرتے ؎

دَر نگاہِ اُو یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بَر یک خواں نشست

آپؐ کی نگاہ میں اعلیٰ و ادنیٰ برابر تھے۔ آپؐ اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔

ایران کے ساتھ لڑائیوں میں ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ یزدجرد کا سپہ سالار جس کا نام باجان تھا، مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ وہ بڑا عیّار اور چالاک تھا۔ اس نے اپنا صحیح مرتبہ بتائے بغیر ایک مسلمان سے جان کی امان طلب کی۔ مسلمان نے جان کی امان دے دی اور اپنی تلوار میان میں کر لی۔ جب مسلمانوں کو مکمّل فتح ہوئی اور ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تو یہ چلا

کہ ایک مسلمان سپاہی سے جان کی اَمان حاصِل کرنے والا شخص دشمن کا کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ سپہ سالار ہے اور اس نے دھوکے سے امان حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے امیرِ لشکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا۔ لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہم سب مسلمان ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ملّت کا امین ہے۔ اگرچہ باجان ہمارا دشمن ہے اور اس نے مکّاری سے امان حاصل کی ہے لیکن اسے امان دینے والا ہمارا مسلمان بھائی ہے۔ اس لئے ہم اس کی امان کا احترام کریں گے۔ اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ عدل و مساوات دراصل رسالت کا ہی فیضان تھا۔

گُفت اے یاراں مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
ہر یکے از ما امینِ ملّت است
صُلح کینش صُلح کینِ ملّت است

اُس (حضرت ابوعبیدہؓ) نے کہا اے دوستو ہم مسلمان ہیں۔ ایک ساز کی تار اور آواز ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ملّت کا امین ہے۔ اس کی صلح ملّت کی صلح ہے۔

○

توحید

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم کا بنیادی مقصد انسانوں کو غیر اللہ کی اطاعت اور بندگی سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی طرف متوجّہ کرنا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔

جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کے ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں۔

عبادت کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے جو خالق اور مالک ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق اور مالک نہیں۔ اس لئے عبادت کے لائق بھی وہی اکیلا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا

فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ بعض اوقات ہم غیر شعوری طور پر بعض لوگوں کو اللہ کا شریک بنا لیتے ہیں اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ قرآن پاک نے شرک کی اس قسم سے یوں خبردار کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

انہوں نے اپنے احبار اور رہبان یعنی مذہبی پیشواؤں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔

یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! انہوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو کیسے رب بنا لیا؟ آپؐ نے فرمایا "ان کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور حرام کئے ہوئے کو حرام جانا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی تو گویا انہوں نے انہیں اپنا رب بنا لیا"۔

از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دونِ اللہ شو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے آگاہ ہو، اللہ کے سوا باقی خداؤں سے دستبردار ہو جا۔

مسلمان کے لئے قوت و جبروت اور شان و شوکت کا سرچشمہ توحید ہے۔ جب کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے تو وہ بڑے سے بڑے فرعون کے سامنے بھی گردن نہیں جھکاتا۔ مسلمان خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہوتا۔ اس کی گردن صرف خدا کے آگے جھکتی ہے۔ وہ ہر حال میں حق پر قائم رہتا ہے اور کسی بڑے سے بڑے خطرے اور خوف میں بھی اس روش کو نہیں چھوڑتا۔ اسے کسی قسم کا خوف اور لالچ حق کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا۔

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

اللہ کے سوا مسلمان کسی کا بندہ نہیں ہے۔ اس کا سر کسی فرعون کے آگے بھی نہیں جھکتا۔

توحید کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات اور حاکم و معبود ماننے

کے بعد بندوں کے حقوق سے غافل ہو جائے اور اس قدر مغرور اور متکبّر بن جائے کہ نہ بڑوں کی تعظیم کرے اور نہ چھوٹوں پر شفقت۔ بس اپنے آپ کو ہی لائقِ تعظیم سمجھے اور یہ خیال کرے کہ وہ جہاں سے گزرے لوگ اسے سلام کریں اور بغیر کسی مقصد کے سلام کے لئے اس کے درِ دولت پر حاضر ہوں۔ جو شخص اس کی جا بے جا خوشامد کرے، ہر بات پر اس کی ہاں میں ہاں ملائے اُسے وہ پسند کرے اور جو حق گوئی و بے باکی سے کام لے اور اپنی عزّتِ نفس کی حفاظت کرے اس کے وہ درپے آزار ہو جائے۔ اس سے متکبّرانہ ذہن کی عکّاسی ہوتی ہے اور یہ رویّہ عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ علم و حکمت، مال و دولت، حسن و جمال اور جاہ و حشمت میں فضیلت عطا فرمائے تو انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور عجز و انکساری سے کام لے۔

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

توحید کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ وہ جو کام بھی سرانجام دے اس میں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو پیشِ نظر رکھے۔ کسی بڑے سے بڑے شخص کے کسی ایسے حکم کو تسلیم نہ کرے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ محض زبان سے توحید کا اقرار کرنا اور عملی طور پر ہر شخص کی غلامی کرنا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مسجد میں جا کر نماز پڑھ لینا لیکن زندگی کے عام معاملات میں اس کے احکام کو فراموش کر دینا، رشوت لینا، خیانت کرنا، بد دیانتی کا مرتکب ہونا اور جائز ناجائز طریقوں سے مال جمع کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں بلکہ نفس کی بندگی یا غیروں کی غلامی ہے۔ جب تک دل حرص و ہوس کے بتوں سے پاک نہ ہو اس وقت تک کوئی شخص توحید کی لذّت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

دل ز نقشِ لَا اِلٰہ بیگانہ
از صنم ہائے ہوس بت خانہ

تیرا دل لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (توحید) کے نقش سے خالی ہے اور ہوس کے بتوں سے بتخانہ

بنا ہوا ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی طرح طاقت حاصل کر کے لوگوں کو اپنے آگے جھکاتے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرانے کی بجائے اپنے احکام کی اطاعت کراتے ہیں۔ یہ رویہ کسی سچے مسلمان کا نہیں ہو سکتا کیونکہ مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا بندہ بن کر پیش ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔

زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا بندہ بن کر پیش ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے دربار میں نبی، ولی، بادشاہ، فقیر، امیر اور وزیر سب عاجز بندے بن کر آئیں گے اور جن لوگوں نے دنیا میں انسانوں سے اپنی بندگی کرائی ہوگی اور خود ساختہ قوانین کے ذریعے اللہ کے بندوں پر حکومت کی ہوگی انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ مسلمان اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے اس لئے وہ دنیا میں نہ تو اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے اور نہ غیر اللہ کی حکمرانی برضا و رغبت تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کر کے اس کے سامنے شرمندگی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا ہی دین اور دانائی ہے۔ اسی کے احکام کو آئین کا درجہ حاصل ہے اور مسلمان کی شان، طاقت، قوت اور دبدبہ ان احکام پر عمل کرنے سے قائم ہوتا ہے نہ کہ اپنا قانون چلانے سے۔

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است!
وَاٰتِي الرَّحْمٰنِ عبدًا مضمر است!!
دیں از و حکمت از و آئیں از و
زور از و قوت از و تمکیں از و

مسلمان کو توحید کی رمز یاد ہے جو قرآنی آیت وَاٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا میں پوشیدہ ہے۔ اسی سے دین، اسی سے حکمت، اسی سے آئین، اسی سے زور، اسی سے طاقت اور اسی سے دبدبہ حاصل

ہوتا ہے۔

مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی بس اس حد تک ہی کافی نہیں کہ وہ انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے اور چاروں طرف سے آنکھیں بند کرلے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ ارد گرد کے حالات پر گہری نظر رکھے اور دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بجائے غیر اللہ کے قوانین کو تو غلبہ حاصل نہیں۔ کہیں انسان انسانوں کی غلامی میں مبتلا تو نہیں۔ اگر ایسی صورت ہو تو اسے چاہیئے کہ ان حالات کو بدلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ غیر اللہ کے سامنے اس کی حاکمیت سے انکار کر دے اور غلاموں کو توحید سے آشنا کر کے انہیں دنیوی آقاؤں سے برسرِ پیکار کر دے۔ جو شخص دوسروں کے دلوں کو گرما کر انہیں باطل سے آمادۂ جنگ کر سکتا ہو، طاغوتی طاقتوں کے لئے اس کا خوف قیامت کے خوف سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں ایسے ہی مجاہدوں کے دَم سے دنیا کی رونقیں قائم ہیں۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی شخص خود توحید کی رمز سے آگاہی حاصل نہ کرلے۔

تا نہ رمزِ لَا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
پیشِ غیر اللہ 'لا' گفتن حیات!
تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز!
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز!
ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

جب تک نکتۂ توحید ہاتھ نہ آئے غیر اللہ کے بندھنوں کو توڑا نہیں جا سکتا۔ غیر اللہ کے سامنے لا (نہیں) کہنا یعنی اس کی حاکمیت سے انکار کرنا ہی زندگی ہے۔ اسی سے

دنیا کی رونق قائم ہے۔ غلام کو آقا سے برسرِ پیکار کرنے کے لئے اس کے جسم میں 'لا' کا بیج بو۔ جس شخص کے جگر میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا سوز ہو اس کا خوف قیامت کے خوف سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ہر انسان چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی عزت و آبرو قائم رہے اور اسے کوئی ایسا کام نہ کرنا پڑے جس سے اس کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچے اور اس کی انا مجروح ہو۔ اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق دنیا میں ترقی کے مواقع میسّر آئیں۔ اسے اپنی رائے کی آزادی ہو ——— وہ اپنی مرضی کے مطابق جائز ذریعہ معاش اختیار کر سکے۔ کوئی اس کی کمزوری اور مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تو اسے آسانی کے ساتھ انصاف میسّر آ سکے۔ یہ ساری باتیں اسی وقت ممکن ہیں جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا پڑے اور وہ اللہ کے حکم کے سوا کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت پر مجبور نہ ہو جو بھی اس پر حکم چلانے والا ہو وہ حدود اللہ کے مطابق فرمان جاری کرے اور اس میں اس کی اپنی خواہش کا دخل نہ ہو۔ یہ باتیں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہی میں ممکن ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک کا ارشاد ہے :

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا.

پس اپنا منہ یک سو ہو کر سیدھا دین کی طرف رکھو۔ اللہ تعالیٰ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔

فطرت سے مراد توحید یا دینِ اسلام ہے۔ یعنی توحید کی معرفت انسان کی سرشت میں موجود ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کو دبا کر یا حالات سے متاثر ہو کر فیصلہ نہ کرے تو اس کی عقلِ سلیم یہ فیصلہ دے گی کہ اسے صرف اس کائنات کے خالق اور مالک کی ہی اطاعت کرنی چاہیئے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے نصرانی، یہودی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ مردِ مومن اس دینِ فطرت کا پیروکار ہی نہیں بلکہ جو جبریلِ امین کے ذریعے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا اور قرآن کے ذریعے اسے ملا، اس کا محافظ اور

نگہبان بھی ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم گئے اور پکے ہو گئے انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غم کھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر پھر اس پر استقامت ظاہر کرنے کا مطلب یہی ہے کہ جب ایک بار اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور الٰہ تسلیم کر لیا تو پھر ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔ اسی کے آگے سر جھکایا جائے۔ اسی کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ کسی شخص کا خواہ دنیوی لحاظ سے وہ کتنی ہی بڑی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو، ایسا حکم نہ مانا جائے جس سے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ بعض اوقات انسان کسی خوف کے پیشِ نظر ایسے حکم کی اطاعت پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے خوف اور وسوسے کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ جو لوگ میری وحدانیت کا اقرار کرنے کے بعد عملاً استقامت دکھائیں گے وہ خوف و حزن سے محفوظ رہیں گے۔ ایک مسلمان خود بھی اس نظریئے پر کاربند ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ رکھنے کا درس دیتا ہے۔ اس راہ میں اسے جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے۔ مومن کے لئے خوف و حزن سے بریت کا اصل وعدہ تو اس دن کے لئے ہے جس دن حساب کتاب ہو گا اور ہر شخص خوف سے کانپ رہا ہو گا اور غمناک ہو گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر استقامت دکھانے والوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اطمینانِ قلب نصیب کرے گا اور اسے خوف و حُزن سے محفوظ رکھے گا۔

اے خوش آں مردے کہ دل باکس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد

درسِ او اللہ بس باقی ہوس
تا نیفتند مردِ حق در بندِ کس
معنیٔ جبریل و قرآں است او
فطرۃ اللہ را نگہباں است او
درسِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِم دہد
تا دلے در سینۂ آدم نہد

وہ آدمی کتنا اچھا ہے جو کسی سے دل نہیں لگاتا اور اپنے پاؤں سے غیر اللہ کے بندھن توڑ دیتا ہے۔ اس کا سبق یہی ہوتا ہے کہ اللہ بس، باقی ہوس تاکہ کوئی مسلمان غیر اللہ کی غلامی میں نہ پڑے وہ جبریل اور قرآن کے معنی بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی فطرت (توحید) کا نگہبان ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ رکھنے کا درس دیتا ہے تاکہ آدم کے سینے میں دل پیدا کرے یعنی وہ انسانوں میں جرأت اور دلیری پیدا کرتا ہے۔

مسلمان کی اصل منزل آخرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ماننے والوں اور بذریعہ وحی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کرنے والوں کے لیے آخرت میں بڑے بڑے انعامات رکھے ہیں۔ دنیا کی ساری چیزیں آخرت کی ایک چیز کی قیمت کے بھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ جنّت میں مسلمان کو جو نعمتیں میسّر ہوں گی دنیا میں ان کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے مال و متاع میں اگرچہ بڑی کشش ہوتی ہے۔ حلال طریقوں سے اسے حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اسے زندگی کا مقصد بنا لینا اور آخرت سے غافل ہو کر اپنی ساری صلاحیتیں دنیا طلبی میں صرف کر دینا عقلمندی نہیں۔ مسلمان کی زندگی کا آخری مقصد رضائے الٰہی ہے اور رضائے الٰہی اللہ کے دین پر عمل کرنے اور توحید کو عام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان اس وقت اس فریب میں مبتلا ہے کہ مال و دولت حاصل کرنا بہت بڑا نفع ہے اور اس سے محرومی بہت بڑا نقصان ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں ہے:

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

اور دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں ۔

ایک جگہ آخرت کے مقابلے میں اسے متاعِ قلیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص حصولِ دولت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے وہ یقیناً بہت بڑے دھوکے میں مبتلا ہے ۔

حق کی راہ میں حائل ہونے والی دوسری چیز انسان کی برادری یا خاندان ہے۔ بعض اوقات انسان حق کو پہچانتا ہے لیکن رشتہ داری اور تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے حق کا ساتھ نہیں دیتا وہ ہمیشہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کی پاسداری کرتا ہے۔ خواہ وہ حق پر ہوں یا نہ ہوں۔ حق کو چھوڑ کر غیر حق کی اطاعت کرنا ہی دراصل بت پرستی ہے۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ بت صرف پتھر کے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ ان کی پوجا نہیں کرتا تو اس کا دامن شرک سے پاک ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر غیر اللہ کی اطاعت کا مرتکب ہوتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے نہ وقت کی قید ہوتی ہے اور نہ ہی حالات کا سازگار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غریبی، امیری، نرمی، سختی، فراخی، تنگدستی، فراغت اور مشغولیت، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔ ہر قسم کے خوف اور لالچ، نفع اور نقصان سے بے نیاز ہو کر حق کا ساتھ دینا اور اللہ تعالےٰ کے کلمے کو بلند کرنا ہی اصل اطاعت ہے اور اسی کا نام توحید ہے ۔

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرنا اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کو تسلیم کر لینا مسلمانی اور اس کا انکار کرنا کافری ہے۔ لیکن حقیقت میں جب تک اپنے عمل کے ذریعے اس اقرار

کی شہادت نہ دی جائے اس وقت تک زبانی اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان سب اطراف سے کٹ کر محض اللہ کا ہو کر رہ جائے۔ ہر حال میں اس کی اطاعت کرے، اپنی امیدیں اور تمنائیں اسی سے وابستہ کرے۔ اس کے نزدیک نہ دولت اس کی پریشانیوں کا مداوا ہو نہ وہ اپنی برادری اور خاندان کو مصیبتوں سے نجات دہندہ تصوّر کرے اور نہ کسی اور طاقت کو اپنا ملجا و ماویٰ خیال کرے۔ بس اللہ تعالیٰ کو حاجت روا اور مشکلکشا سمجھے، اسی سے دعائیں مانگے، اسی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھے، ہر حال میں اسے یاد رکھے، اُسکے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرے اور غیر اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ لے۔ اسی کا نام مسلمانی ہے۔

بُتوں سے تجھکو اُمیدیں خُدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

○

اطاعت

اسلام کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرے اور اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی بندگی کو جمع نہ کرے۔ جب اسے کسی معاملے میں اللہ تعالےٰ کا حکم معلوم ہو جائے تو پھر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور کسی قسم کی حیل و حجت نہ کرے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْن۔

اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ۔

جو شخص اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام اس کے بندوں تک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے پہنچے اس لئے ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ نبی چونکہ صاحبِ وحی ہوتا ہے۔ اس پر براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام نازل ہوتے ہیں۔ اس لئے رسول کی اطاعت غیر مشروط ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی شخص کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم کیساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اگر کسی کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے مطابقت رکھتا ہوگا تو اس کی اطاعت کی جائے گی ورنہ نہیں۔

سورۂ نور میں فرمانِ خداوندی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ.

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے تو یہی لوگ بامراد ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

اے نبیؐ! کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے:

كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قِيْلَ مَنْ اَبٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!
قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى۔

میری تمام امّت جنّت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے میرا انکار کیا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسولؐ اللہ! آپ کا انکار کرنے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنّت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی

اس نے میرا انکار کیا۔

قرآن پاک میں ہے جنہوں نے دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں زندگی بسر نہیں کی ہوگی قیامت کے دن پچھتائیں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ہوتی اور اس کی راہ پر چلے ہوتے لیکن اس دن انہیں پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

صحابیٔ رسولؐ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ آپ اکثر بیمار رہنے لگے۔ طبیعت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ صحابہ کرامؓ ان سے پوچھتے کیا تکلیف ہے تو دل کا حال نہ کہتے اور اپنے ہمدردوں کا شکریہ ادا کر کے بات ٹال دیتے۔ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طبیعت کا حال پوچھا تو صاف گوئی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ایک خیال دل میں آتا ہے تو طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا خیال آتا ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اب زندگی میں جب تک آپ کو دیکھ نہیں لیتا چین نہیں آتا۔ سوچتا ہوں مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے جنّت بھی دے دی تب بھی نہ معلوم آپؐ کہاں ہوں گے اور میں کہاں۔ آپؐ کو دیکھے بغیر وہاں بھی تسکین کیسے حاصل ہوگی اور معلوم نہیں وہاں آپؐ کے دیدار سے مشرّف ہونے کی کیا تدبیر کرنی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثوبان! تم جس سے محبت کرتے ہو اسی کے ساتھ رہو گے۔ پھر آپؐ نے قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت فرمائی جو اس موقع پر نازل ہوئی تھی اور جس کا مطلب یہ تھا "جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نعمتوں سے نوازا ہوگا۔ یعنی وہ نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ رہیں گے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہترین ٹھکانہ ہے۔

اور یہ بہترین ٹھکانہ ان لوگوں کے لئے ہوگا جو اس کی طرف سے عائد شدہ فرائض ادا کر کے اطاعت کا راستہ اختیار کریں گے۔

تو ہم از بارِ فرائض سرمتاب
برخوری از عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَآب
دَر اطاعت کوش اے غفلت شعار!
می شود از جبر پیدا اختیار

تو بھی فرائض کے بوجھ سے سر نہ پھیر تاکہ اللہ تعالیٰ سے بہترین ٹھکانہ حاصل کرے۔ اے غافل! اطاعت اختیار کر کیونکہ جبر سے اختیار پیدا ہوتا ہے یعنی اعلیٰ اور حقیقی آزادی اطاعت اور فرائض کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے۔

فرائض کی صحیح معنوں میں ادائیگی سے مشکلات بھی پیش آتی ہیں اور اپنے آپ پر مختلف قسم کی پابندیاں بھی عاید کرنی پڑتی ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ مومن کی مثال ایک ایسے گھوڑے کی سی ہے جسے ایک لمبی رسّی سے باندھ دیا گیا ہو۔ جہاں تک وہ رسّی جا سکتی ہے وہاں تک وہ گھوڑا بھی چل پھر اور چر چگ سکتا ہے لیکن اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں اسلام کی ان پابندیوں پر عمل کرنے ہی سے انسان اللہ کا بندہ بنتا اور غیر اللہ کی بندگی سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے مومن کو ضبطِ نفس اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے اور اطاعت کی راہ میں جو بھی مشکلات آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیئے۔

شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مشو

آئین کی سختی کا شکوہ نہ کر اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ ہو۔

اصل اطاعت یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں آپؐ کا مکمل اتباع کیا جائے۔ معیشت، معاشرت، تجارت، لین دین، شادی غمی، جنگ، امن اور دیگر معاملات میں آپؐ کے اسوہ حسنہ

پیشِ نظر رکھا جائے۔ آپؐ کی چند سُنّتوں پر عمل کر کے، ساری زندگی غیر اللہ کی اطاعت میں
کرنا اور اپنے آپ کو کامل متّبعِ سنّت سمجھ لینا فریبِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت بایزید بسطامی
تہ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ محض اس بنا پر خربوزہ کھانے سے انکار کر دیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خربوزہ کیسے کھایا ہے۔ آپ نے یہ گوارا نہ کیا کہ خربوزہ کھانے کے
علے میں بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی تقلید کریں۔ اسی کا نام
امل اطاعت ہے۔

کاملِ بُسطام در تقلیدِ فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

حضرت بایزید بسطامیؒ اتباعِ سُنّت میں منفرد تھے۔ آپ نے خربوزہ کھانے سے پرہیز
کیا۔ (اس لئے کہ آپ حضورؐ کا خربوزہ کھانے کا طریقہ نہیں جانتے تھے)۔
جب کوئی شخص ہر معاملے میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کو اپنی عادت بنا لیتا ہے
تو اس کی ساری زندگی عبادت بن جاتی ہے اور اس کا ہر کام رضائے الٰہی کے مطابق ہو جاتا ہے۔

تابعِ حق دیدنش نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

اس کا دیکھنا، اس کا نہ دیکھنا، اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا سونا حق کے تابع ہو جاتا ہے۔

○

عشقِ رسولؐ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَلَدِہٖ وَ وَالِدِہٖ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد اس کے والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان سے کامل اطاعت کا اظہار اسی وقت ہوتا ہے جب اسے اپنے مُطاع سے عشق کی حد تک محبّت ہو۔ اور اس قسم کی محبّت بھی اس ذات سے ہوتی ہے جس میں بہت سے کمالات و اوصاف جمع ہو گئے ہوں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم خُلقِ عظیم کے مالک تھے۔ آپؐ تمام مخلوق کے لئے حد درجہ شفیق اور مہربان تھے۔ آپ جہانوں کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ آپؐ نے دین کی خاطر انتہائی مصائب برداشت کئے لیکن دین کو مکمل صورت میں پیش کر کے مسلمانوں کے لئے ہر طرح کی ترقّی کے دروازے کھول دیئے۔ آپ ہی کے ذریعے دنیا تہذیب و تمدّن سے آشنا ہوئی۔ انسان انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو کر شرفِ انسانیت سے آگاہ ہوا۔ صحابہ کرامؓ آپؐ سے مخاطب ہوتے تو "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان" کہہ کر بات کرتے۔ آپ ہمارے قافلے کے سالار ہیں۔ آپ ہی کی بدولت ہمیں اطمینانِ قلب اور روحانی چین نصیب ہوا۔ اس لئے آپؐ کی محبّت اور اطاعت ایمان کی شرطِ اوّلین ہے۔

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم رات کو تہجّد کی نماز میں اتنا قیام فرماتے کہ بعض اوقات آپؐ کے پاؤں متورّم ہو جاتے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے اور پوری پوری رات عبادت میں گزار دیتے۔ لیکن اس شب بیداری کے باوجود اقامتِ دین کے کاموں میں ذرا فرق نہ آتا۔ جہاد کے موقع پر کفّار کے مقابلے میں بہادری کے وہ جوہر دکھاتے کہ گھمسان کی جنگ کے وقت صحابہ کرام آپؐ کے پاس پناہ ڈھونڈتے۔ دین کے معاملے میں اس محنت اور مشقّت کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پیروکاروں کے لئے دنیا کے دروازے کھول دیئے اور انہیں حکمرانی کے

منصب پر فائز کیا۔ آج بھی ہماری ترقی کا راستہ یہ ہے کہ ہم آپؐ کو اپنا رہنما، مرشد اور ہادی تسلیم کریں اور ہر معاملے میں آپؐ کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اسی طریقے سے ہم دنیا میں باعزّت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

در دلِ مُسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
ماند شب ہا چشمِ او محروم نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو اُو بطنِ اُمِ گیتی نزاد

مسلمان کے دل میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بڑا مقام ہوتا ہے۔ ہماری عزّت آپؐ کے نام سے ہے۔ آپ کی آنکھیں راتوں کو نیند سے محروم رہیں۔ تب کہیں آپ کی قوم بادشاہ کے تخت پر سوئی۔ جنگ کے وقت آپؐ کی تلوار لوہے کو پگھلانے والی ہوتی۔ آپؐ کی آنکھیں نماز میں اشکبار ہوتیں۔ دین کی کنجی سے آپؐ نے دنیا کا دروازہ کھولا۔ آپؐ جیسا کوئی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شان مخلوق میں سب سے بلند ہے۔ آپؐ دونوں جہانوں کے سردار ہیں۔ آپؐ محبوبِ خدا ہیں، اس لئے جس شخص نے آپؐ کی اطاعت کی اسے خالقِ کائنات کی محبت حاصل ہو گئی۔ اور جسے یہ نعمت مل گئی اسے گویا دونوں جہانوں کی دولت میسّر آگئی۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

عشقِ مصطفیٰؐ جس کا سامان ہو سمندر اور خشکی اس کے گوشۂ دامن میں ہیں۔

47549

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا تھا۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق آپؐ نے رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ دنیا میں معیشت، معاشرت، حکومت، تجارت، لین دین اور عدل و انصاف کے وہ زریں اصول بتائے کہ ان سے بہتر کوئی انسانی دماغ پیش نہیں کر سکتا۔ آئندہ زندگی کے متعلق آپؐ نے ایسی وضاحت کے ساتھ تصریح فرمائی کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قیامت کے دن، حشر نشر، جنت دوزخ اور جزا سزا کے متعلق ایسی وضاحت فرمائی کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ قرآن پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ ایک تاجر کے لئے، سپہ سالار کے لئے، مزدور کے لئے، آجر کے لئے، باپ کے لئے، بھائی کے لئے، ایک رہنما کے لئے الغرض ہر شخص کے لئے آپؐ کی زندگی میں رہنمائی موجود ہے۔ سارا جہان آپ کا ممنون ہے۔

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست

جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

آپؐ دونوں جہان کی کتاب کا دیباچہ ہیں۔ تمام جہان غلام ہیں اور آپؐ آقا ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پیدا کیا ہے۔ آپؐ کا امتی ہونا معمولی بات نہیں بلکہ یہ ایک ایسا شرف ہے جس کے لئے پہلے زمانے کے کئی پیغمبر بھی تمنا کرتے رہے۔ ہماری عزت و تکریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ اس لئے ہمیں آپ کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑنا چاہیئے۔ حقیقت میں ہماری زندگی کا راز اس پاک دامن سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ہمیں آپؐ کے ہر فرمان پر عمل کرنا چاہیئے۔ آپؐ کا دامن تھامنے کا مطلب یہی ہے کہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا غرض کہ زندگی کا ہر کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔ آپؐ کی اطاعت کے بغیر ایک سچے مسلمان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ محبت اور عشقِ رسولؐ کے زبانی دعوے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اصل چیز انسان کے اعمال ہیں۔ اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویدار ہو لیکن آپؐ کے بجائے غیروں کی اطاعت کرتا ہو تو وہ

اپنے دعوے میں جھوٹا متصوّر ہوگا۔ آپ کا دامن ہمارے لئے بہار کی مانند ہے۔ جس طرح بہار سے علیحدگی پھولوں کے لئے موت کا سبب ہوتی ہے اسی طرح مسلمان امّت کی زندگی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھامنے اور اس کی موت آپؐ کا دامن چھوڑ دینے میں ہے۔

دامنش اَز دَست دادن مُردن است

چوں گُل از بادِ خزاں افسردن است

آپؐ کا دامن چھوڑ دینا مرجانے کے مترادف ہے۔ پھول کی طرح بادِ خزاں سے مرجھانے کی مانند ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبّت کا مطلب یہ نہیں کہ زبان سے آپؐ کی محبّت کا دعوٰی کیا جائے لیکن عملاً دوسروں کی غلامی کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو چھوڑ کر غیروں کے احکام مانے جائیں۔ آپؐ کی سنّت کا اتّباع کرنے کی بجائے رسم و رواج کی پابندی کی جائے۔ توحید اختیار کرنے کی بجائے شرک و بدعت کے دروازے کھولے جائیں بلکہ محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں آپؐ کی فرمانبرداری کی جائے۔ آپؐ کی سنّت کو حرزِ جان بنایا جائے۔ اسی کا نام وفا ہے اور دنیا میں مسلمان کے لئے بلند مقام حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اگر ہم اپنے گریبان میں نظر ڈال کر دیکھیں تو ہمیں خود محسوس ہوگا کہ ہماری محبّت اور عشق کا معیار وہ نہیں ہے جو آپؐ جیسی پاک ہستی سے ہونا چاہیئے۔ آپؐ کے کتنے حکم ہیں جن کی ہم پروا نہیں کرتے! آپؐ کی سنّت پر عمل کرنے کے سلسلے میں کبھی اولاد کی محبّت آڑے آجاتی ہے اور کبھی مال کی محبّت غالب رہتی ہے۔ کبھی آباء و اجداد کی رسوم پر عمل کرتے ہیں اور کبھی اپنے نفس کی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ شرک اور بدعت کے ایسے ایسے بُت تراشتے ہیں کہ شیطان بھی حیران رہ جاتا ہے۔ ہم نے سینوں کو بتوں سے معمور کر رکھا ہے۔ غرور و تکبّر

کا بُت، تعصّب کا بُت، اولاد کی محبّت کا بُت، بُغض اور کینہ کا بُت، رسم و رواج کا بُت، قومیّت کا بُت، وطنیّت کا بت، اور نہ جانے کیا کیا بُت ہیں جنہیں ہم نے اپنے سینے میں جگہ دے رکھی ہے۔ زبان سے مدینے والی سرکار سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن عملی طور ہمارے قدم کسی اور سرکار کی طرف اٹھتے ہیں۔ غیر اللہ کے قوانین اور ضابطے بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں اور انہیں بدلنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ جاہ و منصب اور مال و دولت کی محبّت نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ہمیں اس بات کا کبھی خیال نہیں آتا کہ جس دین کی خاطر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے۔ جنگیں لڑیں دشمنوں کا مقابلہ کیا پھر اس دین کو ہمارے سپرد کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے ہم اس دین کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ جس دین کو غالب کرنے کے لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا خون بہایا، ہم اس کے لئے اپنا پسینہ بہانے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اگر ہم نے اپنی زندگیوں میں انقلاب لا کر اپنی سیرت و کردار کو کتاب و سنّت کے مطابق نہ ڈھالا۔ پورے معاشرے اور پھر پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند نہ کیا تو قیامت کے دن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کیا منہ دکھائیں گے۔

چوں بنامِ مصطفیٰ خانم درود
از خجالت آب میگردد وجود
عشق میگوید کہ اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر
تا نہ داری از محمّد رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ اُو

جب میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نام پر درود پڑھتا ہوں تو میرا وجود شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ عشق کہتا ہے کہ اے غیروں کے محکوم! تیرا سینہ بت خانہ کی مانند بتوں سے بھرا

ہوا ہے۔ جب تک تو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے طور طریقے نہ اپنائے اپنے درود سے آپؐ کے نام کو آلودہ نہ کر۔

اگر ہم دنیا میں باعزّت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنا دل اللہ تعالیٰ سے وابستہ کریں، غیر اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر اللہ پاک کی اطاعت کو اپنا شعار بنائیں۔ اور اس راستے پر چلیں جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے چلنے کا حکم دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح آپؐ نے دین پر عمل کیا، اسے دنیا میں غالب کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہے اسی طرح ہم بھی سنّتِ نبویؐ پر عمل کریں اور دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لئے اپنا مال، وقت اور جان کھپا دیں اور اس راہ میں جو بھی تکالیف آئیں انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کریں۔

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

اگر تو اس دنیا میں اپنا مقام چاہتا ہے تو اپنا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا اور مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کا راستہ اختیار کر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا راستہ شریعت ہے۔ امّتِ مسلمہ کے لئے یہی آئین ہے۔ یہی اس کی دونوں جہانوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔ شریعت پر عمل کرنے کے لئے آپؐ کی سنّت کو اپنانا ضروری ہے اور آپؐ کی سنّت میں سب سے مقدّم چیز محبّت ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت سے اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بندوں کے ساتھ محبّت سے ان کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ آپؐ کی شریعت میں جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ اسے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتارنے اور اپنی زندگی میں نافذ کرنے میں ہمارے استحکام کا راز مضمر ہے۔ اس کے تحت نظامِ حکومت چلا کر ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس میں قوّت بھی ہے اور محبت بھی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السّلام کے پاس عصا بھی تھا اور روشن ہاتھ بھی۔ وہ قوّت سے بھی کام لیتے تھے اور حُسنِ اخلاق سے بھی دلوں کو مسخّر کرتے تھے۔ اسی طرح ہماری شریعت میں بھی

یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ان میں سے اگر ایک چیز کو لے لیں اور دوسری کو ترک دیں تو ہم دونوں جہانوں میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ اسلام کی ترقی کا راز آئینِ شریعت نافذ کرنے میں ہے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا لایا ہوا دین محض چند رسمی عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ پوری زندگی کی تفسیر ہے۔ مسلمانوں نے جب تک اسے ضابطۂ حیات کے طور پر اپنائے رکھا وہ دنیا میں سربلند رہے لیکن جب انہوں نے اس کے کچھ حصّوں کو لے لیا اور کچھ حصّے ترک کر دیئے تو وہ اس شان و شوکت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت پر عمل کرنے سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصلِ سنّت جز محبّت ہیچ نیست
ملّت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمے خیزد دوام!
قدرت اندر علم او پیداستے
ہم عصا و ہم یدِ بیضاستے
با تو گویم سرِّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دینِ مصطفٰےؐ دینِ حیات!
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
تا شعارِ مصطفٰےؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت!

علمِ حق شریعت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اصل سنّت محبّت کے سوا کچھ نہیں۔ ملّت اللہ تعالیٰ کے کے تحت ہی منظّم ہوتی ہے اور ایک مضبوط نظام کے ذریعے ہی دوام حاصل کرتی ہے۔ اس کے

علم کے اندر قدرت ہے ۔ اس میں عصا بھی ہے اور روشن ہاتھ بھی۔ میں تمہیں اسلام کا راز بتاتا ہوں وہ شریعت ہے ۔ آغاز بھی شریعت اور انجام بھی شریعت ہے۔ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ضابطۂ حیات ہے۔ اس ضابطۂ حیات کی تفسیر شریعت ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے ہاتھ سے چلے گئے تو گویا قوم نے اپنی بقا کا راز کھو دیا۔

آپؐ سے کامل محبت کے لئے اتباعِ سنّت کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ علامہ اقبال کے بیان کردہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کس طرح نصیب ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: پہلے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شعار بناؤ اور پوری زندگی کو اس سانچے میں ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو یہی دیدارِ رسولؐ ہے ۔

اس وقت بعض لوگوں نے دین میں غیر اسلامی نظریات کو شامل کر کے شریعت سے گریز کی راہیں نکال لی ہیں اور طریقت اور معرفت جیسی پاکیزہ اصطلاحات کو بھی غلط معنی پہنا دیئے ہیں ۔ حالانکہ یہ سب شریعت پر عمل کے مختلف مدارج ہیں۔ جتنا کسی کا عمل شریعت پر زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ عشقِ رسولؐ سے سرشار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا۔ شریعت سے گریز کر کے کوئی شخص عارفِ حق ہونے کا دعویٰ کرے گا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا متصوّر ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم ۔

تحقیق ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا ہے

اسے ایک عظیم الشّان جسم دے کر دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے جو کسی دوسرے جاندار کو عطا نہیں کی گئیں ۔ وہ اپنے اعضاء کو اس طرح استعمال کر سکتا ہے جس طرح دوسرے جاندار نہیں کر سکتے ۔ وہ اپنے اردگرد کی اشیاء کو اپنے تصرّف میں لا سکتا ہے ۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخّر کر دی گئی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے ۔ اس کو خلافت

کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے احسن التقویم بنایا گیا ہے۔ خلافت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرے اور اس کا دیا ہوا نظام اس طرح دنیا میں چلائے کہ یہ دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو برتری حاصل ہو۔ تمام انسان ایک دوسرے کے خیر خواہ بن جائیں۔ کسی کے حقوق غصب نہ ہوں۔ کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔ چھوٹے بڑوں کا احترام کریں۔ بڑے چھوٹوں پر شفقت کریں۔ ہر شخص کی عزّت اور جان و مال محفوظ ہو۔ بندہ و آقا کی تمیز ختم ہو جائے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہوں۔ مساوات و حرّیت کی ایسی فضا قائم ہو کہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کے مدارج طے کر سکے۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دِہ تصوّر کرے اور زندگی کا ہر لمحہ اس کی اطاعت میں بسر کرے۔ جو شخص بھی اپنے آپ کو اطاعت کے اس معیار پر لے آئے گا دنیا کی تمام قوّتیں اس کے سامنے مسخّر ہوتی چلی جائیں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں نے مکمّل طور پر اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا تو دریا ان کے سامنے پایاب ہو گئے۔ افریقہ کے جنگلوں میں آباد ہوئے تو جنگلی جانوروں نے ان کے لئے جنگل خالی کر دیئے۔ انہیں ضرورت پڑی تو زہر ہلاہل ان کے لئے قند بن گیا۔ آج بھی ان کے لئے آتشِ نمرود گلزار بن سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ایمانِ ابراہیمی کی ضرورت ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

جب ہم اس کی اطاعت سے رُوگردانی نہیں کریں گے تو اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی ہمارے حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔ اسی کا نام شریعت اور طریقت ہے۔ یہی عشق اور یہی ایمانِ ابراہیمی ہے۔

تا توانی گردن از حکمش مپیچ !!!
تا نہ پیچد گردن از حکم تو ہیچ
از شریعت احسن التقویم شو
وارثِ ایمانِ ابراہیم شو

پس طریقت چیست اے والاصفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

جہاں تک ہو سکے اس کے حکم سے گردن نہ پھیر تاکہ کوئی تیرے حکم سے گردن نہ پھیرے ۔ شریعت کے ذریعے احسن التقویم بن اور ابراہیم علیہ السّلام کے ایمان کا وارث بن۔ پس اے عالی مرتبت! طریقت کیا ہے۔ شریعت کو زندگی کی گہرائیوں سے دیکھنا طریقت ہے ۔

اسلام اپنے پیروکاروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ معاشرے میں ایسا نظام قائم کریں جس سے اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔ انسان پر سے انسان کی حکمرانی ختم ہو اور اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم ہو۔ کوئی انسان کسی سرمایہ دار، جاگیردار یا مذہبی پیشوا کا بندہ نہ بنے بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرے۔ تمام انسانوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ ہر شخص کو اس کی محنت کا ثمر ملے۔ کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے۔ سربراہِ مملکت سے لے کر عام شہری تک ایک ہی قانون کے پابند ہوں۔ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہ ہو۔ کسی کو قانونی لحاظ سے کسی قسم کا امتیاز حاصل نہ ہو۔ ہر شخص کو حق حاصل ہو کہ وہ غلط کام پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی حیثیت کے مالک شخص کو ٹوک سکے اور اس سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے عدالت کے کٹہرے میں لا سکے۔ کوئی شخص دوسرے شخص کا محتاج نہ رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور اس نظام کے تحت کسی ادارے کو کتاب و سنّت کے خلاف آئین سازی کا حق نہ ہو۔

اسلامی نظام محض حجروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے اور ہُو حق کے نعرے لگانے سے قائم نہیں ہوگا ۔ انفرادی طور پر نماز پڑھ لینے، زبان سے کچھ ذکر اذکار کر لینے یا خالی چلّے کاٹنے سے برپا نہیں ہوگا بلکہ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ حجروں سے نکل کر ہر میدان میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا ۔ برائی کے خلاف سینہ سپر ہونا ہوگا ۔ بدعت و شرک اور آباء و اجداد کی رسوم کی زنجیروں کو توڑنا ہوگا ۔ برادری کی ناراضگی کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ لسانی وطنی اور خاندانی تعصّبات کے زنگار کو دلوں سے صاف کرنا ہوگا۔ اپنے اندر قوّت اور

طاقت پیدا کرنی ہوگی۔ اپنے نفس کے خلاف ہر لمحے جہاد کرنا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ مال، اولاد اور جاہ و منصب کی محبّت کو دل سے نکالنا ہوگا۔ پھر کہیں اسلامی نظام برپا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا اپنے نبیِّ آخر الزّماں کو شریعت دے کر بھیجنے کا مقصد پورا ہوگا۔ اس طرح انسان کا وقار دنیا میں بلند ہوگا۔ اس کی عزّتِ نفس کا تحفّظ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کا منشا پورا ہوگا۔

ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت ہی انسان کے حقوق کے تحفّظ کی ضمانت دے سکتی ہے اور محتاجوں کو ان کی بنیادی ضروریات فراہم کر کے انہیں سوال کی ذلّت سے بچا کر ان کی عزّتِ نفس کی حفاظت کر سکتی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا انسان انسان کا محتاج بنا رہے گا۔ اور اپنی ضروریات کی فراہمی کے سلسلے میں اپنے جیسے بھائی بندوں کا دست نگر رہے گا۔ اسلامی حکومت چونکہ خدا کے نام پر قائم ہوگی اس لئے وہ حاجت مندوں کی ضروریات کا سامان کر کے ان پر کوئی احسان نہیں کرے گی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ ایک اہم فریضے کی تکمیل کرے گی۔ اس لئے ہر شخص معاشرے میں اپنی گردن بلند رکھ سکے گا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے جھکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ہمارے مذہبی پیشواؤں نے شریعت کے اس مقصد کو لوگوں سے اس لئے مخفی رکھا کہ اگر صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمرانی قائم ہو جائے تو وہ بھی دوسرے انسانوں کے برابر آجائیں گے۔ اپنے مریدوں اور پیروکاروں پر ان کا تفوّق ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے رسمی عبادات اور درود و وظائف تو بتائے لیکن دین و شریعت کی حقیقی روح ظاہر نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نے اپنے سیرت و کردار کی تشکیل حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے مطابق کرنے کی بجائے صرف زبان سے درود و سلام اور درود وظائف پر اکتفا کر لیا اور انہی چیزوں کو تقرّبِ الٰہی اور عاشقِ رسولؐ بننے کا ذریعہ بنا لیا۔ اس طرح قوم کے ضمیر کے اندر ایمان کی دبی ہوئی چنگاری راکھ ہو گئی۔

ہر کہ از سرِّ نبی گیرد نصیب
ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب
اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم!
تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مُبیں را فاش کن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مُبیں ایں است و بس
مکتب و مُلّا سخنہا ساختند
مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد
آتشِ او در ضمیرِ او فسُرد

جو کوئی نبیؐ کے راز سے حصّہ پائے وہ جبریلِ امیں کے قریب ہو جاتا ہے۔ اے قرآن حکیم پر فخر کرنے والے کب تک حجرے میں بیٹھا رہے گا۔ دنیا میں دین کے رازوں کو ظاہر کر اور شریعت کے نکتے کو کھول دے۔ دنیا میں کوئی شخص کسی کا محتاج نہ رہے۔ شرعِ مبیں کا یہی ایک نکتہ ہے اور بس۔ مدرسے اور مُلّا نے باتیں بنائیں لیکن مومنوں کو یہ بات نہ سمجھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندہ قوم تاویل سے مردہ ہو گئی اور اس کی آگ اس کے ضمیر کے اندر بجھ گئی۔

دنیا میں اس وقت اونچ نیچ کی تفریق اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح زمانۂ جاہلیت میں موجود تھی۔ امیر اپنے حال میں مست ہیں اور فقیر اپنے حال میں مست ہیں۔ غریب آدمی کی کہیں شنوائی نہیں۔ اسے حصولِ انصاف کے لئے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کچھ لوگ غلط نظامِ حکومت کی وجہ سے قانون سے بالاتر بنے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مال اور منصب کی بدولت

جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ سے قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں۔ ابھی تک دنیا میں "بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی" کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عشق کا تقاضا یہ ہے کہ اس نصب العین سے عشق کیا جائے۔ جس کے لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ساری زندگی جہاد کیا۔ اور وہ نصب العین یہ تھا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہو اور انسان اپنے کسی ہم جنس کا بندہ بن کر نہ رہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرے تاکہ وہ اس شرفِ انسانیت کو بحال رکھ سکے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے۔ ہر انسان کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ سارے کے سارے انسان اس ضابطۂ حیات کے پابند ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ اور جسے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عملاً نافذ کیا۔ جب تک ایسا نہیں ہو گا، کچھ لوگ بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں رہیں گے اور کچھ لوگ اپنا حکم چلا کر انہیں محکوم بنائے رکھیں گے۔ جو شخص حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات سے عشق کا دعویٰ کرتا ہے لیکن ان کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو عملاً نافذ کر کے انسانوں کو تاریکی سے روشنی اور گمراہی سے ہدایت کی طرف لانے کی جدوجہد نہیں کرتا اس کا عشق کامل نہیں ہے۔ دنیا صرف آفتابِ نبوت کی ضیا پاشیوں سے منوّر ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا دنیا سے جہالت و گمراہی کی تاریکی دور کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عشق کا دعویٰ کرنے والے ہر مردِ مومن کا فرض ہے کہ وہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرے تاکہ پستی میں گرے ہوئے انسان بلندیوں پر فائز ہو سکیں!

قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے!
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے!

دوسرا باب

ملّتِ اسلامیہ اور اس کا مقصد

اسلام میں قوم یا ملّت کی بنیاد رنگ، نسل، زبان یا وطن نہیں بلکہ نظریۂ توحید ہے۔ جو بھی ایک بار اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر کے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کی تعلیم پر ایمان لا کر مسلمان ہو جاتا ہے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو باقی تمام مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسلام نسلی، لسانی، خاندانی، علاقائی اور دیگر تعصّبات کا خاتمہ کر کے ایک عالم گیر برادری کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسلام میں تفوّق اور برتری رنگ، نسل یا خاندان کی بنیاد پر نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیز گاری پر ہے۔ جتنا کسی شخص میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر پختہ یقین اور اس پر عمل ہوگا اتنا ہی وہ مقرّب الٰہی بن جائے گا۔ ایک بار انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائے تو وہ تمام مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے۔ خواہ وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا ہو، عربی ہو یا عجمی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہارے گروہ اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تمہاری پہچان ہو سکے۔ بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ مکرّم وہ ہے جو زیادہ متّقی ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ

ترجمہ: "قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملّت پر اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ تمام دنیا کے رہنے والے مسلمان ایک ملّت اور قوم ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی خطّے میں رہ رہے ہوں۔ مسلمان اپنے آپ کو کسی خاص علاقے یا خاندان سے منسوب نہیں کرتا۔ ایسا کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل
از اَبیکم گیر اگر خواہی دلیل
اصل ملّت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملّتِ ما را اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بندِ این و آں وارستہ ایم
مدّعائے ما مآلِ ما یکے ست
طرز و انداز و خیالِ ما یکے ست
ما ز نعمتہائے او اخواں شُدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شُدیم

ہم مسلمان ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ اگر تو دلیل چاہے تو قرآن کی آیت مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ سے دلیل حاصل کر۔ قوم کی بنیاد وطن میں دیکھنا کیسا ہوا

پانی اور مٹی کو کیا پوجنا ! نسب پر فخر کرنا حماقت ہے۔ اس کا تعلق جسم سے ہوتا ہے اور جسم فانی ہے۔ ہماری قوم کی بنیاد دوسری ہے۔ یہ بنیاد ہمارے دل کے اندر پوشیدہ ہے۔ ہم حاضر ہیں لیکن ہم نے دل کو غائب (اللہ تعالیٰ) سے وابستہ کر رکھا ہے۔ پس ہم ایسی ویسی پابندی سے آزاد ہیں۔ ہمارا مقصد اور انجام ایک ہے۔ ہمارے طور طریقے اور ہمارا خیال ایک ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمت (اسلام) سے بھائی بھائی بن گئے۔ ہم یک زبان، یک دل اور یک جان ہو گئے۔

ملّت کا یہ تصوّر محض نظریاتی نہیں بلکہ عملی طور پر دنیا ایسی ملّت کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کلمۂ توحید کے ذریعے جس ملّت کی بنیاد رکھی تھی اس کے افراد میں ایسی محبّت اور اخوّت ہوتی تھی کہ دوسری قوموں کے حقیقی بھائیوں میں ایسی محبّت کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا رنگ سیاہ تھا۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ روم کے رہنے والے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی محفل میں یہ خاندانِ قریش کے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے اور ان میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو ان کی حضورؐ سے گہری محبّت کی وجہ سے سیّدنا (ہمارے سردار) کہا کرتے تھے۔

اسود از توحید احمر می شود

خویشِ فاروق و ابوذر می شود

توحید کے ذریعے کالا گورا بن جاتا ہے۔ یعنی گورے آدمی کا ہمسر بن جاتا ہے اور عمر فاروقؓ اور حضرت ابوذرؓ کا قرابت دار ہو جاتا ہے۔

مسلمان کسی ایک مقام سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ طارق بن زیاد فاتح اندلس جب سمندر عبور کر کے اندلس کے ساحل پر پہنچے تو انہوں نے کشتیاں جلانے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے کہا

کہ ہم وطن سے دور ہیں۔ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ کشتیاں ہماری واپسی کا ذریعہ ہیں۔ اپنے واپسی کے اسباب ختم کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جب کشتیاں جل چکیں تو طارق ابن زیاد نے جہاد کے متعلق تقریر کی اور کہا " آگے دشمن ہے، پیچھے سمندر ہے واپسی کے اسباب ختم ہو چکے ہیں۔ اب یا تو اس ملک کو فتح کر کے حق کا بول بالا کر دیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاؤ۔ مومن کی زندگی کا مقصد نہ مالِ غنیمت حاصل کرنا ہوتا ہے نہ سلطنت حاصل کرنا بلکہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت سے سرفراز ہونا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مسلمان کا وطن کوئی خاص ملک یا علاقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا جہاں بھی پہنچ جاتا ہے وہی اس کا وطن ہوتا ہے۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت کے ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اسلام لانے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ایذا دیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد طائف کی طرف چلے گئے۔ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگی۔ ایمان سے مشرف ہوئے اور آپ کی شان میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ اس قصیدے میں آپ کو حضرت کعبؓ نے " سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ الْھِنْد " ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار (اس زمانے میں ہندوستان کی تلوار اپنی تیزی اور کاٹ کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھی) کہا۔ آپ نے انہیں معاف فرما دیا اور قصیدے کے بدلے ایک چادر مرحمت فرمائی، اسی لئے یہ قصیدہ قصیدۂ بُردہ کے نام سے مشہور ہے (بُردہ عربی میں چادر کو کہتے ہیں۔) اور ساتھ ہی اصلاح فرمائی کہ "سیف مِن سیُوفِ الھند" کی بجائے "سَیْفٌ

مِّنْ سُيُوْفِ اللّٰہ "یعنی اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کہو۔ گویا آپ نے اپنے آپ کو کسی ملک کی طرف منسوب کرنا پسند نہ فرمایا :

جوہرِ ما بمقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
صورتِ ماہی بہ بحر آزاد شو!
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو!

ہمارا جوہر کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کی سخت شراب کسی ایک جام تک محدود نہیں ہے۔ مچھلی کی مانند سمندر میں آزاد رہ یعنی کسی مقام کی قید سے آزاد ہو جا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہجرت میں جو حکمت پوشیدہ ہے اسے ہمارے سامنے ظاہر نہیں کیا گیا۔ اسے ایک قصّے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور اس کے اصل مقاصد کو بے نقاب نہیں کیا جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دشمنوں کے خوف سے ہجرت کی تھی۔ حالانکہ ہجرت کا مقصد دشمنوں کا خوف نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ انہیں دشمنوں سے محفوظ رکھے گا۔ چنانچہ فرمانِ خداوندی ہے :

وَ اللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاس

اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں سے بچالے گا۔

آپ کی ہیبت اور شوکت سے تو دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ آپؐ نے خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی کبھی دشمنوں کا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہجرت کی وجہ محض دشمنوں کا خوف قرار دینا بے معنی سی بات ہے۔ دراصل ہجرت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ درس دیا جائے کہ ان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ نظریہ توحید ہے۔ مسلمانوں کو دریا کی خاطر قطرے کو اور باغ حاصل کرنے کے لئے پھول

کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود !!
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد
براساسِ کلمۂ تعمیر کرد
قصّہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است
ترک شبنم بہرِ تسخیرِ یم است
بگذر از گل گلستاں مقصود تُست
ایں زیاں پیرایہ بندِ سُود تُست

ملّتِ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلم قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ ہمارے آقا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وطن سے ہجرت کی۔ آپؐ کی حکمت نے دنیا میں پھرنے والی قوم کی تعمیر کلمۂ توحید کی بنیاد پر کی۔ قصّہ سنانے والوں نے ہم سے حق کو پوشیدہ رکھا اور ہجرت کے معنی غلط سمجھائے۔ ہجرت مسلمان کی زندگی کا دستور ہے۔ یہ مسلمانوں کے ثبات و استحکام کا ایک سبب ہے۔ اس کا مطلب تھوڑے پانی سے گریز اور دریا کی خاطر شبنم کو ترک کرنا ہے۔ اے مسلمان پھول کو چھوڑ دے تیرا مقصود تو باغ ہے (پھول چھوڑنے کا) یہ نقصان تیرے فائدے کی خاطر ہے۔

جن لوگوں نے وطن کو ملّت کی بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے نوعِ انسانی کے لئے فساد کی راہیں کھول دی ہیں۔ دنیا میں آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ انسانی جسم باقی ہے۔

لیکن آدمیت مفقود ہوگئی ہے ۔ انہوں نے وطن کو شمع محفل بنا کر انسانوں کو مختلف قبائل میں تقسیم کر دیا ہے ۔ کلمۂ توحید پر ملّت کی اساس جنّت کے مترادف تھی لیکن انہوں نے اس کی جگہ ملّت کے دوسرے ذرائع تلاش کر کے جہنّم میں جنّت کی تلاش کی ہے ۔ یہ کیسے لوگ ہیں جنہوں نے جنّت کو جہنّم سے بدل لیا ہے ۔ ان کا یہ عمل قرآن پاک کے اس قول کا مصداق ہے :

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ
جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا وَ بِئْسَ الْقَرَار

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتار دیا ۔ دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے اور ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے ۔

آں چناں قطعِ اخوّت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملّت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند
جنّتے جستند در بئس القرار
ما اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارُ الْبَوَار
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
رُوح از تن رفت ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

انہوں نے اخوّت کے رشتے کو اس طرح توڑا ہے کہ وطن پر قوم کی تعمیر کی ہے جب

انہوں نے وطن کو شمعِ محفل بنا دیا تو نوعِ انساں کو قبائل میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے بدترین ٹھکانے میں جنت کو تلاش کیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی قوم کو بدترین جگہ پر لے گئے۔ دنیا میں انسانیت افسانہ بن گئی، آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا، جسم سے روح نکل گئی اور جسم باقی رہ گیا۔ آدمیت گم ہو گئی اور قومیں باقی رہ گئیں۔

مسلمان اپنے دل سے تمام تعصبات نکال کر صرف مسلمان ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ قابلِ فخر چیز دولتِ ایمان ہے۔ وہ افغانی، ترکی، ایرانی یا پاکستانی بعد میں، ہوتا ہے پہلے مسلمان ہوتا ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

ہم نہ افغانی ہیں نہ ترکی نہ تاتاری۔ ہم ایک چمن اور ایک شاخسار (اسلام) سے ہیں۔ ہم پر رنگ و بو کی تمیز حرام ہے۔ ہم ایک نئی بہار کے پروردہ ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے کسی نے نسب پوچھا تو آپ نے فرمایا "سلمان بن اسلام!" اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نسب کوئی قابلِ فخر چیز نہیں رہتی۔ بلکہ اسلام انسان کو جو عزت اور شرف بخشتا ہے وہی اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب شام فتح ہوا تو عیسائیوں نے بیت المقدس کی چابیاں حوالے کرنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ مسلمانوں کے خلیفہ خود تشریف لائیں، ہم چابیاں ان کی خدمت میں پیش کریں گے۔ حضرت عمرؓ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ جب قریب پہنچے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ہمراہ استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ آپ کے پاس سواری کا ایک اونٹ تھا جس پر آپ اور آپ کا غلام

باری باری سوار ہوتے تھے۔ اتفاق سے بیت المقدس کے قریب حضرت عمرؓ کی باری پیدل چلنے کی تھی۔ آپ کے لباس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کی "یا امیر المومنین اونٹ پر سوار ہو جائیے اور نئے کپڑے پہن لیجیے۔ یہاں کے لوگ آپ کے لئے چشم براہ ہیں۔ جب وہ آپ کو اس حالت میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔" آپ نے فرمایا: ہماری عزت و عظمت لباس سے وابستہ نہیں! اسلام نے ہمیں جو شرف بخشا ہے ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ چنانچہ آپ اسی حالت میں شہر میں داخل ہوئے۔ عیسائی رہنماؤں نے دیکھتے ہی بیت المقدس کی چابیاں آپ کے حوالے کر دیں اور کہا ہماری کتابوں میں فاتحِ بیت المقدس کی جو نشانیاں لکھی ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے

مغربی اقوام کا انحصار رنگ، نسل، زبان یا وطن پر ہے۔ وہاں ایک رنگ رکھنے والے، ایک زبان بولنے والے یا ایک وطن میں رہنے والے اپنے آپ کو ایک قوم کہتے ہیں۔ قوم کا یہی معیار فتنہ و فساد کا موجب ہوتا ہے۔ اسلام ان تمام امتیازات کا قلع قمع کرتا ہے اور اسے انسانیت کے لئے سمِ قاتل سمجھتا ہے۔

مدینے میں ایک دفعہ اوس اور خزرج کے قبیلوں کے دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہ وہ قبیلے تھے جن کی آپس میں بڑی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی اور ان کی آپس میں کئی خونریز جنگیں ہو چکی تھیں لیکن جب یہ قبیلے مسلمان ہوئے تو اسلام کی برکت سے آپس میں بھائی بھائی اور ایک دوسرے کے خیر خواہ بن گئے۔ خزرج قبیلے کے آدمی نے اپنے رشتہ دار اوس کو قبیلے کے نام پر آواز دی۔ قریب تھا کہ یہ قبیلے پھر آپس میں برسرِ پیکار ہو جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا قبیلے کے نام پر پکارنا شیطان کی آواز ہے۔ میں

تمہیں امن و سلامتی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور تم پھر جاہلیت کی طرف لوٹنا چاہتے ہو۔ تم اپنے قبیلوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلام کی بدولت بھائی بھائی بنے ہو۔ انہوں نے غلطی کا اعتراف کیا اور معذرت طلب کی۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیّت کہاں
اور جمعیّت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی!

علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ زندہ قوموں کے لئے ایک مرکزِ محسوس کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمان قوم کا مرکز بیت الحرام ہے۔ مسلمانوں کو اس سے وابستہ رہنا چاہیئے اور کسی جگہ کو مرکز قرار نہیں دینا چاہیئے۔ موسیٰ علیہ السّلام کی قوم نے جب تک بیت المقدس کو اپنا مرکز بنائے رکھا، اس کی جمعیت قائم رہی اور جب اس نے اس مرکز کو چھوڑ دیا تو اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ مسلمان بھی جب تک بیت الحرام سے وابستہ رہیں گے اور اس کا طواف کرتے رہیں گے دنیا میں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے اور جب اس کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیں گے تو ان کا بھی شیرازہ بکھر جائے گا ؎

قوم را رَبط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے
راز دارد رازِ مابیت الحرام
سوز ما ہم سازِ مابیت الحرام
توز پیوندِ حریمے زندہ ٔ
تا طوافِ او کنی پایندہ ٔ

قوم ایک مرکز کے ساتھ ہی مربوط اور منظّم ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کو مرکز ہی سے دوام حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا راز دار اور ہمارا راز بیت الحرام ہے۔ ہماری آرزوؤں اور ہماری تگ و دو کا محور بیت الحرام ہے۔ تو بیت الحرام سے وابستگی کے ذریعے زندہ ہے۔ جب تک تو اس کا طواف کرتا رہے گا قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔

ہر ایک امّت کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ جب اس کا وقتِ مقرر آجاتا ہے تو اس وقت ایک گھڑی کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

جس طرح افراد پر موت طاری ہوتی ہے اسی طرح قومیں بھی اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جاتی ہیں اور نئی قومیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن امّتِ مسلمہ قیامت تک کے لئے ہے۔ اس لئے کہ یہ امّت اس عہد کی پابندی کر رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل کے روز تمام روحوں سے لیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں کی تخلیق کر کے ان سے پوچھا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب نے کہا تھا بے شک تو ہمارا رب ہے۔ اسی عہد کی وجہ سے انسان کی سرشت میں یہ چیز موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کو پہچان لیتا ہے۔ کوئی شخص اپنے ضمیر کی آواز کو جان بوجھ کر دبا کر اس کے خلاف عمل کرے تو الگ بات ہے ورنہ عقلِ سلیم سے کام لیا جائے تو حقیقت تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالےٰ نے دنیا میں جتنے بھی صحیفے اور کتابیں نازل کیں ان میں سے سوائے قرآن پاک کے کوئی بھی اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں۔ ان کے ماننے والوں نے ان میں اپنی خواہشات کے مطابق تحریف کر لی اس لئے وہ قابلِ عمل نہ رہیں۔ قرآن پاک وہ واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمّہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس لئے یہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں موجود رہے گی۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ہم نے اس ذکر (قرآن پاک) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

دنیا میں مسلمان قوم بڑے بڑے فتنوں سے دوچار ہوئی۔ بڑی بڑی آزمائشوں سے گزری اسے مٹانے کی بڑی بڑی کوششیں کی گئیں لیکن اسے دنیا سے کوئی ناپید نہ کر سکا۔ جب بغداد میں علوم وفنون اپنے عروج کو پہنچے ہوئے تھے، تاتاریوں نے حملہ کر کے بغداد کو تباہ کیا اور مسلمانوں کی شان وشوکت کو خاک میں ملانے کی کوشش کی۔ بغداد نے خونریزی اور ہلاکت کے وہ مناظر دیکھے جو کبھی اپنے زوال کے وقت روم نے بھی نہ دیکھے تھے۔ لیکن مسلمان قوم کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والوں کے ارادے خاک میں مل گئے۔ قدیم یونانی، مصری اور رومی تہذیبیں دنیا سے مٹ گئیں لیکن اسلامی تہذیب کسی نہ کسی رنگ میں ہر زمانے میں موجود رہی ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

ہمارے سینوں میں توحید کی امانت ہے اس لئے ہمیں دنیا سے بالکل ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان امت قیامت تک کے لئے ہے اور قیامت تک موجود رہے گی ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا !!

اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے متعلق فرماتے ہیں:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کرے گا۔ اگرچہ یہ بات کافروں کو ناگوار گزرے۔

امّتِ مسلم ز آیاتِ خدا ست
اصلش از ہنگامۂ قالو بلیٰ ست

از اجل ایں قوم بے پرواستے !
استوار از "نَحْنُ نَزَّلْنَا" ستے !

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است
از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا خدا اَنْ یُّطْفُؤ فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست
ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست

مسلمان قوم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس کی بنیاد واقعہ " قالو بلیٰ " ہے ۔ یہ قوم اجل سے بے پروا ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قرآن پاک کی حفاظت کے ذمّے کی وجہ سے مضبوط ہے ۔ ذکر اپنے ذاکر کے قائم رہنے ہی سے قائم رہتا ہے ۔ اس کے دوام کی وجہ سے ذاکر کو بھی دوام حاصل ہوتا ہے ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اَنْ یُّطْفِؤُ فرمایا ہے اس لئے یہ چراغ بجھنے سے آسودہ ہے ۔ دنیا میں اذان کی آواز ماضی میں بھی بلند ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے ۔ امّتِ مسلمہ ماضی میں بھی موجود تھی اور اب بھی ہے ۔

قرآن پاک میں ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔

(اے امّتِ محمّدیہ) تم بہترین امّت ہو جو عام لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ

پر ایمان رکھتے ہو۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم چونکہ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لئے کارِ نبوّت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ تاکہ عام لوگوں تک دینِ حق کی دعوت پہنچتی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا میں مومنوں کے لئے جن کامیابیوں کا ذکر کیا ہے وہ اس کام سے مشروط ہیں اور جس خسران سے متنبّہ کیا ہے اس کا سبب اس کام کو ترک کر دینا ہے۔ قیامت کے دن جہاں مومن اپنے دیگر اعمال کا جواب دہ ہوگا وہاں اسے اس بات کا بھی جواب دینا ہوگا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا امّتی ہونے کی بنا پر اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو فریضہ سونپا گیا تھا اسے اس نے کس حد تک انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امّت کو بہترین امّت ہونے کا جو شرف بخشا ہے وہ اس کے اس اہم فریضے کی بنا پر ہے۔ اگر امّت اس کو انجام دے گی تو وہ دنیا و آخرت میں سرفراز ہوگی اور اگر اس کو ترک کر دے گی تو اس اعزاز کی بھی حق دار نہ رہے گی۔ ہماری قوّت و شوکت اور ملّت کے استحکام کا راز اسی کام میں مضمر ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ فرما کر کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اسلام کی شیرازہ بندی کر دی۔ جو بھی مسلمان ہوگا وہ آپ ہی کا امّتی ہوگا اور اگر کوئی نبوّت کا دعویٰ کر کے امّت میں انتشار کا باعث بنے تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا متصور ہوگا اور کوئی سچّا مسلمان اس کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرے گا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی اور آپ کی امّت آخری امّت ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے دنیا کے تمام مسلمان ایک ملّت ہیں۔ جس طرح آپؐ جہانوں کے لئے رحمت ہیں اسی طرح آپؐ کی امّت تمام دنیا کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے ؎

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

خدمتِ ساقی گری ما را گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لَا نَبِی بَعْدِی نِ احسانِ خداست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است
قوم را سرمایۂ قوّت ازو
حفظِ سرّ وحدتِ ملّت ازو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بَست

دینِ فطرت ہم نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سیکھا۔ ہم نے حق کے راستے میں مشعل جلائی اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کی۔ ہمارے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اللہ تعالیٰ نے رسالت ختم کردی ساقی گری کی خدمت ہم پر چھوڑ دی۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جو آخری جام تھا وہ ہمیں دے دیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان "لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (میرے بعد کوئی نبی نہیں) خدا کا ہم پر احسان ہے اور یہ دینِ مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عزّت کا پردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بعد نبوّت کے ہر دعوے کے نشان کو مٹا دیا اور ابد تک اسلام کی شیرازہ بندی کر دی۔

جو قوم اپنی زندگی کا مقصد متعیّن کر کے اسے زندہ رکھتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیتی ہے، وہ دنیا میں بلند مقام حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنے مقصد کو فراموش کر کے زندگی کی رنگینیوں میں کھو جاتی ہے، جد و جہد ترک کر کے آرام طلبی کو شعار بنا لیتی ہے وہ دنیا میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں نے جب تک اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنا مقصد بنائے رکھا اور اس کے لئے جد و جہد کرتے رہے وہ دوسری قوموں میں ممتاز حیثیت کے مالک رہے۔ لیکن جب انہوں نے اس مقصد کو چھوڑ دیا اور دنیا طلبی میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں امامت و قیادت

کے منصب سے ہٹا دیا۔ ہماری بقا اور استحکام کا راز اس مقصد کو دوبارہ زندہ کرنے اور اس کے حصول کے لئے جد و جہد کرنے میں مضمر ہے۔ یہ مقصد بالکل واضح، آسمان سے زیادہ بلند اور صبحِ صادق سے زیادہ روشن ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار
مقصدے مثلِ سحر تابندہ
ماسوا را آتشِ سوزندہ!!
مقصدے از آسماں بالا ترے
دلربائے دلستانے دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبے سراپا محشرے!

زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے۔ اس کی بنیاد مقصد میں مضمر ہے۔ مقصد کو دل میں زندہ رکھ تاکہ تیرا جسم مزار نہ بن جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ تیرے جسم میں تیرا مقصد دفن ہو کر رہ جائے۔ تیرا مقصد صبح صادق کی طرح روشن ہے۔ یہ ماسوا اللہ کے لئے آتشِ سوزاں ہے تیرا مقصد آسمان سے زیادہ بلند ہے۔ یہ بڑا ہی محبوب، پیارا اور خوبصورت ہے۔ یہ باطل کے لئے ہلاکت ہے۔ سینے میں حشر بپا کرنے والے ہنگامے کی طرح ہے۔

تیسرا باب

ارکانِ اسلام کی حقیقت

ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے ۔ اس امر کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم خدا کے بندے اور رسول ہیں، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ بخاری شریف کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ (خدا کی طرف سے) مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑوں جب تک وہ اس بات کا اقرار نہ کرلیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم خدا کے رسول ہیں اور پھر وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ ایسا کرنے لگیں تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچالیں گے اور صرف اسلام کا حق ان پر رہے گا اور ان کا حساب خدا کے ذمے ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ارکان کے علاوہ بھی اسلام کا حق ہے ۔ جسے مسلمان کو ادا کرنا ہے ۔ علّامہ اقبال ارکانِ اسلام کو صرف عبادت کا طریقہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے مسلمان کو بہت بڑے مقصد کے لئے تیار کرنے کا ذریعہ بھی خیال کرتے ہیں. ان کے نزدیک ان ارکان کے ذریعے مردِ مومن کے کردار میں پختگی اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق خلافت کے عظیم فرض سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوتا ہے ۔

ایمان باللہ : لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس کی تمام صفات کے ساتھ جن کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تعلیم دی ہے ایمان لایا جائے یعنی اس بات کا اقرار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ، مالک، خالق، رازق، دعائیں سننے والا، حاجت روا اور مشکل کشا نہیں۔ وہی جزا سزا کا مالک ہے۔ نفع و نقصان کسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ انسان صرف اللہ کا بندہ ہے۔ کسی پیر، عالم، دنیوی حاکم، بادشاہ یا مذہبی پیشوا کا بندہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں نہ تو کسی دوسرے کی حصّہ داری ہے نہ اس کے اختیارات میں کوئی شریک ہے۔ انسان کو اپنی پیشانی اس کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکانی چاہیئے۔ کلمے کا یہی مفہوم ہے اور یہی کلمہ ہے جسے دنیا میں بلند کرنا مومن کا نصب العین ہے۔ اسی کلمے کی سربلندی کے لئے دنیا میں انبیاء آتے رہے۔ اس کلمے کا مطلب یہ بھی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی تسلیم کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اس کو اپنا خالق اور مالک ماننے کے بعد دوسروں سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی تمنّا کرنا، غیر اللہ سے دعائیں کرنا اور ان کے سامنے التجائیں کرنا اسلام نہیں۔ اسلام تو یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اللہ کی بندگی اور اطاعت میں بسر کرے۔ جلوت میں، خلوت میں، گھر میں، بازار میں، کھیت میں، دکان میں، معیشت میں، معاشرت میں، حکومت میں، سیاست میں، غرضیکہ ہر جگہ ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کے احکام کو پیشِ نظر رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ مسجد میں جا کر چند ساعتیں اللہ کو یاد کر لیا اور پھر غافل ہو گئے۔ باقی اوقات میں اپنے نفس، اپنے امراء یا اپنے حکّام کی بندگی کرتے رہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ بادشاہوں کے درباروں میں عزّت تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ ساری عزّت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے: اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا۔ بے شک ساری عزّت

اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی بجائے کسی سردار، وڈیرے یا افسر کا قرب حاصل کر کے باعزت بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی دوستی پہ ناز کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو تسلیم کرنے اور اس کی رضا جوئی میں انسان کو جو مقام حاصل ہوتا ہے، اگر انسان اسے پہچان لے تو اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرنے والے بڑے بڑے سردار وڈیرے اور بادشاہ جن کی دوستی پہ وہ فخر کرتا ہے چیونٹیوں کی طرح معمولی نظر آنے لگیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی کا مفہوم سمجھ لیتا ہے وہ غیر اللہ کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالنا گوارا نہیں کرتا۔ جس کے دل میں حق سما جاتا ہے وہ دنیا سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ حق کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک بت پرست اور بت فروش خاندان میں آنکھ کھولی لیکن اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ ایک اللہ کے ہو کر رہے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے باپ کی گدی سنبھال کر بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے رب کو صحیح معنوں میں الٰہ، مالک، خالق اور رازق کی حیثیت سے پہچان چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے دنیا بھر کی مخالفت کا خطرہ مول لیا لیکن حق کا دامن چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ آتشِ نمرود میں پڑنا قبول کر لیا لیکن حق کے کلمے کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ دنیا میں اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا کام کرنے کی راہ میں بیوی بچے بھی بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں لیکن انہوں نے ان زنجیروں کو بھی ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ اللہ کا حکم آیا تو بیوی کو شیر خوار بچے کے ساتھ بے آب و گیاہ میدان میں تنہا چھوڑ کر چلے آئے اور جب اللہ کی رضا کی خاطر بیٹے کی گردن پہ چھری چلانی پڑی تو اس سے بھی گریز نہ کیا ؎

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست،
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شُد !!
فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسوا قطع نظر
می نہد ساطور بر حلقِ پسر
با یکے مثلِ ہجومِ لشکر است
جاں بچشمِ او زباد ارزاں تر است

جس کے جسم میں حق جان کی طرح ہو جائے اس کی گردن باطل کے سامنے خم نہیں ہوتی۔ اس کے سینے میں خوف راہ نہیں پاتا۔ اس کا دل غیر اللہ سے مرعوب نہیں ہوتا۔ جو "لا" کی سلطنت میں آباد ہوتا ہے وہ بیوی بچوں کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ ماسوا اللہ سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ دیتا ہے۔ وہ تنہا لشکر کے ہجوم کی مانند ہوتا ہے جان اس کی نظر میں ہوا سے زیادہ سستی ہوتی ہے۔

اس وقت دنیا ایک بتکدے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اگرچہ زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا جاتا ہے لیکن اس کے اصل تقاضے پورے نہیں کئے جاتے دنیا میں قوت اور اقتدار اللہ کے باغیوں اور اس سے پھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے اختیارات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقدس امانت سمجھ کر استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھ کر ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے اللہ کے بندوں پر ان کی گرفت مضبوط ہو اور ان کے اقتدار کو دوام حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا فسق و فجور سے بھر گئی ہے۔ کہیں وطن کے نام پہ دوسروں پہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور کہیں رنگ اور نسل کو بہانہ بنا کر انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ امن و سکون غارت ہو گیا ہے۔ طاقتور کمزوروں کا استحصال کر رہے ہیں۔ انسانوں کے حقوق انسانوں کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں۔ لوگوں نے حلبِ زر کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ نے ان سے بھی بدتر حالات میں حق کا کلمہ بلند کیا تھا۔ اب بھی جو مردِ حق کلمہ حق لیکر اٹھے اور اللہ

کے دین کو غالب کرنے کے لئے جہاد کرے وہی اس زمانے کا خلیل ہے ؎

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے!

مسلمان کا وجود دنیا کے لئے سراپا خیر ہوتا ہے وہ برائیوں کو مٹاتا اور بھلائیوں کو پھیلاتا ہے۔ اپنوں اور غیروں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ یہ باتیں اسی وقت ممکن ہیں جب انسان غیر اللہ سے نفع و نقصان کی امید نہ رکھے اور ان سے مکمل طور پر بے نیاز ہو جائے ؎

مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہلِ عالم را سراپا خیر شو

تو مسلمان ہے غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا اور جہان والوں کے لئے سراپا خیر بن جا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ انسان کے جسم کے اندر گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے۔ اور یاد رکھو وہ دل ہے۔ جب تک دل حسد، بغض، کینہ، نفرت اور دوسری روحانی بیماریوں سے پاک نہ ہو اور اس میں خشیتِ الٰہی پیدا نہ ہو تو زبان سے انسان خواہ کتنا ہی لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتا رہے اس کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ دل اور نگاہ کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ نگاہ اگر پاک نہ ہو تو دل بھی صاف نہیں ہوتا اور دل صاف نہ ہو تو احکامِ الٰہی کی اطاعت برضا و رغبت نہیں ہو سکتی۔ وہ دل جس میں حق پر نثار ہونے کا جذبہ نہ ہو وہ بھی مسلمان نہیں ہوتا اور جو نگاہ مشاہدے کے ذریعے حق و باطل میں تمیز نہ کر سکے وہ بھی مسلمان نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے معاملات پر انسان کی نگاہ پڑتی ہے۔ نگاہ کے مشاہدے کے مطابق دل فیصلہ کرتا ہے۔ نگاہ پاک ہو تو دل کی سوچ اور فکر بھی پاک ہوتی ہے اور نگاہ کج بیں ہو تو دل کے فیصلے بھی درست نہیں ہوتے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے دل پر اس کا عکس پڑتا ہے اور دل آنکھ کے مشاہدے کے

مطابق اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے ؎

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو!

انسان جو بھی اعمال کرتا ہے اس کے ابتدائی مراحل دل و نگاہ سے طے ہوتے ہیں۔ عقل کے فیصلے بھی اسی وقت پختہ ہوتے ہیں جب دل و نگاہ ان سے اتفاق کر لیتے ہیں۔ اس لئے عقل کی حقیقت تک رسائی اسی وقت ہوتی ہے جب نگاہ اور دل اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ تنہا عقل، کے فیصلے بے روح جسم کی مانند ہوتے ہیں اس لئے دل و نگاہ کا مسلمان ہونا نہایت ضروری ہے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے چاند ستاروں اور سورج کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل کی اور پھر ایک اسی کے ہو کے رہ گئے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بڑی سے بڑی مشکل اور مصیبت کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے تو اس کا نفس اسے گمراہ کرنے کے درپے رہتا ہے۔ ایمان پر استقامت اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جو ہر لمحہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا رہتا ہے۔ برائی سے اجتناب کرتا اور نیکی کی طرف مائل رہتا ہے۔ ہر لمحے خدا کی یاد کو اپنے دل میں تازہ رکھتا ہے اور حرص و ہوس کے بتوں کو توڑ کر رضائے الٰہی کا طالب رہتا ہے۔

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے،
ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

ایک سچا مومن ہمیشہ حق پر قائم رہتا ہے۔ اس کا عمل خیر و شر کا معیار ہوتا ہے۔ وہ دین کا مکمل شعور رکھتا ہے۔ اس لئے وہ غیر اللہ کے سامنے ناصیہ فرسائی نہیں کرتا۔ اگر اس کے مقصد تک پہنچنے کے لئے حالات سازگار نہ ہوں تو وہ انہیں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ نہیں چلتا بلکہ زمانے کو اپنے ساتھ چلاتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے زلزلے کیساتھ

جنگ بھی کرنی پڑے تو گریز نہیں کرتا۔ اللہ کی زمین پر اگر غیر اللہ کے قوانین چل رہے ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے باغیوں کو حکومت و اقتدار سے ہٹا کر حکومت کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرتا ہے اور اقتدار کی قوت کو برائیوں کو مٹانے اور بھلائیوں کو پھیلانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان اور یقین رکھنے والا مسلمان باطل قوتوں کے سامنے جھکتا نہیں بلکہ انہیں زیر کر کے حق کے تابع کرتا ہے ؎

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکامِ او نہ گردد
بکامِ خود بگرداند زمیں را

جو مسلمان دین کی رمز کو جانتا ہے وہ غیر اللہ کے سامنے پیشانی نہیں رگڑتا۔ اگر آسمان اس کے حسبِ منشا گردش نہ کرے تو وہ زمین کو حسبِ منشا گردش پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی حالات اگر قدرتی طور پر اس کے موافق نہ ہوں تو وہ بزورِ انہیں اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

اصل قوت اور اقتدار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ مسلمان کو اسی پر توکل کرنا چاہیئے۔ اسی سے ڈرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نفع نقصان کا مالک سمجھنا، حاجت روا اور مشکلکشا خیال کرنا گمراہی ہے۔ مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ اور مالک سمجھتا ہے اور اس کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ اس کا ہر کام اس کی خوشنودی کے لئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے احکام کی پیروی میں دنیا کی کسی شے کی محبت اس کی راہ کا روڑا نہیں بنتی۔ اللہ تعالےٰ کے احکام کے خلاف جو شخص بھی اپنا بنایا ہوا ضابطہ اور قانون چلاتا ہے وہ باطل ہے خواہ وہ کوئی دنیوی حکمران ہو یا کوئی مذہبی پیشوا۔ اور اس کو تسلیم کرنا اس کی بندگی کے مترادف ہے۔ ایک مومنِ صادق حق پر ہوتا ہے، حق کو قائم کرتا ہے اور ہمیشہ حق کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ باطل کی ڈٹ کر

مخالفت کرتا ہے اور اس سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ وہ بے خوف ہو کر غیر اللہ کے خس و خاشاک کو شعلہ بن کر جلا دیتا ہے۔ دنیا میں اسلام ہی سچّا اور قابلِ عمل دین ہے۔ انسانیت کی بھلائی اسی دین میں ہے۔ یہی دونوں جہانوں میں انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ سوشلزم، کمیونزم، سرمایہ داری، جاگیرداری اور مغربی جمہوریت باطل نظام ہائے زندگی ہیں۔ مسلمان کا کام ان کی حمایت کرنا نہیں بلکہ انہیں دنیا سے نیست و نابود کرنا ہے ؎

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

○

نماز

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔

بیشک نماز بے حیائی کے کاموں اور برائی سے روک لیتی ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان ہر وقت خدا کا بندہ ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کی عبادت میں بسر ہونا چاہیئے۔ اس کے عقائد و افکار، اخلاق و اطوار، تہذیب و تمدّن، معاشرت و معیشت، صنعت و تجارت، جملہ انفرادی اور اجتماعی امور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہونے چاہئیں، اسی کا نام عبادت ہے۔ نماز اس ہمہ وقتی عبادت کے لئے تیار کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کے ربّ العالمین ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اور اس عہد کو دہراتا ہے کہ "میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔" وہ نماز کے آغاز ہی میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "میں کسی غیر کی اطاعت نہیں کروں گا اور

اپنی پوری زندگی کو تیرے احکام کے تابع کر دوں گا۔" پھر انسان کبھی کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی رکوع کرتا ہے۔ کبھی سجدے میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ مشق کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا کھڑا ہونے کے لیے حکم آئیگا تو وہ کھڑا ہو جائے گا اور جب جھکنے کا حکم آئے گا تو جھک جائے گا۔ جس طرح وہ نماز میں تمام دنیا سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسی طرح نماز کے علاوہ باقی اوقات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اس طرح تعمیل کرے گا جس طرح نماز میں کرتا ہے۔ نماز میں اطاعت، مساوات، خدا کی راہ میں صف بستگی، نظم و ضبط اور اس کے ذکر کی جو تربیت حاصل کرے گا۔ اسے خدا کی ہمہ وقت بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت میں استعمال کرے گا۔ جب اسے طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آنا پڑے گا تو وہ اسی جذبے کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑا ہو جائے گا جس طرح نماز میں کھڑا ہوتا تھا اور اگر ایسے وقت میں وہ گوشہ نشین ہو کر تسبیحات و مناجات میں مصروف رہا تو گویا اس نے نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا مجاہد بننے کی کوئی تربیت حاصل نہیں کی۔

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اشرف ہونے کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سجدہ ریز نہ ہو اور صرف اسی کی بندگی کرے۔ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ اس کے دل میں حرص و ہوس کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ دنیوی مفادات کا لالچ دیتا ہے۔ لسانی، گروہی، خاندانی تعصبات کو ابھارتا ہے۔ اس طرح انسان بعض اوقات حق کو چھوڑ کر غیر اللہ کے سامنے جبینِ نیاز خم کر دیتا ہے۔ جب انسان ایک خدا کے دروازے کو چھوڑ کر دوسرے دروازے تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے تو ہر چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو وہ اس مقامِ شرافت سے گرا دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے

اسے شرک سے بچنے اور اپنے ہوا کسی کے آگے نہ جھکنے کا حکم دے کر عطا کیا تھا۔ نماز انسان کو اس صحیح مقام سے آگاہ کرتی اور اس کی عزّتِ نفس اور شرف کی حفاظت کرتی ہے۔ انسان اگرچہ بڑا تجربہ کار ہے۔ لیکن شیطان بھی بتوں کو نئے نئے لباسوں میں سامنے لاتا رہتا ہے اور انسان کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتا کہ وہ بت پرستی میں مبتلا ہو گیا ہے ؎

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے۔
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

نماز مسلمان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب انسان نماز سے باہر ہو تو وہ سوچتا ہے کہ ابھی چند ساعتوں کے بعد "مجھے خدا کے دربار میں حاضری دینی ہے اگر میں دو نمازوں کے درمیانی وقفے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتا رہوں گا اور غیر اللہ کی اطاعت میں معروف رہوں گا تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیا مجھے اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے شرم نہ آئے گی"۔ اگر نماز مسلمان کی فکر اور سوچ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی، نمازی ظاہری صفائی کے ساتھ ساتھ باطنی صفائی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اپنے دل و نگاہ کو مسلمان نہیں کرتا اور انہیں پوشیدہ اصنام سے پاک نہیں کرتا تو اسے نماز سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو مکمل خضوع اور خشوع کے ساتھ ادا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ ایک اور ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ نماز اس طرح پڑھو گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس طرح پڑھو گویا خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ نماز کے ذریعے انسان براہِ راست اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتا ہے

اس سے عہد کرتا ہے کہ "تو میرا واحد مالک اور معبود ہے" اس عہد کے ذریعے مومن کے دل میں کلمۂ حق بلند کرنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، وہ غیر اللہ کی خدائی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کا انکار کر کے اپنے خدا کی حاکمیت قائم کرنے کے لئے جد وجہد کرتا ہے۔ جو شخص اسے اپنے احکام کے ذریعے اپنی غلامی پر مجبور کرتا ہے وہ اس کے ساتھ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کو ہی نہیں ہر شخص کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان انسان کا غلام بن کر نہ رہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرے۔ جس طرح وہ نماز میں یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کے آگے اس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے یا خالی اس کے آگے سے گزر ہی جائے، اسی طرح وہ زندگی میں یہ برداشت نہیں کرتا کہ پورے دین پر عمل کرنے میں کوئی اس کا مزاحم ہو یا کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ فرائض کی ادائیگی میں اس کے لئے کوئی مشکل پیدا کر دے۔ وہ ہر اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لائے ہوئے نظام کے خلاف ہو۔ اگر نماز کے ذریعے یہ جذبہ پیدا نہ ہو تو نماز رسم کہن کے سوا کچھ نہیں۔

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت
ورنہ داری خونِ گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن

اگر تو بدن میں زندگی کی حرارت رکھتا ہے تو نماز میں مسلمان کی معراج ہے اور اگر تیرے بدن میں گرم خون نہیں ہے تو تیرا سجدہ پرانی رسم کے سوا کچھ نہیں۔

جس طرح حج کے موقع پر مسلمان اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری دیتا ہے، اپنے گناہوں پر شرمندگی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور وہاں سے یہ عہد کر کے لوٹتا ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچے گا اور اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ

کی اطاعت میں بسر کرے گا اس کے نفس میں خاندانی تفوّق، کثرتِ مال، حکومت یا کسی اور ذریعے سے دوسروں پر بڑائی جتانے کا جو خنّاس سمایا ہوتا ہے وہ احرام کی چادروں میں اپنے جسم کو لپیٹنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں امیر غریب، شاہ و گدا ایک سے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ تمیزِ بندہ و آقا ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نماز میں مساوات کا عظیم الشّان مظاہرہ ہوتا ہے۔ امیر، غریب، بادشاہ، فقیر، آقا و غلام سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز　　قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

نماز میں جب نمازی اللہ سے چھوٹی موٹی لغزشوں اور غلطیوں کی معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ایسی غلطیاں جو اس سے بہ تقاضائے بشریّت سرزد ہو گئی ہوں معاف کر دیتا ہے۔ اس طرح نماز مسلمان کے لئے حجِ اصغر ہے اور مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی طرح ہے جو ہر قسم کی برائیوں اور نافرمانیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان نماز پڑھنے کے باوجود برائیوں کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اسی طرح کرتا ہے جس طرح بے نماز کرتے ہیں، باطل نظامِ زندگی سے اسی طرح خوش ہے جس طرح بے نماز خوش ہیں تو پھر اسے سوچنا چاہیئے اور اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیئے کہ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ سوائے اس کے اس کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نے دل سے اپنے آپ کو پاک صاف کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ اگر وہ نماز کو برائیوں سے رُکنے کا ذریعہ بنائے تو یقیناً یہ اس کے لئے مددگار ثابت ہو گی لیکن اگر وہ ایک رسم سمجھ کر ادا کرتا رہے تو اس کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ انقلاب تو اسی وقت آتا ہے جب دل میں اس کے لئے تڑپ پیدا ہو ؎

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا　　تو بھی نمازی میں بھی نمازی !!

روزہ

دنیا میں مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کے دین پر عمل کرنا اور اسے دنیا میں غالب کرنے کی جد وجہد کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ اپنی مصروفیات کے سلسلے میں اس حد تک مبالغے سے کام لیتا ہے کہ انہیں اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے اور اصل مقصد سے غافل ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے لئے انسان کو تگ و دو بھی کرنی پڑتی ہے لیکن بعض اوقات اس میں بھی وہ اتنی زیادتی کرتا ہے کہ بس پیٹ کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری کاوشیں اسی کے لئے ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس مقصد کے لئے حلال حرام اور جائز ناجائز کی تمیز بھی ختم کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس سے انسانیت کا جوہر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، بد دیانتی کرتا ہے اور دوسرے ناجائز ذرائع سے عمدہ سے عمدہ غذاؤں کا شوق پورا کرتا ہے۔ شکم پروری کے علاوہ اسے کسی بات کا احساس نہیں ہوتا۔ فاقہ کش غریبوں کی مدد کا خیال دور کی بات ہے، موقع ملے تو ان کا بھی خون چوسنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو شخص اس طرح کی شکم پروری کو اپنی عادت بنا لیتا ہے اس کی روحانیت اس کی خواہشات میں دب کر رہ جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر اپنے نفس کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔

زندگی ایک مسلسل جہاد ہے۔ اس جہاد میں انسان پر ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب اسے کچھ وقت کے لئے پیٹ بھر کھانے کے لئے کوئی چیز دستیاب نہ ہو۔ خاص کر مسلمان کی زندگی کا تو مقصد ہی جہاد ہے۔ اسے دین کی سربلندی کے لئے بعض اوقات گھر بار اور عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ سرد گرم علاقوں میں رہنا پڑتا ہے اور اس راہ میں بھوک پیاس بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ہی روزہ فرض کیا گیا ہے۔ قمری مہینوں کے لحاظ سے روزہ کی فرضیت میں یہ حکمت ہے کہ یہ ہر موسم میں بدل بدل کر آتے ہیں اور مسلمان ہر موسم کے چھوٹے

بڑے دنوں میں بھوک پیاس برداشت کرنے کی مشق کرتا ہے۔ تاکہ اسے دنیا کے کسی خطّے میں بھی جانا پڑے تو وہاں کے موسم کے مطابق ضرورت پڑنے پر بھوک پیاس برداشت کر سکے۔ جو شخص بھوک پیاس برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ اپنی آزادی کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ زندگی کی قیمتی سے قیمتی متاع بھی بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے قربان کر دیتا ہے۔ مصافِ زندگی میں جو بھی مجاہدہ کرتا ہے وہی اپنے اصولوں پر قائم رہ کر اپنی آزادی کو برقرار رکھتا ہے اور کسی ایسے طریقے سے اپنی شکم پروری کا سامان نہیں کرتا جس سے اس کی عزّت و آبرو پر حرف آئے۔

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ برتن روزہ دار کا بھرا ہوا پیٹ ہے۔ یہ بھرا ہوا پیٹ حرام کمائی کی وجہ ہی سے ناپسندیدہ نہیں بلکہ حلال کمائی سے اتنا کھا لینا کہ سانس لینا ہی دشوار ہو جائے اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حرام کمائی سے بھرا ہوا پیٹ اللہ تعالیٰ کو کس قدر ناپسند ہوگا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے گھروں سے نکلے۔ کئی کئی دن فاقوں سے گزرتے لیکن وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ کثرت سے نفلی روزے رکھتے تھے۔ اللہ کی راہ میں فاقوں کی نوبت آجاتی تو بڑی خوشی سے برداشت کر لیتے۔

دنیا میں جتنی نعمتیں ہیں سب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ انہیں حلال طریقے سے حاصل کر کے اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا گناہ نہیں۔ لیکن ان حلال چیزوں کے استعمال میں بھی اسراف سے کام لینا جائز نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ.

کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔

اسراف کی یہ ممانعت ہر طرح کے اسراف کے لئے ہے جس میں ضرورت سے زیادہ کھا لینا بھی شامل ہے ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا پیٹ کے تین حصّے کرو ۔ ایک کھانے کے لئے ، ایک پینے کے لئے اور ایک ہوا کے لئے ۔ آپ کا ایک اور ارشاد ہے کہ "روزہ ڈھال ہے" ۔ بھوک پیاس کی شدّت برداشت کرنے کے لئے بھی ڈھال کا کام دیتا ہے ۔ گناہوں سے بچنے کے لئے بھی ڈھال ہے ۔ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کے خلاف بھی ڈھال ہوگا ۔ الغرض روزہ مسلمان کی کھانے پینے کی عادات میں اعتدال پیدا کرتا ہے ۔ اسے بوقت ضرورت بھوک پیاس برداشت کرنے کا عادی بناتا ہے اور تن پروری کی خواہشات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے ۔

روزہ بَر جُوع و عَطَش شبخوں زند
خیبرِ تَن پَروری را بشکند !!

— روزہ بھوک اور پیاس سے شب خون مارتا ہے اور تن پروری کے قلعے کو توڑتا ہے —

○

حج

انسان فطری طور پر اظہارِ عبودیت کے لئے ایک محسوس دروازہ چاہتا ہے جہاں وہ اپنے مالک سے قریب تر ہو کر اپنی حاجات پیش کر سکے ۔ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی مانگ سکے اور آئندہ کے لئے اس سے مکمل وفاداری کا عہد کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر سکے ۔ حج مسلمان کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس خاص گھر کی زیارت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں

کے مرکز کے طور پر اپنے بندے ابراہیم خلیل اللہؑ سے تعمیر کرایا تھا۔ حج کے ذریعے مسلمان کو وہ مقامات دیکھنے کا موقع ملتا ہے جہاں قرآن پاک نازل ہوا۔ جہاں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بسر کی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی۔ اس طرح مسلمان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ان مقامات کی زیارت سے جن سے اسے دلی لگاؤ ہوتا ہے، اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

حج ایک جامع عبادت ہے۔ اس میں مسلمان ہجرت بھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں محنت و مشقت اٹھانے اور اس کی راہ میں مال خرچ کرنے کی مشق بھی کرتا ہے۔ اس سے انسان کی طبیعت سے بخل دور ہوتا ہے۔ اس میں عالی ظرفی اور فیاضی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ حج کے موقع پر شرک کی آلودگی سے پاک ہو کر انسان خالصتہً اللہ پاک کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس موقع پر مساوات کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ ہوتا ہے کہ کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ رنگ، نسل اور نسب کے سب امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ شاہ و گدا، امیر و غریب سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ کسی کو دوسروں پر تفوّق اور برتری حاصل نہیں ہوتی۔ تمام انسان دو چادریں زیبِ تن کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ نہ رنگا رنگ پوشاکیں ہوتی ہیں نہ زرق برق لباس۔ سب کے سب ایک ہی حال میں ہوتے ہیں۔

حج کے موقع پر تمام مسلمان اپنے وطن اور اعزّہ و اقربا کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اس بات کی مشق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر جب بھی انہیں وطن اور عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑے گا وہ اسی طرح چھوڑ دیں گے جس طرح انہوں نے حج کے موقع پر چھوڑا ہے اور ان کی محبت ان کے راستے میں حائل نہیں ہوگی۔ جب انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بلایا جائے گا تو وہ اسی طرح لبیک لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جائیں گے جس طرح حج کے موقع پر حاضر ہوئے ہیں۔ اللہ کے دین کے لئے جب بھی ان کے مال

کی ضرورت ہوگی وہ اسی طرح خرچ کریں گے جس طرح انہوں نے حج پر کیا ہے ۔ حج کے سفر میں انہوں نے جو صعوبتیں برداشت کی ہیں، اللہ کی راہ میں پھر بھی ایسی ہی مشقتیں اٹھانے کے لئے تیار رہیں گے۔ جس طرح حج کے موقع پر فتنہ و فساد اور دوسرے گناہوں سے مجتنب رہے اسی طرح باقیماندہ زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں بسر کریں گے ۔ حج کے بعد جس طرح انہوں نے قربانی کے جانور کا نذرانہ پیش کیا اسی طرح ضرورت پڑی تو وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے ۔ شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہیں تو گویا اس بات کی مشق کرتے ہیں کہ طاغوتی طاقتوں پر اسی طرح پتھر برسائیں گے جس طرح شیطان پر برسا رہے ہیں ۔

حج کے موقع پر دنیا بھر کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ۔ اس سے اسلام کے عظیم الشان جشن کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ۔ کافروں پر اس سے ہیبت طاری ہوتی ہے ۔ مسلمانوں کا یہ عظیم الشان اجتماع ان کے اتحاد کی راہیں کھولتا ہے ۔ ایک دوسرے سے مل کر وہ باہمی امور طے کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ اس طرح حج ایک کثیر المقاصد عبادت ہے جو مومن کو اس عظیم نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے تربیت بہم پہنچاتی ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے ۔

مومناں را فطرت افروز است حج

ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حج مومنوں کی فطرت کو جلا بخشنے والا ہے ۔ یہ وطن سے ہجرت کا درس دینے والا اور وطن کی محبت کے جذبے کو ختم کرنے والا ہے ۔

○

زکوٰۃ

انسان کی روحانی بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری حُبِّ مال ہے ۔ انسان زیادہ سے

زیادہ مال کمانے اور دوسروں پر اپنی امارت جتانے کے لئے بہت کچھ کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس بہت زیادہ دولت ہو تاکہ وہ آرام و آسائش سے زندگی بسر کر سکے۔ انسان کی کثرتِ مال کی خواہش کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

تمہیں کثرتِ مال کی خواہش نے ہلاک کر دیا حتّٰی کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن اس کی حرص اور زندہ رہنے کی خواہش جوان رہتی ہے۔ کثرتِ مال کی اس خواہش سے انسان کی طبیعت میں بخل آجاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس نے مال خرچ کیا تو اس میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس طرح وہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں بھی غفلت برتنے لگتا ہے۔

زکوٰۃ حبِّ دولت کو کم کرتی ہے۔ اس سے غریبی اور امیری کے فرق کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ دولت کا ارتکاز کم ہوتا ہے۔ امیروں اور غریبوں میں باہمی محبّت اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی محبّت سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔

حضرت ابو طلحہؓ نے یہ آیت سنی تو عرض کی یا رسول اللہ! میں اپنا کھجوروں کا باغ اللہ کے لئے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ اسے جہاں چاہے خرچ کیجئے۔ مجھے یہ باغ بہت پسند ہے اور اللہ کا حکم ہے کہ تم نیکی کرنا چاہتے ہو تو اپنی محبوب چیز خرچ کرو اس لئے میں یہ راہِ خدا میں دیتا ہوں۔

جنگِ تبوک کے موقع پر جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جہاد کی تیاری کے لئے اللہ کی راہ میں مال دینے کا حکم دیا تو ابو بکر صدّیقؓ نے گھر کا سارا سامان حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب آپ نے پوچھا، صدیق! گھر کیا چھوڑ آئے ہو تو انہوں نے عرض کی "اللہ اور اللہ کے رسولؐ

کی محبّت چھوڑ آیا ہوں!"

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدّیق کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

زکواۃ سے مال پاک ہو جاتا ہے۔ مال کی محبّت کم ہوتی ہے اور مال بڑھتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے۔ شیطان انسان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس طرح مال کم ہو جائے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچّا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے مال زیادہ ہوتا ہے اور اس کی محبّت کم ہوتی ہے اور انسان کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔

مال بذاتِ خود ناپسندیدہ چیز نہیں۔ اگر انسان حلال طریقے سے مال کمائے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ غریبوں، مسکینوں کے حقوق ادا کرے، اسے جمع کر کے نہ رکھے بلکہ گردش میں لائے اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے دل کھول کر خرچ کرے تو یہی مال اس کے لئے نعمت بن جاتا ہے۔ نعمت بھی ایسی کہ وہ دوسروں کے لئے قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ دو آدمیوں کے سوا کسی پر رشک جائز نہیں ایک وہ جسے قرآن کا علم عطا ہوا ہو اور وہ دن رات اس کی تلاوت کرتا ہو اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتا ہو۔ صحابۂ کرامؓ میں سے بعض صحابہؓ بڑے دولت مند تھے لیکن ان کی دولت ہمیشہ راہِ خدا میں کام آئی اور اسلام کی سربلندی کے لئے خرچ ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا پاکیزہ مال نعمت ہے۔ مال پاکیزہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں سے اللہ کے احکام کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور اس سلسلے میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول
نِعمَ مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ
گر نہ داری اندریں حکمت نظر
تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر

اگر تو مال کو دین کے لئے رکھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، پاکیزہ مال اچھا ہے۔ اگر تو اس حکمت پر نظر نہ رکھے تو تو غلام ہے اور مال تیرا آقا ہے۔

ارکانِ اسلام میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں اور یہ مسلمان کے کردار کو ہر لحاظ سے پختہ کر کے اس میں قوّت پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نام "قوِیٌّ" بھی ہے جس کے معنی قوّت والا کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ارکان کے ذریعے اپنے ماننے والوں میں بھی قوّت پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ پوری دنیا پر اس کی خلافت کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہو سکیں۔

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز
قلبِ مسلم را حج اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است!
قاتلِ فحشاء و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند
خیبرِ تن پروری را بشکند!
مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے: سرمایۂ جمعیّتے
ربطِ اوراقِ کتاب ملّتے!!
حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حبِّ تُنفِقُوا محکم کند
زر فزاید الفتِ زر کم کند
ایں ہمہ اسباب استحکام تست
پختہ و محکم اگر اسلام تست

اہلِ قوّت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ سیپ ہے اور اس سیپ کا موتی نماز ہے۔ مسلمان کے لئے نماز حجِ اصغر ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں یہ خنجر کی مانند ہے اور وہ اِس خنجر کے ذریعے بے حیائی کے کاموں، نافرمانیوں اور برائیوں کو ختم کرتا ہے۔ روزہ بھوک اور پیاس پر شبخون مارتا ہے اور شکم پروری کی خواہشات کے قلعے کو توڑتا ہے۔ حج مومنوں کی فطرت کو جلا بخشنے والا ہے۔ یہ ہمیں وطن سے ہجرت کرنے اور وطن سے محبت ختم کرنے کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جو ملّت کے اتحاد کا وسیلہ ہے۔ اس کی کتاب کے اوراق کو مربوط رکھنے کا ذریعہ ہے ــــ زکوٰۃ دولت کی محبت کو فنا کرتی ہے اور مساوات سے بھی آشنا کرتی ہے۔ دل کو فرمانِ خداوندی "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اللہ کی راہ میں محبوب شے خرچ نہ کرو" سے مضبوط کرتی ہے اس سے مال بڑھتا ہے اور مال کی محبت کم ہوتی ہے۔ اگر تیرا اسلام پختہ اور مضبوط ہے تو یہ تیرے استحکام کے اسباب ہیں۔ یا قوِیّ کے ورد سے قوّت والا بن تاکہ تو نفس پر غلبہ حاصل کرے (اور نیابتِ الٰہی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔)

چوتھا باب

دین اور قوّت

علاّمہ اقبال کی نظر میں ارکانِ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح محض رسمی عبادات نہیں بلکہ مسلمان کو ایک بہت بڑے مقصد کے لئے تیار کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔ جس طرح فوج کو جنگ کی تربیت دینے کے لئے ہر فوجی کو مختلف قسم کے قواعد و ضوابط سکھائے جاتے ہیں، جسمانی ورزشیں کرائی جاتی ہیں، مختلف قسم کی مشقتوں کا عادی بنایا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت کے وقت بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تربیت کے لئے یہ پانچ رکن مقرر کئے ہیں تاکہ وہ سیرت و کردار، اخلاق و اعمال، دیانت و امانت، جرات و ہمّت، سخاوت و فیاضی، عدل و انصاف، صدق و صفائی اور دوسری اخلاقی صفات سے متّصف ہو کر اپنے اندر قوّت پیدا کریں اور پھر دنیا میں نیابتِ الٰہی کا فریضہ سرانجام دیں۔ مسلمان دنیا میں مغلوب اور غیر اللہ کا غلام بن کر زندہ رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ غالب اور اللہ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرنے کے لئے آیا ہے۔

اسلام ایک عالم گیر دین ہے۔ یہ کسی خاص قوم، ملک یا خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے تاقیامت ضابطۂ حیات ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ حالات نامساعد ہیں، اللہ کا دین غالب نہیں ہے تو ان حالات کو بدلنے کی کوشش کرے۔ سب سے پہلے اپنے ملک میں اللہ کے احکام کو اس طرح نافذ کرے کہ مسلمانوں کی زندگی کا ہر پہلو ——

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً

اے ایمان والو اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ !

کی تفسیر نظر آنے لگے ۔ طاغوتی طاقتیں سرنگوں ہو جائیں اور اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے ـــــــ !!
قرآن پاک کے ایک ایک حکم پر ایسے عمل ہونے لگے جیسے خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ہوتا تھا۔ کوئی قانون ایسا نہ رہے جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو۔ حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جن کا علمِ دین اور تقویٰ مسلّمہ ہو۔ وہ اسلام کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور خود اس پر صدقِ دل سے عمل پیرا ہوں۔ غیر اسلامی نظامِ زندگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے ، اور اسلامی نظامِ زندگی سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے ۔ کافروں کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں اس لئے ان کے لئے یہی دنیا جنّت ہے لیکن مسلمانوں کے لئے اصل زندگی آخرت ہے ۔ اس لئے دنیا میں ان کی بقا اور استحکام کا راز اسلامی نظامِ زندگی میں مضمر ہے ۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے ملک میں مکمل اسلامی نظام قائم کرنے کے بعد " قُلْ ھُوَ اللّٰہ " کا عَلَم لے کر اٹھے اور دنیا سے فسق و فجور، ظلم و جور اور بغاوت و سرکشی کو دور کرنے کا بیڑہ اٹھائے ۔ اور پوری دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرے۔ انسانی دکھوں کا علاج لادینیت، پاپائیت یا کسی اور غیر اسلامی نظام میں نہیں بلکہ خالص اسلامی نظام اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے میں مضمر ہے ۔ اسی نظام کے تحت ضعیفوں اور کمزوروں کو ان کے حقوق میسّر آتے ہیں اور وہ پستیوں سے نکل کر بلند مقامات تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر دین کے احکام نافذ کرنے کے لئے حکومت کی قوّت موجود نہ ہو تو نہ تو دین کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تمام برکات ظاہر ہو سکتی ہیں ؎

لادینی و لاطینی کس پیچ میں اُلجھا تُو
دارو ہے ضعیفوں کا لَاغَالِبَ اِلَّاھُو

اسلام کے خلاف دنیا میں جو تہذیب رواج پا جائے ایک سچا مومن اسے کبھی اختیار نہیں کرتا ۔ وہ اس معاملے میں زمانے کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اسلامی تہذیب و معاشرت کو برقرار رکھنے

کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آبا و اجداد کی غلط رسوم کا بھی اپنے آپ کو پابند نہیں کرتا بلکہ انہیں بدل کر نئی تعمیر کا آغاز کرتا ہے۔ اگر زمانہ غلط سمت جا رہا ہو تو وہ اس کے ساتھ نہیں چلتا بلکہ اسے اپنے ساتھ چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسے زمانہ کو راہ راست پر لانے کے لئے جنگ بھی کرنی پڑے تو اس سے گریز نہیں کرتا ؎

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز !

یہ بے خبر لوگوں کی بات ہے کہ تو زمانے کے ساتھ موافقت کر۔ زمانہ اگر تیرے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تو زمانے کے ساتھ جنگ کر۔

دنیا میں بھیڑ چال چلنا کوئی مردانگی نہیں ہے جس طرف لوگ چلے جا رہے ہوں اس طرف چلنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن مخالفت سمت چلنے کے لئے اپنا راستہ خود بنانا پڑتا ہے۔ مومن کی ایک متعین منزل ہے وہ ہمیشہ اسی کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اگر زمانہ اس کی مخالف سمت میں چل رہا ہو تو وہ اپنی منزل کو فراموش کر کے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسلام کے اصول اٹل اور ابدی ہیں۔ مسلمان ہمیشہ ان پر عمل پیرا رہ کر انہیں سربلند رکھتا ہے۔ شیطان ان اصولوں کی سربلندی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے وہ ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔ وہ ان کو حرص و ہوس، خود غرضی، بد دیانتی اور مفاد پرستی میں مبتلا کر کے فتنہ و فساد کی راہیں کھولتا ہے۔ بظاہر ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ شاید اس قسم کی فریب کاریوں کے بغیر کامیاب زندگی ممکن نہیں۔ اس لئے کمزور ایمان کے لوگ اس قسم کے حالات سے مصالحت کر لیتے ہیں اور ہوا کے رُخ چلنے لگتے ہیں لیکن سچا اور پختہ ایمان رکھنے والا مسلمان اس قسم کے حالات سے دوچار ہو تو وہ مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے باطل نظامِ زندگی سے جنگ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ غلط نظامِ زندگی سے مصالحت کی بجائے تصادم کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ باطل نظامِ زندگی کی بنیادیں اکھاڑ کر نئے سرے سے نظامِ حق قائم کرتا ہے۔ وہ اپنی قوت سے حالات کا رُخ بدل دیتا ہے۔ وہ جب تک

زندہ رہتا ہے مَردوں کی طرح زندگی گزارتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ایک مومن کا کردار رکھتے ہوئے زندگی گزارنا مشکل ہے تو وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور مَردوں کی طرح جان دے کر حیاتِ جاودانی حاصل کر لیتا ہے ؎

با جہانِ نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن
مَردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ او بسازد روزگار!
گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیبِ نَو ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

ناموافق جہان کے ساتھ موافقت کرنا میدان میں ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے جو آدمی خوددار اور پختہ کار ہوتا ہے زمانہ اس کے مزاج کے ساتھ موافقت کرتا ہے۔ اگر زمانہ اس کے مزاج سے موافقت نہ کرے تو وہ زمانے سے جنگ شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس دنیا کی بنیاد کو اکھاڑ دیتا ہے اور ذرّات کو ایک نئی ترکیب دیتا ہے۔ وہ زمانے کی گردش اور نیلے رنگ کے

آسمان کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ وہ اپنی طاقت سے نیا زمانہ وجود میں لاتا ہے جو اس کے موافق ہوتا ہے۔ اگر تو دنیا میں مُردوں کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا تو مردوں کی طرح جان دینا ہی زندگی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قوّت حاصل کر کے ایک نظام کو درہم برہم کر کے کسی دوسرے نظام کی بنیاد رکھنا ہی مسلمان کا مقصود ہے تو یہ کام پہلے بھی بہت سی اقوام اور افراد سرانجام دے چکے ہیں جنہیں آج حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ظلم و بربریت کی مثال دینے کے لئے ان کا نام لے دینا ہی کافی ہے تو آخر مسلمان قوم میں ایسی کیا خوبی ہے کہ وہ انقلاب کو اپنا نصب العین قرار دیکر پرانے نظام کو درہم برہم کر کے نیا نظام رائج کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے قوّت حاصل کر کے ملکوں پر یلغار کی اور تاریخ میں اپنا نام حکمرانوں کی فہرست میں درج کرایا لیکن ان کے سامنے سوائے ملک گیری اور لوٹ مار کے کوئی اور مقصد نہ تھا۔ وہ جہاں بھی گئے انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ انسانی لاشوں کی بنیادوں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کئے۔ ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچّوں کو یتیم کرنے کے بعد اپنی ہوسِ اقتدار کو پورا کیا۔ حرص و ہوس کے ان بندوں کی خون آشام تلواریں جب بھی بے نیام ہوئیں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ شہروں کے شہر ویران اور تباہ ہو گئے۔ لوگ ان کے زیرِ اقتدار خوف و ہراس کی فضا میں زندگی بسر کرتے رہے۔ کسی کی عزّت، جان اور مال محفوظ نہ رہا۔ کسی مظلوم کی کہیں فریاد رسی نہ ہوتی تھی۔ ایک مہذّب انسان آج بھی ان کے واقعات پڑھتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ظلم و بربریت کے ان واقعات کو دہراتے ہوئے شاید شیطان بھی شرم محسوس کرتا ہو۔ اسکندر کی ہوسِ ملک گیری اور چنگیز کی بربریت سے تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔ قوّت کا نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے سامنے علم و ہنر اور تہذیب و شرافت بھی بے بس نظر آتے ہیں۔ دنیا میں جن لوگوں نے اپنی آمریت کا ڈنکا بجایا وہ سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے باغی اور سرکش انسان تھے۔ وہ اپنے آپ کو کسی ضابطے کا پابند نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے

ہاتھوں میں اقتدار کی قوت عوام کے لئے مہلک ثابت ہوئی لیکن یہی قوت دیندار اور خدا ترس آدمیوں کے ہاتھوں میں ہو تو انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا بن جاتی ہے۔ مسلمان کا معاملہ ایک لادین صاحبِ قوت سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ تصوّر کرتا ہے۔ وہ اپنا حکم نہیں چلاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے دین کا پابند ہوتا ہے جو فطری دین ہے۔ جسے خالقِ حقیقی نے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے نبی آخر الزماں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی معرفت بھیجا ہے۔ یہ دنیا کے لئے امن و آشتی کا پیغام ہے۔ اس دین کا پیروکار مالِ غنیمت یا کشور کشائی کے لئے حملہ نہیں کرتا۔ اس کا مقصد ظلم و جور، فتنہ و فساد اور ناانصافیوں کو ختم کر کے امن اور انصاف قائم کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمان حکمران جب بھی کسی ملک پر فوج کشی کرتے سپہ سالاروں کو یہ خصوصی ہدایت ہوتی تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کریں۔ جو لوگ ان کے مزاحم نہ ہوں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ پھل دار درختوں کو نہ کاٹیں، نہ فصلوں کا نقصان کریں اور اسی قسم کی دوسری ہدایات دے کر روانہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہوئے۔ انہوں نے عدل و انصاف کی ایسی شاندار مثالیں قائم کیں کہ تاریخ آج تک ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ جہاں بھی گئے عورتوں کی عزّت و عصمت کے محافظ، یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کا سہارا ثابت ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ عہد کی پابندی کی۔ لوگوں نے ان کے عدل و انصاف کی وجہ سے انہیں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے دنیا کو جہانگیری اور جہانبانی کے اصولوں کی تعلیم دی، تہذیب و شرافت سے آشنا کیا۔ انسانوں پر سے انسانوں کی حکمرانی ختم کر کے خدائے واحد کی حکمرانی قائم کی اور اس طرح بنی آدم کے وقار کو بحال کیا۔ محمد بن قاسم نے جب سندھ میں حکومت قائم کی تو ہندوؤں نے اس کے عدل و انصاف کو دیکھ کر اسے دیوتا خیال کیا۔ مسلمان جہاں بھی گئے حرّیت و مساوات اور امن و آشتی کے پیغامبر ثابت ہوئے۔ انہوں نے رعایا کو وہاں کے ظالم حکمرانوں سے نجات دلائی۔ کمزوروں کو طاقتوروں سے ان کے حقوق دلائے اور اس دنیا کو امن کا گہوارہ بنا دیا۔ تاریخ

کے اوراق ان مقدّس ہستیوں کے حالاتِ زندگی سے آج بھی تابندہ ہیں۔ اسلامی نظام جسے دوسرے نظاموں کی جگہ لانا مقصود ہے کوئی نیا نظام نہیں۔ یہ قرونِ اولیٰ میں آزمایا جا چکا ہے۔ انسانی دکھوں کا مداوا صرف اس بابرکت نظام ہی سے ممکن ہے۔ اس لئے مسلمان کا یہ حق اور فرض ہے کہ وہ اس نظام کو لے کر اٹھے اور اسے دنیا میں برپا کر کے غلط نظام ہائے زندگی میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزاد کرائے اور وہاں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کر کے امن و آشتی، عدل و انصاف اور حرّیت و مساوات کے چراغ روشن کرے۔ قوتِ اقتدار لادین ہاتھوں میں ہو تو زہرِ قاتل ہے اور اگر دین کے تابع ہو تو یہی قوّت ہر زہر کے لئے تریاق ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!
تاریخِ امم کا یہ پیغامِ ازلی ہے!
صاحب نظراں نشۂ قوّت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک!!
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

پانچواں باب

مردِ مومن کی صفات

خودی

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے : مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا ۔ اقبال نے اس خود شناسی کو "خودی" سے تعبیر کیا ہے ۔ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور بہت بڑی ہستی کا بندہ ہونا بھی معمولی بات نہیں ۔ جو شخص اس بات کو سمجھ لیتا ہے اس کے سامنے زندگی کی حقیقتیں بے نقاب ہو جاتی ہیں ۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو عناصر پر حکمران سمجھتا ہے ۔ ان کا محکوم خیال نہیں کرتا ۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ جہان اس کے لئے وہ اس جہان کے لئے نہیں ۔ اس کا کام دنیا کی طاقتوں کو مسخّر کرنا ہے ان کے آگے جھکنا نہیں ہے وہ خدا کا تابع فرمان ہے اور دنیا کی تمام طاقتیں اس کی تابع فرمان ہیں ۔ اسی کا نام توحید ہے اگر کوئی شخص اپنے کسی ہم جنس یا کائنات کی کسی دوسری چیز کے آگے جھکتا ہے، کسی چیز کو معبود خیال کرتا ہے یا کسی کو خدائی صفات کا حامل گردانتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اصل مقام سے گرا لیتا ہے ۔ اس نے نہ توحید کی رمز کو سمجھا اور نہ خودی کو ۔ الغرض عرفانِ ذات ، خود آگاہی، ایمان و یقین کی گہرائی، جرأت و شجاعت، عزم و استقلال، ذوقِ تسخیر اور کائنات کو مسخّر کر کے توحید کا راز آشکارا کرنے والی قوّت کا نام خودی ہے ۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا!

خودی کا اصل جوہر توحید ہے۔ تمام دنیا سے کٹ کر صرف ایک خدا کا ہو کر رہ جانا، اسی کو اپنا مالک، فرمانروا، حاکم اور معبود سمجھنا اور اس کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنے کا نام خودی ہے۔ جتنا کوئی شخص عقیدۂ توحید میں راسخ ہوگا اتنا ہی وہ مضبوط اور باہمّت ہوگا۔ اس کا توکّل صرف خدا کی ذات پر ہوگا۔ وہ غیر اللہ سے بے نیاز اور بے خوف ہو کر زندگی بسر کرے گا۔ خودی تلوار کی مانند ہے جو اللہ کے سوا تمام معبودوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اس تلوار کی فساں لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اسی کے ذریعے خودی کا جوہر آشکارا ہوتا ہے۔ خودی کی حقیقتیں خدا پر کامل ایمان اور یقین سے ظاہر ہوتی ہیں۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

جو شخص خودی کی حقیقت کو پالیتا ہے دنیا کی تمام قوّتیں اس کے سامنے مسخّر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خودی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مستحکم ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے کمزور ہوتی ہے۔ جب کوئی بندہ خالص اللہ کا ہو کر رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا بن جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے اس لئے کائنات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار بندے کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا کی چیزوں کی خاطر اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو اپنا مقصد نہیں سمجھتا بلکہ مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ وہ جس طرف جاتا ہے تلوار کی طرح باطل کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ جو شخص دنیا کا غلام بن جاتا ہے اسے اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں ہوتی جو خود دار ہوتا ہے اور دنیا کی تمام چیزوں کو اپنے ماتحت سمجھتا ہے۔

جس بندۂ حق کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق!

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

جو شخص اپنے مقام اور مرتبے کو نہیں پہچانتا وہ بادشاہ ہو کر بھی فقیر ہوتا ہے اور جو شخص اپنے مقام اور مرتبے کو پہچان لیتا ہے وہ فقیر ہو کر بھی شہنشاہی کرتا ہے۔ سلجوقی بادشاہوں، سنجر اور طغرل نے بڑے طنطنے سے حکومت کی وہ اپنے ہم عصر بادشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ بادشاہ بھی تھے اور سپاہی بھی۔ انہوں نے اپنے وقت کی بڑی بڑی فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ ان کی ہیبت سے بڑے بڑے سلاطین کانپتے تھے۔ ان خوددار بادشاہوں نے مسلمانوں کی عظمت اور شوکت کو بحال کیا۔ یہ خود خراج نہیں دیتے تھے بلکہ بادشاہوں سے خراج وصول کرتے تھے۔ شروع میں نہ تو کسی بڑی سلطنت کے مالک تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی بڑی فوج تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کے صحیح ادراک سے نوازا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کے سینے میں بیدار دل دھڑکتا تھا۔ ان کی نگاہ مردِ مجاہد کی نگاہ تھی۔ بڑے حوصلے اور جرأت کے مالک تھے۔ تاریخ میں انہیں عظیم الشان مسلمان بادشاہوں کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص خودی کا اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لئے ناممکنات بھی ممکنات میں تبدیل ہو جاتی ہیں نہ اس کے سامنے دریا رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں اور نہ پہاڑ ہی اس کے راستے کا پتھر بنتے ہیں۔ دریا اس کے سامنے پایاب اور پہاڑ ریشم بن جاتے ہیں۔ وہ فقیر ہوتے ہوئے بھی ان بادشاہوں کی سی شوکت کا مالک ہوتا ہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر!

جس قوم کے جوانوں میں خودی کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے، وہ اسباب و وسائل کی کمی کا شکوہ نہیں کرتے۔ انہیں جو کچھ میسّر ہوتا ہے اسی سے کام لیتے ہیں۔ ان کی اخلاقی قوّت ان کے اسباب کی کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ وہ ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں چاند ستارے بھی ہیچ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چاند ستارے تو ایک خاص راستے پر چلنے میں مجبور ہیں، وہ نہ اپنی مرضی سے راستہ بدل سکتے ہیں نہ اپنی حرکت سے رک سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے انسان غفلت اور آرام طلبی کو بھی اپنا سکتا ہے اور ہر وقت متحرّک، فعّال اور منزل کی طرف رواں دواں رہ کر بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس لئے جو شخص آرام طلبی کی زندگی پر قادر ہونے کے باوجود جدوجہد میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے اندر اتنی جان اور قوّت پیدا کرتا ہے کہ اسے کبھی اضمحلال کا خطرہ نہ رہے، وہ واقعی بڑا آدمی ہے اور چاند ستارے اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جس قوم کے جوانوں میں خودی کی یہ صفات پیدا ہو جائیں وہ قوم مادی وسائل کے بغیر بھی کامیاب زندگی بسر کرتی ہے ؎

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پروین ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد —!
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد

خودی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان دنیا کی رنگینیوں میں الجھنے کی بجائے اس کائنات کو مسخّر کرے۔ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ اسے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ دنیا پر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کرنا اس کا کام ہے۔ اس دنیا کی تمام چیزیں اسی لئے پیدا کی گئی ہیں کہ فریضۂ نیابتِ الٰہی

کی انجام دہی میں مددگار ثابت ہوں۔ یہ بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ جس طرح سمندر ساحل سے ملحق رہتا ہے لیکن اپنے وجود کو ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔ کبھی مکمل طور پر خشکی میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح مردِ مومن دنیا میں رہتے ہوئے اپنے وجود کو دنیا میں گم نہیں کر دیتا بلکہ اپنے تشخص کو ہر صورت میں قائم رکھتا ہے۔ سمندر کا جتنا تعلق ساحل یا اس کے قریب کی جھاگ سے ہوتا ہے، مومن کا اتنا ہی تعلق دنیا سے ہوتا ہے۔ وہ خود سمندر رہے اور دنیا کا تمام مال و متاع اس کی جھاگ ہے۔ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے تعلق بڑھاتا جاتا ہے، اور دنیا سے تعلق کو کم کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ دنیا کا سارا مال و متاع اسے متاعِ حقیر نظر آنے لگتا ہے اور اس کا مقصد اسے بلند دکھائی دینے لگتا ہے ؎

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
بزنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

مسلمان اپنی عزت و آبرو کو خودی کے ذریعے برقرار رکھتا ہے۔ جو لوگ خودی کا مقام پہچان لیتے ہیں وہ دنیا میں بادشاہی کرتے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے نیازی ہی اصل بادشاہی ہے اور اس مقام تک وہی پہنچتا ہے جو خودی کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔ جو شخص دنیا حاصل کرنے کی خاطر کسی صاحبِ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور جائز و ناجائز امور میں اس سے تعاون کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اپنے اصل مرتبے سے گرا لیتا ہے اور ذلت و نکبت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ خوددار آدمی نیکی اور بھلائی کے کاموں میں دوسروں کا ساتھ دیتا ہے اور برائی اور ناجائز کاموں میں کسی سے تعاون نہیں کرتا ؎

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

جو شخص خودی کا مفہوم سمجھ لیتا ہے وہ اس دنیا کو اپنا مقصد نہیں بناتا۔ یہ دنیا تو فانی ہے۔ حیاتِ جاودانی کسی اور مقصد کو سینے سے لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ مقصد اتنا بلند ہے کہ زمین و آسمان اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مسلمان کا مقصد رضائے الٰہی ہوتا ہے اس کی ساری زندگی اسی مقصد کے حصول میں گزرتی ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ دین پر خود عمل کرنا اور پھر دنیا میں اسے غالب کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ اس دنیا کی تزئین و آرائش اس کا مقصد نہیں بلکہ یہ ایک ایسی قدر ہے جو اصل مقصد کو حاصل کرنے سے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے تو یہ سحر و شام اور یہ کائنات خود بخود مومن کی مرضی کے مطابق سنور جاتے ہیں۔ اس مقصد کو روح کی غذا بنا لینا خودی ہے اور یہی زندگی کا راز ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو خودی کے مطلوبہ معیار کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو اسے حیاتِ جاودانی حاصل ہو جاتی ہے ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

دنیا کا حسن و جمال انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور دلکش نغمے اس کے کانوں سے ٹکرا کر اسے اصل مقصد سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی خورد و نوش کے تقاضے اسے اصل مقصد سے غافل کر دیتے ہیں اور کبھی عیش و آرام کے سامان اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن مردِ مومن کی نگاہ ہمیشہ اپنے اصل مقصد پر رہتی ہے۔ وہ دنیا کی فانی چیزوں کی بجائے لافانی ذات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ مومن کے رہنے کی جگہ یہ دنیا نہیں بلکہ

اصل مقام تک پہنچنے کے لئے پہلی منزل ہے ۔ مومن اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے ایک مسافر کی طرح گزرتا ہے اور جو مسافر راستے کی رنگینیوں میں کھو کر اپنی اصل منزل کو بھول جائے وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ عقل مند مسافر وہی ہوتا ہے جو راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ، جو بلند عزم و ہمّت لے کر اٹھتا ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے طوفان بھی تھم جاتے ہیں اور سر فلک پہاڑوں کی چوٹیاں بھی اسے زمین سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی رکاوٹ کی پروا کئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ۔

یہ عالَم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالَم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالَم یہ بتخانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خور و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اوّلیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی زندگی کا راز ہے ۔ اس کی حفاظت زندگی کی حفاظت ہے ۔ جن چیزوں سے خودی میں زوال پیدا ہو مردِ مومن ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہتا ہے اور ہر آن خودی کی حفاظت کرتا ہے ۔ بادشاہوں اور امرار کے خود ساختہ نظام زندگی میں حکومت کا کل پرزہ بن کر زندگی گزارنے اور دوسروں کی غلامی میں خودی پر زد پڑتی ہے ۔ اسی لئے قرونِ اولیٰ

کے مسلمانوں میں سے کئی بزرگوں نے بادشاہوں کے ہاں بڑے بڑے منصب اور عہدے قبول کرنے سے گریز کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنے اس خود دارانہ رویّے کی بنا پہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرلیں لیکن کوئی عہدہ قبول کرنا پسند نہ کیا۔ ایک مردِ درویش کے متعلق مشہور ہے کہ بادشاہ نے انہیں دربار میں طلب کیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ " مجھے تو بادشاہ سے کوئی کام نہیں اگر بادشاہ کو کوئی کام ہے تو وہ خود میرے پاس چلا آئے۔" یہی درویش اپنی مرضی سے بوریا نشینوں کے پاس جاکر بیٹھتے۔ مسکینوں کی خبرگیری کرتے لیکن بادشاہ کے دربار میں حاضری نہ دیتے۔ آج لوگ سرداروں، جاگیرداروں اور معمولی عہدہ داروں سے دوستی اپنے لئے باعثِ فخر اور باعثِ عزّت سمجھتے ہیں۔ ان کی خوشامد کرتے ہیں اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ حالانکہ ساری عزّت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اسی سے عزّت کی تمنّا کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اپنی خودی کو پہچان لیتے ہیں وہ اپنی ذات میں بادشاہ بن جاتے ہیں۔ وہ ایسے بادشاہوں پر تین حرف بھیجتے ہیں جو انہیں کسی منصب، عہدے یا دوسرے لالچ کے ذریعے خریدنا چاہتے ہیں۔ خودی کا حامل انسان فاقے برداشت کرلیتا ہے لیکن ایسی روٹی قبول نہیں کرتا جو اس کی زبان پر مہر لگادے، جو اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے، جو اس کے کانوں کو سماعت سے محروم کردے اور وہ سب کچھ دیکھتے سنتے ہوئے بھی محض روٹی یا چند سکّوں کی خاطر حق گوئی کا فریضہ سرانجام نہ دے سکے۔ خودی کے نگہبان کے لئے ایسا رزق یا ذریعہ معاش جس سے اس کی عزّت پر حرف آئے خالص زہر ہے۔ اس کے لئے وہی معاش قدر و قیمت والی ہے جس سے وہ دنیا میں باعزّت رہ سکے۔ خوددار آدمی بادشاہوں کی شان و شوکت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا اور محض دنیوی مفاد کے لئے ان کی غلامی نہیں کرتا ؎

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرد فالِ محمود سے درگذر
خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر

حلال طریقے سے مال حاصل کرنا منع نہیں ہے بلکہ حلال رزق کمانا عین عبادت ہے لیکن محض حصولِ رزق کو زندگی کا مقصد بنالینا مستحسن نہیں۔ مومن کا نصب العین بڑا بلند ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ذریعے اس کی رضا حاصل کرتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی مرضی اور خواہش باقی نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس کی رضا بن جاتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں سختیاں برداشت کرتا ہے اور ان پر صبر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جد وجہد کرتا ہے۔ وہ اپنے کردار کو بے داغ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تنگدستی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن ایسے طریقے سے رزق حاصل نہیں کرتا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے سامنے کلمۂ حق نہ کہہ سکے نہ ہی وہ حصولِ دولت میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ دین کے تقاضوں ہی سے غافل ہو جائے۔ جو رزق مومن کو حق بات کہنے سے باز رکھے یا اس کی روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے میں رکاوٹ ثابت ہو مومن ایسے رزق پر موت کو ترجیح دیتا ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دنیوی شان وشوکت کی خاطر کسی منصب اور عہدے کی تمنّا کرنا اسلام میں جائز نہیں لیکن کوئی منصب یا عہدہ تمنّا کئے بغیر حاصل ہو جائے اور مومن اسے ملک وملّت کی فلاح اور خدمتِ دین کے جذبے کے تحت قبول کرلے تو کوئی ہرج نہیں بلکہ عین مقصود ہے البتہ اس غرض کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنا جن سے دینِ حق کے زرّیں اصولوں سے

انحراف لازم آئے، بد دیانتی، بے ایمانی اور دھاندلی کا ارتکاب کرنا پڑے تو مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنا خودی پر موت طاری کرنے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی منصب یا عہدہ خواہش کئے بغیر مل جائے لیکن اس پر متمکن ہو کر مومن کو غیر اللہ کا قانون چلانا پڑے یا غیر اللہ کے قانون کی پابندی کرنی پڑے تو مومن ایسی صورت میں بھی ہر عہدے کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا وہی ظالم ہیں ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

کوئی معمولی منصب تو کیا مومن ایسی سلطنت بھی قبول نہیں کرتا جسے حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی خودی کا سودا کرنا پڑے۔ وہ خون کا نذرانہ پیش کر کے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے اور اپنی خودی کو ہمیشہ سربلند رکھتا ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

سوال کرنے اور مانگنے سے بھی انسان کی عزّت و آبرو پر حرف آتا ہے۔ اس کی خودی میں ضعف اور کمزوری واقع ہو جاتی ہے اس لئے اس سے بھی گریز لازم ہے۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ نے فرمایا تم میں سے جو شخص اپنی رسّی لے اور لکڑی کا ایک گٹھا پشت پر لاد کر لائے اور ان کو بیچے اور خداوند تعالیٰ اس ذریعے سے اس کی عزّت و آبرو کو برقرار رکھے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ لوگوں سے بھیک مانگتا پھرے کہ وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔ بھیک کے علاوہ عام معاملات میں بھی سوال سے بچنا

لازم ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم گھوڑے پر سوار ہو اور تمہارا چابک گر جائے تو کسی سے اٹھانے کے لئے نہ کہنا بلکہ خود اتر کر اٹھا لینا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران آپ اونٹ پر سوار جا رہے تھے کہ تازیانہ نیچے گر گیا۔ آپ خود نیچے اترے اور تازیانہ اٹھایا لیکن کسی کو تازیانہ اٹھانے کے لئے کہہ کر زیرِ بارِ احسان ہونا مناسب نہ سمجھا ؎

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ
الحذر از منّتِ غیر الحذر

حضرت عمرؓ کی طرح خود اونٹ سے نیچے آ۔ خدا کی پناہ! غیر کے احسان سے خدا بچائے۔

دنیا میں وہی انسان قدر و منزلت کا حامل ہوتا ہے جو خوددار ہوتا ہے اور تنگدستی میں بھی اپنی خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ حلال کا ایک لقمہ حرام کے خوان سے بہتر ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کمایا ہوا شبنم کا ایک قطرہ غیروں کے سمندر سے بہتر ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا بہت بڑی بے غیرتی ہے۔ جو لوگ اپنی تنخواہ پر گزارہ کرنے کی بجائے رشوت کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ دراصل اپنی عزتِ نفس کا سودا کر کے ترنوالہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر رشوت لیتے وقت وہ کبھی اپنے دل میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتے تو انہیں اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے۔ رشوت لینا بھی دریوزہ گری سے کم نہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت میں اپنے لئے ذلت کا سامان کرتے ہیں ؎

زیرِ گردوں آں جوانِ ارجمند
می رود مثلِ صنوبر سربلند
در تہی دستی شود خوددار تر
بخت او خوابیدہ، او بیدار تر

قلزم زنبیل سیلِ آتش است
گر زدستِ خود رسد شبنم خوش است
چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

دنیا میں وہ قابلِ قدر جوان صنوبر کی طرح سربلند ہوتا ہے جو تنگدستی میں خوددار رہتا ہے۔ اس کی قسمت سوئی ہوئی ہوتی ہے لیکن وہ بیدار ہوتا ہے۔ کاسۂ گدائی سے حاصل کیا ہوا سمندر بھی آگ کا سیلاب ہے لیکن اپنے ہاتھ سے اگر شبنم بھی حاصل ہو جائے تو اچھی ہے۔ مردانہ غیرت سے بلبلے کی مانند بن اور سمندر کے اندر رہتے ہوئے پیالے کو الٹا رکھ۔

شریف اور نیک آدمی اپنی محنت سے روزی کماتا ہے۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ دوسروں پر بوجھ بن کر زندگی گزارنا اس کے لئے باعثِ عار ہوتا ہے۔ نیک اور خوددار آدمیوں کا ہمیشہ یہی وطیرہ رہا ہے۔ وہ نیک آدمیوں کی نصیحت قبول کرتے ہیں اور کسی کے آگے سوال نہیں کرتے۔

زدستِ کسے طعمۂ خود مگیر
نکو باش پندِ نکویاں پذیر

کسی کے ہاتھ سے اپنی روزی ہرگز حاصل کر۔ نیک بن اور نیک آدمیوں کی نصیحت قبول کر۔

مومن کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ تمام دنیا کا رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ہر جاندار کو رزق پہنچاتا ہے۔ انسان اگر محنت کرے تو اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ جو شخص دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے گویا اس نے اپنے رازق کو نہیں پہچانا۔ اگر پہچان لیتا تو بادشاہوں کا محتاج نہ بنتا بلکہ بادشاہوں کے متعلق یہ گمان کرتا کہ وہ میرے رب کے سائل اور گدا ہیں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

غیرت مند آدمی اتنا حسّاس ہوتا ہے کہ وہ مانگنا تو کجا، دیگر ذرائع سے بھی غیروں کا احسان برداشت نہیں کرتا۔ یہ بات اس کی طبیعت پر نہایت گراں گزرتی ہے۔ خود دار اور غیرت مند آدمی غیروں کے احسان کو اپنی موت کے مترادف سمجھتا ہے۔

مَردِ آزادم آں گونہ غیورم کہ مَرا!
مے تواں کُشت بیک جامِ زلالِ دگراں

میں ایک آزاد آدمی ہوں اور اس درجہ غیرت مند ہوں کہ مجھے غیروں کے شربت کے ہی ایک گلاس سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

○

فقر

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے: اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ فقر میرا فخر ہے۔ دل کو حرص و ہوس سے پاک کر کے، تھوڑے پر قناعت کر لینے، غیر اللہ سے بے نیاز ہو جانے اور اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنے کا نام فقر ہے۔ انسان کو دنیا میں دین سے جو چیز سب سے زیادہ غافل کرتی ہے وہ حُبِّ مال ہے۔ عام طور پہ انسان کی ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا محور دولت ہوتی ہے۔ اس سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتا۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن اس کی حرص جوان رہتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس مال کی خاطر وہ اپنے آپ کو بعض اوقات ذلیل و خوار بھی کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید دولت مند بن جانے سے وہ زیادہ باعزّت ہو جائے گا۔ حالانکہ اصل عزّت دولت حاصل کرنے سے نہیں بلکہ دولت سے بے نیاز ہو جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: اَلْغِنَاءُ غِنَاءُ النَّفْسِ۔ اصل امیری دل کی امیری ہے۔ تھوڑے مال پر قناعت کر کے مجاہدوں کی سی زندگی بسر کرنا ہی اصل فقر ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فقر کے تین حرف ہیں: ف، ق، ر۔ ف سے فنا اور فارغ خاطر، ق سے قناعت اور ر سے ریاضت کے الفاظ بنتے ہیں۔ جو فقر کا خلاصہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا کو فنا کر دینا، غیر اللہ سے اپنے دل کو فارغ کر لینا، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس پر قناعت کرنا اور اللہ کے راستے میں ریاضت کرنا یعنی مشقتیں برداشت کرنے کا نام فقر ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ساری زندگی دولت جمع نہیں کی۔ جو کچھ آپ کے پاس آتا غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کئی کئی دن ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ خیبر اور دوسرے علاقے فتح ہوئے تو مسلمانوں کی حالت بھی بہتر ہو گئی مگر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسی حالت کو پسند کیا کہ کچھ ملا تو اسے تقسیم کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور نہ ملا تو صبر کیا۔ گھر میں کچھ ہوتا تو کھا لیتے نہ ہوتا تو روزے کی نیت کر لیتے اور کئی کئی دن اسی حالت میں گزار دیتے۔

ایک دن آپؐ ایک چٹائی پر آرام فرما کر اٹھے تو بدن پر چٹائی کے نشانات ظاہر ہو گئے۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسولؐ اللہ! آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لئے ایک نرم و نازک گدّا تیار کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا مجھے ایسی آسائشوں سے کیا مطلب! دنیا میں زندگی بسر کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسافر آرام کرنے کے لئے تھوڑی دیر کسی سایہ دار درخت تلے ٹھہر جائے۔ مومن کا اصل ٹھکانہ تو آخرت ہے۔

قرآن پاک جس فقر کی تلقین کرتا ہے وہ مست ہو کر ناچنے اور گانے کا نام نہیں بلکہ ہر جگہ، ہر لمحے زندگی کا احتساب کرنے کا نام ہے۔ فقر غار و کوہ میں سکون تلاش کرنے کا نام نہیں بلکہ بحر و بر میں ہلچل مچانے کا نام ہے۔ مردِ مومن تمام کائنات کی تسخیر کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرتا ہے۔ قرآن کا بتایا ہوا فقر اگر غلام بھی اختیار کرلے تو اس میں بھی آقا کی سی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر کے نزدیک فقر و درویشی گوشہ نشینی کا

کا نام ہے لیکن مومن کے لئے میدانِ جنگ میں اللہ کا کلمہ بلند کر کے اس کی رضا کے لئے جان دینے کا نام فقر ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اسی قسم کے فقر کا نمونہ سامنے آتا ہے۔ کبھی آپ کفّار کا راستہ روکنے کے لئے خندق کھودنے میں مصروف ہوتے ہیں بھوک کی شدّت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے ہوتے ہیں اور کبھی خیبر میں یہودیوں کی گوشمالی کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی سخت گرمی میں رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تبوک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی بدر و حنین اور احد میں دادِ شجاعت دے رہے ہوتے ہیں۔ اپنی جان کے دشمنوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن حدود اللہ کے معاملے میں سختی کا یہ عالم ہے کہ قریش کی ایک عورت چوری کرتے ہوئے پکڑی جاتی ہے تو اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ لوگ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لئے بھیجتے ہیں تو آپ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ اسامہ! تم حدود اللہ میں سفارش کرتے ہو۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔

مدینے میں ایک رات ایک طرف شور اٹھتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس کا پتہ لگانے کے لئے جا رہے ہوتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم انہیں گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار واپس آتے ہوئے ملتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں، مدینے کے قریب ایک قافلہ آکر ٹھہرا ہے اور اس کا شور ہے۔ آپ اردگرد کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور جہاں بھی کوئی فتنہ سر اٹھاتا نظر آتا ہے اسی وقت اس کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ اسی قسم کی سادہ اور مجاہدانہ زندگی کا نام فقر ہے۔

۱ سبز رنگ کا چولہ پہن لینے، کشکول ہاتھ میں تھام لینے، بڑے بڑے منکوں کی بنی ہوئی مالا گلے میں حمائل کر لینے، سر کے بال بڑھا کر کسی کٹیا میں دھونی رما کر بیٹھ رہنے یا بدن پر بھبوت مل لینے، پاؤں میں گھنگرو ڈال کر رقص کرنے اور دمادم مست قلندر کے نعرے لگانے کا نام فقر نہیں بلکہ ہر میدان میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کا نام فقر ہے۔

فقرِ قرآں احتساب ہست و بود
نے رباب دستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست! تسخیرِ جہات!
بندہ از تاثیرِ او مولا صفات!
فقرِ کافر خلوتِ دشت و دراست
فقرِ مومن لرزۂ بحر و براست
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ
زندگی ایں را ز مرگِ باشکوہ

قرآن کی رو سے ساز و آواز اور ناچ گانے میں مست ہونے کا نام فقر نہیں بلکہ زندگی کے احتساب کا نام فقر ہے۔ مومن کا فقر کیا ہے؟ کائنات کو مسخر کرنا۔ ایسا فقر جس سے غلام میں بھی آقا کی سی صفات پیدا ہو جائیں۔ کافر کا فقر جنگلوں اور صحراؤں میں خلوت گزین ہونا ہے لیکن مومن کا فقر بحر و بر میں ہلچل مچانا ہے۔ اُس کے لئے غاروں اور پہاڑوں میں سکون تلاش کرنا اور اِس کے لئے اللہ کی راہ میں شان و شوکت کے ساتھ جان دینے کا نام زندگی ہے۔

جب کوئی شخص اپنے اندر فقر کی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے تو تاج و تخت کے مالک شہنشاہ اس کی ہیبت سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ اس کا دل ہر طرح کی حرص و طمع سے پاک ہوتا ہے۔ وہ بادشاہوں کی طرح دام و درہم کا اسیر نہیں ہوتا اس لئے وہ بے خوف ہو کر ان کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے۔ ایسے ہی بے غرض فقیر کی چٹائی کی شوکت سے بادشاہ کا تخت بھی کانپتا ہے ؎

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر!!
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

مردِ فقیر بادشاہوں سے قوت آزمائی کرتا ہے۔ چٹائی کی شوکت سے تخت بھی کانپتا ہے۔

فقر مردہ دلی اور زندگی سے فرار کا نام نہیں بلکہ زندگی کی سختیوں کو ذوق وشوق سے برداشت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ یہی متاعِ مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ فقر جب ظاہر ہوتا ہے تو وہ کبھی بدر و حنین میں سرکف مجاہدوں کی حرارت بن جاتا ہے اور کبھی کربلا کے میدان میں امام حسینؓ کی تکبیر کی آواز ثابت ہوتا ہے۔ فقیر کا سرمایہ قرآن ہوتا ہے۔ وہ محفل میں کم گو ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ایک سانس سے سینکڑوں محفلوں کو گرمی میسّر آتی ہے۔ وہ نانِ شعیر پہ گزر اوقات کر کے قوّتِ حیدری حاصل کرتا ہے۔ وہ بادشاہوں کے سامنے لاملوکٌ اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتا ہے ؎

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ ست
گرچہ اندر بزم کم گوئید سخن
یک دَمِ او گرمیٔ صد انجمن
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

فقر ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا نام ہے۔ یہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سرمایہ ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ اگرچہ محفل میں فقیر کم گو ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے ایک سانس سے سینکڑوں محفلوں کو گرمی میسّر آتی ہے۔ فقر جب ظاہر ہوتا ہے تو بدر و حنین کی گرمی اور امام حسینؓ کی زبان سے نکلی ہوئی "اللہ اکبر" کی آواز بن جاتا ہے۔

فقیر اپنی ذات میں بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ بادشاہوں کی شان و شوکت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی نگاہ بڑے اعلیٰ مقصد پہ مرکوز رہتی ہے۔ اس لئے سریر و سلطنت اسے ہیچ نظر آتے ہیں۔ بادشاہ تو خراج وصول کر کے حکومت کا کام چلاتے ہیں۔ لیکن فقیر کو ایسی گدائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے زر و جواہرات کے خزانے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ــــ وہ

حرص و ہوس اور سیم و زر کا غلام نہیں ہوتا صرف خدا کا بندہ ہوتا ہے اور اسی کے کلمے کو بلند رکھتا ہے۔ اس کا سینہ نورِ ایمان سے منوّر ہوتا ہے۔ اس لئے دنیا کی کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں جچتی ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

فقر انسان کو مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمّت عطا فرماتا ہے۔ فقیر اللہ کی راہ میں سختیاں برداشت کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کو اللہ کے دین کے تابع کر کے ہر جگہ حق کا کلمہ بلند کرتا ہے۔ وہ تنہا ایک فوج کا کام کرتا ہے۔ وہ کبھی زمانے کا شکوہ نہیں کرتا بلکہ ہر حال میں سراپا تسلیم و رضا بنا رہتا ہے۔ جو فقیر اپنی قوّت سے زمانے کو اپنے موافق بنانے کی بجائے اس کا گلہ کرے وہ فقیر نہیں بلکہ گدا ہے ؎

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند!
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

دنیا کی محبّت انسان کو بزدل اور کم ہمّت بنا دیتی ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو زمانے کا گلہ کرتا ہے۔ فقیر کے دل میں دنیا کی محبت نہیں ہوتی اس لئے وہ باہمّت ہوتا ہے۔ وہ زمانے کا شکوہ نہیں کرتا۔ اسے راہِ حق میں جو زخم لگتے ہیں انہیں سعادت سمجھتا ہے اور آہ و فغاں سے راہِ خدا میں اپنی قربانیوں پر پانی نہیں پھیرتا۔ آہ و فغاں کم ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ جب کہ اسے ضبط کرنا دلیری اور بہادری ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے جسم پر تیروں، برچھیوں اور تلواروں کے زخموں کے ستر نشان تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی آہ نہ کی۔ ان کے دل میں اگر کوئی حسرت تھی تو یہ کہ انہیں میدانِ جنگ میں شہادت کا مرتبہ نصیب نہ ہوا ؎

طریقِ اہلِ دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا
نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی

یہ نکتہ پیرِ دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا
کہ ہے ضبطِ فغاں شیری! فغاں روباہی و بیشی

فقیر سینے میں دل بیدار رکھتا ہے۔ اس لئے وہ ضرورت کے وقت کلمۂ حق کہنے کے لئے بے سروسامان ہی نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی بے باکی اور بے تابی اسلحے کا کام کرتی ہے۔ وہ اللہ پر توکّل کے ذریعے اپنے دل کو ہر قسم کے خوف اور وساوس سے پاک کر لیتا ہے۔ وہ ہر فرعون کے سامنے کلیم اللہ کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی ضرب کاری ہوتی ہے اور وہ حق و باطل کے ہر معرکے میں پیش پیش ہوتا ہے۔ وہ باطل سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر زمانے میں باطل کا مقابلہ کر کے قصّۂ فرعون و کلیم تازہ رکھتا ہے ؎

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصّۂ فرعون و کلیم

فقیر بڑا غیرت مند ہوتا ہے۔ وہ غریبی میں بھی اپنی عزّتِ نفس کو قائم رکھتا ہے اور بادشاہوں کے درباروں اور امرار کے محلّات کا طواف نہیں کرتا۔ وہ باعزت زندگی بسر کرتا ہے۔ امرا اور وزرا ایک دوسرے کے احسان مند ہوتے ہیں۔ لیکن فقیر اس بوجھ سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے سامنے کبھی سر نیچا نہیں کرتا۔ اس کا یہ رویّہ اسے ایسا بلند مقام عطا کرتا ہے جو امیروں کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتا ہے۔ جو فقر اور درویشی مسلمان کو دوسروں کے سامنے سر نیچا کرنا سکھا دے، اللہ تعالیٰ اس سے بچائے ؎

غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے مسلماں کو سکھا دی سربزیری

عیسائیوں میں نجات کا بہترین ذریعہ رہبانیت ہے۔ جو لوگ اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں وہ دنیا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے جھگڑوں اور جھمیلوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق وہیں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں اور اسی کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ انہیں راہب کہا جاتا ہے اور عام لوگوں کے نزدیک ان کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے ایک طبقے میں بھی راہ پا گیا اور انہوں نے راہبی کو فقیری سمجھ لیا۔ حالانکہ اسلام فقر کا جو نظریہ پیش کرتا ہے وہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں رہبانیت جائز نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو اپنا مقصد نہ بنائے، اس سے صرف اتنا تعلق رکھے جتنا زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کی ساری صلاحیتیں، توانائیاں اللہ کے دین کی خاطر صرف ہونی چاہئیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لینا اسلام نہیں۔ اسلام تو اپنے پیروکاروں کو زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے اور مصائب و آلام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ سکون کی بجائے حرکت کا قائل ہے۔ مسلمان طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے، باطل کو سرنگوں کرنے اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔ اسے موت اتنی ہی عزیز ہوتی ہے جتنی ایک دنیا دار آدمی کو زندگی۔

جب تک مسلمان اس فقر کے حامل رہے، تخت و تاج کے وارث بنے رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح شان و شوکت کے ساتھ عناصر پر حکمران رہے۔ جب انہوں نے فقر کے اس تصور سے آنکھیں بند کر لیں نہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جیسی درویشانہ زندگی نصیب ہوئی اور نہ سلطنت کے مالک رہ سکے ؎

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی!

جو مسلمان فقر کی شان کو سمجھ لیتا ہے اسے زندگی کی تلخیاں شہد کی طرح شیریں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ راستے کے پتھر اس کے لئے شیشہ بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی حق پرستی کے زور سے باطل کے ایک ایک نقش کو مٹاتا چلا جاتا ہے لیکن جو شخص آرام طلبی اور عیش کوشی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے وہ تادیر اس رویے کو قائم نہیں رکھ سکتا اور آخر کار اس کی یہ آرام طلبی اس کے لئے ذلت کا سبب بن جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے کردار میں فقر کی خصوصیات پیدا کر کے اتنی قوت پیدا کی کہ انہوں نے بڑے بڑے بادشاہوں سے خراج وصول کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت تھے، ایک طویل و عریض سلطنت کے حکمران تھے، ان کے کپڑوں میں ہمیشہ پیوند لگے رہتے تھے، بعض اوقات اینٹ ہی کا تکیہ بنا کر زمین پر تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ لیکن کافروں پر ان کا اس قدر رعب تھا کہ بڑے بڑے سپہ سالار اور بادشاہ ان سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ ان کے زمانے میں مسلمانوں کا جب ایرانی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیوند لگے کپڑوں سے ان کی عزت اور شان میں کوئی فرق نہ آیا لیکن رستم کو اس کا ریشمی اور زرنگار لباس شکست سے نہ بچا سکا۔

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج!
گیرد آں درویش از سلطاں خراج
بادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر

جو شخص راستے کے پتھر کو شیشہ سمجھتا ہے وہ درویش بادشاہ سے خراج وصول کرتا ہے۔

ریشمی قباؤں میں ملبوس بادشاہوں کا چہرہ اس عریاں فقیر کے خوف سے زرد رہتا ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک ارشاد کا مطلب ہے کہ ہلکا پھلکا مومن اچھا ہوتا ہے۔ وہ مومن جو ضرورت سے زیادہ سامان جمع نہیں کرتا، مال و دولت اور ساز و سامان کے انبار لگانے میں اپنی صلاحیتیں صرف نہیں کرتا، وہ بہتر ہے کیونکہ وہ دنیا میں بھی بہت سی مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچ جاتا ہے اور آخرت میں حساب کتاب دینے میں بھی اسے سہولت ہوگی۔ زیادہ سامان سے انسان کے اندر تن آسانی آجاتی ہے اس لئے مردِ فقیر کم ساماں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی سامان کے انبار نہیں لگاتا ؎

ساماں کی محبّت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

دنیا میں آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس دنیا کے ساز و سامان کی طرف کم از کم توجہ دے اور اپنی نگاہ آخرت پر مرکوز رکھے۔ اس سامان کی طرف توجہ دے جو آخرت کے راستے کا توشہ بن سکے۔ آخرت کے راستے کو آسان بنانے کا طریقہ، اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا، اس کی راہ میں مشکلات برداشت کرنا اور اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے جد و جہد کرنا ہے۔ جو شخص خود دنیا سے کم سے کم حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچاتا ہے وہ کیمیا ہے۔ اور جو شخص خود زیادہ سے زیادہ جمع کرتا اور دوسروں کو کم سے کم دیتا ہے وہ مٹی کی مانند ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے شوق میں بعض اوقات انسان ذلیل ہوتا ہے اور دوسروں کا زیرِ بار احسان ہونے کی وجہ سے اصل آزادی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ زیادہ دولت بھی آدمی کو غلام بنا دیتی ہے۔ وہ ہر وقت اس کی حفاظت اور نگہداشت میں لگا رہتا ہے۔ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق آزادی کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اَقْلِلْ مِنَ الدُّنْیَا تَعِشْ حُرًّا۔ دنیا سے کم سے کم حاصل کر اور آزادی کے ساتھ زندہ رہ۔

راہ دشوار است ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر
تا توانی کیمیا شو گل مشو !!
در جہاں منعم شو و سائل مشو

راستہ مشکل ہے، کم سامان حاصل کر۔ دنیا میں آزاد جی اور آزاد مر۔ جہاں تک ہو سکے کیمیا بن مٹی نہ بن۔ دنیا میں عطا کرنے والا بن مانگنے والا نہ بن۔

اگر مسلمان کے دل میں اللہ کی راہ میں کام کرنے کا جذبہ، ذوق و شوق اور ایمان کی حرارت موجود ہو تو تنگ دستی اور کم سامانی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ حضرت علیؓ مرغن غذائیں نہیں کھاتے تھے، ان کی طاقت و قوت کا انحصار جَو کی سوکھی روٹی پر تھا لیکن ان کے دل میں ایمان کی حرارت موجود تھی۔ اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کرنے کا شوق اور ولولہ تھا۔ اس لئے ان کے اندر بڑی قوت تھی۔ یہ ایمانی حرارت کا ہی اعجاز تھا کہ خیبر کا مشہور قلعہ جسے دوسرے کئی سورماؤں کی جد و جہد کے بعد سر نہ کر سکے حضرت علیؓ نے اسے بالکل تھوڑے عرصے میں فتح کر لیا ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؓ

حضرت علیؓ نے دنیا کو اپنا مقصد نہیں بنایا بلکہ دنیا کو دار العمل سمجھ کر جو کچھ کیا آخرت کے لئے کیا۔ اگر وہ چاہتے تو دولت کے انبار لگا کر شاہانہ زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن وہ اس دنیا کی متاع کو حقیر جانتے تھے۔ اس لئے انہیں کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک یہودی کے باغ میں کنوئیں سے پانی کھینچ کر باغ سیراب کرنے کا کام مزدوری پر کیا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب انہیں مزدوری میں اتنی کھجوریں میسر آجائیں گی جنہیں وہ شام کو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے کھا سکیں گے تو کام ختم کر دیا۔ یہودی نے پہلے سے دگنی مزدوری پر کام کرنے کی پیشکش کی۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا: جس

ضرورت کے لئے میں نے مزدوری کی ہے وہ اتنی مزدوری سے پوری ہو جائے گی۔ آپ نے پوری زندگی سادگی سے بسر کی لیکن اللہ کی راہ میں بڑی شان سے جہاد کیا۔ ہر جنگ میں ایسی بہادری دکھائی کہ بوتراب کے ساتھ ساتھ اسد اللہ اور حیدرِ کرّار بن گئے۔ آج بھی جو شخص اپنے اندر حضرت علیؓ جیسا عشقِ جسور اور فقرِ غیور پیدا کر لے تو وہ دارا اور سکندر جیسے عظیم الشان بادشاہوں سے بھی عالی مرتبہ ہو جائے گا ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

دنیا میں انسان کو اپنے مقصد سے غافل کرنے والی سب سے بڑی چیز ہوسِ زر اور دولت کی محبّت ہے۔ جب کوئی شخص اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے دل سے حلال و حرام کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح بھی دولت میسّر آئے حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ رشوت لیتا ہے، دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے، ملاوٹ اور خیانت کرتا ہے اور نہ جانے اس غرض کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے۔ لیکن مردِ درویش کے لئے سونے چاندی اور کھنکتے ہوئے سکّوں میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔ اسے فقط آزادی کی زندگی محبوب ہوتی ہے۔ جب اسے اپنی یہ محبوب شے حاصل نہ ہو تو اسے حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ آزادی پسند انسانوں کے دو ہی ٹھکانے ہوتے ہیں۔ یا آزادی کا تخت یا موت کا تختہ۔ آزادی کی زندگی صرف اللہ کا بندہ بن کر رہنے اور اس کے احکام کی اطاعت میں میسّر آتی ہے۔ غیر اللہ کی اطاعت غلامی ہے اور غلامی سے موت بہتر ہے ؎

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ!
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

فقیر کی اصل دولت خلافت و حکمرانی ہے۔ مسلمان جب فقر کے حقائق سے واقف تھا تو اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اس وقت کی معروف سلطنتوں پر تسلّط حاصل کر کے

حکمرانی کی۔ روم وشام اور دنیا کے بیشتر علاقوں پر صدیوں تک مسلمانوں کی عملداری رہی۔ جب تک انہوں نے اصل فقر اختیار کئے رکھا وہ اس دولت کے مالک رہے اور جب انہوں نے اپنے حال میں مست رہنے اور دنیا سے لاتعلق ہوجانے کو فقر سمجھ لیا تو وہ اپنی اصل دولت سے محروم ہو گئے۔ اب بھی مسلمان اصل فقر کی صفات پیدا کرلیں تو اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں ؎

آہ کہ کھو یا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم وشام

اگرچہ فقیر اپنی ذات میں بادشاہ ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتا غیر اللہ کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، رضائے الٰہی میں اپنی رضا کو فنا کر دیتا ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہوتا ہے اسی پر قناعت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے سرگرم رہتا ہے، خوددار ہوتا ہے، نفع نقصان کا مالک صرف خدا کو سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہیں رکھتا، دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا ہے، اس کے ایک ایک حکم پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کی یہ بادشاہی نامکمل اور خام ہوتی ہے۔ اس کی بادشاہی مکمل اور پختہ اس وقت ہوتی ہے جب اسے ملک میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہو اور اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرکے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کردی ہو ؎

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز

قوت، ریاضت اور استغناء فقر کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب نوجوان مسلمانوں کی اکثریت ان اوصاف سے تہی دامن ہے۔ ان اوصاف سے عاری انسانوں کو اگر بادشاہت بھی میسّر آجائے تو وہ اسے زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے۔ حکومت کا نظام چلانا جری اور دلیر آدمیوں کا کام ہوتا ہے۔ تن آسان اور آرام طلب ہمیشہ محکومی کی زندگی

بسر کرتے ہیں. مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سی قوت اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جیسا استغنا پیدا کریں ۔ ان صفات کے حامل ہونے سے ہی وہ دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں. ان اوصاف کے لئے ہمیں اپنے اسلاف کی زندگی کو سامنے رکھنا چاہیے. جدید تہذیب کی چمک دمک میں فقر و استغنا کی دولت تلاش کرنا عبث ہے۔

پرندوں میں عقاب ایسا پرندہ ہے جو فقر و درویشی کی بہت سی صفات کا حامل ہوتا ہے وہ سادہ زندگی بسر کرتا ہے. آرام و آسائش کے لئے خوشنما آشیانے نہیں بناتا. باہمت ہوتا ہے ہر وقت چوکس رہتا ہے کبھی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتا. خوددار ہوتا ہے، کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا. حرص و طمع کی آلودگی سے پاک رہتا ہے ۔ آرام طلبی اور تن آسانی کی بجائے سخت کوشی کا عادی ہوتا ہے. ہمیشہ بلندیوں کی طرف محوِ پرواز رہتا ہے. فقر و استغنا کی یہ صفات جب مسلمان نوجوانوں میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں تو انہیں بھی اپنی منزل بڑی بلند نظر آنے لگتی ہے

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی
عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

مسلمان کی اصل قوت ایمان اور اطاعتِ خدا اور رسول میں ہے. اس میں شک نہیں کہ مال و دولت بھی انسانی ضرورت ہے لیکن اس کی کثرت و قلّت سے طاقت اور قوّت کا فیصلہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اصل فیصلہ کن چیز قوّتِ ایمان ہے. عہد صحابہ میں لوگ بڑے

تنگدست تھے۔ اُن کے پاس نہ کھانے پینے کا سامان وافر ہوتا تھا نہ تن ڈھانپنے کے لئے عمدہ کپڑے ہوتے تھے۔ جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے بھی وہ اپنی حریف قوموں سے آگے نہ تھے۔ لیکن ان کی شان و شوکت اور قوّت کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ جیسے عظیم الشّان بادشاہ بھی ان سے کانپتے تھے۔ دوسری صدی ہجری میں سجستان موجودہ افغانستان کے ایک فرمانروا جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا، نے بنی امیّہ کو خراج دینا بند کر دیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے کئی مہمات بھیجی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا یزید بن عبد الملک کے عہد میں جب اس سے خراج لینے کے لئے ایک سفارت بھیجی گئی تو اس نے سفیروں سے دریافت کیا۔ "وہ لوگ کہاں چلے گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے ہوتے تھے اور پاؤں میں کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے"۔ انہوں نے کہا وہ تو گزر گئے۔ رتبیل نے کہا اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے۔ تم سے زیادہ طاقتور تھے۔ رتبیل نے یہ کہہ کر خراج دینے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

مسلمان جب آپس میں اتفاق و اتحاد سے رہے، نظم و ضبط کے پابند رہے، ایمان اور عمل صالح سے بلند کردار کے مالک بنے رہے تو دوسری قوموں کے دلوں پر ان کی دھاک بیٹھی رہی لیکن جب سرمایۂ ایمان و عمل میں کمی واقع ہوئی تو تعداد اور سر و سامان کی کثرت کے باوجود ان میں ضعف واقع ہو گیا ؎

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسّر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جسکو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

○

یقینِ محکم

اپنے مقصد کی سچائی پر پختہ یقین ہی انسان کو عمل پر ابھارتا ہے اور مقصد میں کامیابی کی امید ہی اسے طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔

امید اور یقین کامیابی کی کلید اور زندگی کی مشکلات کو آسان بنانے اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہیں جبکہ یاس، حزن اور خوف خودی کے لئے زوال اور زندگی کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی شخص کے ناامید ہو جانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان پختہ اور مضبوط نہیں ہے۔ مومن کو اپنے مقصد کی سچائی اور اس میں کامیابی کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس لئے ناامید ہو کر کبھی جد و جہد ترک نہیں کرتا بلکہ اپنا مستقبل حال سے زیادہ روشن ہونے کی توقع رکھتا ہے۔

زندگی را یاس خواب آور بود
ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود
چشمِ جاں را سرمہ اش اعمیٰ کند
روزِ روشن را شبِ یلدا کند
از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

ناامیدی زندگی کو (غفلت کی نیند) سُلا دیتی ہے۔ یہ زندگی کے جوہر کی سُستی کا باعث ہے۔ اس کا سرمہ زندگی کی آنکھ کو اندھا کر دیتا ہے اور روزِ روشن کو تاریک رات بنا دیتا ہے۔

اس کے دم سے زندگی کی قوتیں مُردہ ہو جاتی ہیں اور زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔

یاس و نا امیدی کے بعد دوسری چیز جو انسان کی زندگی سے عمل کی قوتیں سلب کر لیتی ہے وہ غم ہے۔ اپنے مقصد کے متعلق نا امیدی پیدا ہو جائے تو اس کی خاطر خطرات مول لینے اور مصائب برداشت کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ سینے میں ایمان کی حرارت ناپید ہو جاتی ہے اور انسان برف کی سل کی طرح منجمد ہو جاتا ہے۔ اس کی قوتِ کار شَل ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم زندہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں روح مردہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور توکّل ہی سے انسان غم سے آزاد ہو کر عمل پر آمادہ ہوتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں قیام کیا تو کفّار آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار کے عین دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ نے دیکھ کر فرمایا "یا رسولؐ اللہ! دشمنوں نے ہمیں پالیا" آپؐ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غم نہ کر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کا دل مطمئن ہو گیا اور غم سے آزاد ہو گئے۔ مسلمان کو ہر وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، وہ حکمت والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لَا تَحْزَنْ بگیر
از رضا مسلم مثالِ کوکب است
در رہِ ہستی تبسم بر لب است
گر خدا داری زغم آزاد شو!
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

اے غم کے قید خانے میں قید ہونے والے اپنے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے "غم نہ کر" کی تعلیم حاصل کر۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سے مسلمان ستارے کی مانند ہے۔ زندگی کے راستے

میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اگر تو خدا رکھتا ہے تو غم سے آزاد ہو جا۔ اور کم و بیش کے خیال سے اپنے آپ کو آزاد کر لے۔

زندگی کی منزلوں کو مشکل بنانے اور انسان میں بے عملی کی کیفیت پیدا کرنے والی تیسری چیز خوف ہے۔ خوف بھی دراصل کمزوری ہی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس بات پر جم گئے تو انہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔

جب انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ فلاں صاحبِ اقتدار و قوت ہے وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے، فلاں شخص بڑا برگزیدہ ہے اس کی بد دعا سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس کے دل میں غیر اللہ کا خوف سما جاتا ہے اور یہی خوف کئی بار اس پر موت کی حالت طاری کر دیتا ہے۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان پیشِ نظر رکھے کہ تمام دنیا کے لوگ مل کر تجھے نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے اور دنیا کے تمام لوگ اگر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو سکتا ہے۔ دل میں غیر اللہ کا خوف رکھنا، شرک اور غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو جانا ایمان کی علامت ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرعون کی طرف جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ خوف نہ کر بے شک (فرعون کے مقابلے میں) تو ہی برتر ہے ؎

قوتِ ایماں حیات افزایدت
وردِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ بایدت

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلبِ اُو از لَاتَخَفْ محکم شود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است
ہر کہ رمزِ مصطفٰے افہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است
خوفِ حق عنوانِ ایماں است وبس
خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است وبس

ایمان کی قوت زندگی بڑھاتی ہے۔ تجھے لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ کا درد کرنا چاہیئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہیں رکھنا چاہیئے۔ جب کوئی کلمۂ حق کہنے والا کسی فرعون کی طرف جاتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کے حکم "خوف نہ کر" سے محکم ہوتا ہے۔ جس شخص نے مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رمز کو پہچان لیا ہے اس نے شرک کو خوف میں پنہاں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ایمان کا عنوان ہے اور بس۔ غیر اللہ کا خوف شرکِ خفی ہے اور بس۔

خوف کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ منصب چھن جانے کا خوف، مال کے زوال کا خوف، دنیا کا خوف، جان کا خوف، مختلف آلام کا خوف ـــ ان سب کا علاج کامل ایمان ہے اور اسی قوت سے ہر قسم کے خوف سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

جب تک تو عصائے توحید لا الٰہ الا اللہ ہاتھ میں رکھتا ہے، ہر قسم کے خوف کے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔

دنیا میں مسلمان کو ہر قسم کے خوف و ہراس سے بے نیاز ہو کر اپنا مقام پہچاننا چاہیئے۔ اور یقین محکم کے ساتھ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنی چاہیئے۔ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور دینِ حق سے نوازا ہے۔ یہ ایسی بڑی نعمت ہے جو مسلمان کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ مسلمان کے سینے میں نغمۂ توحید ہے۔ اس کا سینہ دولتِ ایمان سے مالا مال ہے اس لئے اسے دنیا میں اپنے آپ کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ہمیشہ بلندیوں پر نظر رکھنی چاہیئے، دوسروں سے اپنے آپ کو اعلیٰ تہذیب و تمدّن کا مالک سمجھنا چاہیئے اور غیروں کی معاشرت اور بود و باش کو بہتر سمجھ کر تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پاکیزہ زندگی میں مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے۔ اسی نمونے کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مسلمان شاہین کی مانند ہوتا ہے جو بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ وہ غلاظت کو پسند کرنے والے کوّوں اور چیلوں کے ساتھ پرواز نہیں کرتا۔ اگر اسے ان کے ساتھ زندگی کے کچھ لمحات گزارنے پڑیں تو اپنی انفرادیت اور تشخّص کو برقرار رکھتا ہے ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مسلمان بھی شاہین کی طرح ہر قسم کے حالات میں اپنے مقصد پر نظر رکھتا ہے۔ وہ بد دل ہو کر اپنے مقصد اور نصب العین سے پیچھے نہیں ہٹتا اور طاغوتی طاقتوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود یقین کے ساتھ اپنے مقصد کے لئے جد و جہد کرتا رہتا ہے ؎

تا کجا ایں خوف و دسواس و ہراس
اندر ایں کشور مقامِ خود شناس
ایں چمن دارد بسے شاخے بلند
بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر! جنسِ خود بشناس و با زاغاں مَپَر!

یہ خوف و ہراس اور ڈر کب تک ؟ اس دنیا میں اپنا مقام پہچان ۔ یہ باغ بہت سی بلند شاخیں رکھتا ہے ۔ اپنا آشیانہ کسی نیچی شاخ پر نہ بنا ۔ اے بے خبر تیرے سینے میں ایک نغمہ ہے ۔ اپنی جنس پہچان اور کوّوں کے ساتھ پرواز نہ کر ۔

جب مسلمان خوف و ہراس، حزن و غم اور یاس و ناامیدی سے نجات حاصل کر کے یقین کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کرتا ہے تو اس کے اندر ایک غیر مرئی قوّت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کے راستے کی تمام مشکلات آسان ہو جاتی ہیں ۔ جبریل امیں کی طرح اس کی پرواز بھی بلندیوں کی طرف ہو جاتی ہے ۔ اور آخر کار وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

جب افراد یقین کے ساتھ ملّت کی تعمیر کا کام شروع کرتے ہیں تو ملّت اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے ۔ بے یقینی ملّت میں انتشار پیدا کرتی ہے ۔ جب کہ یقین اس کے استحکام کا باعث ہوتا ہے ۔ اسی یقیں کی بدولت ملّت سرگرمِ عمل ہو کر اپنی تقدیر سنوارتی اور دنیا میں بلند مقام حاصل کرتی ہے ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورتگرِ تقدیرِ ملّت ہے

ایک حدیثِ قدسی کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جب میرا کوئی بندہ میری طرف رجوع کرتا ہے اور میرا بن جاتا ہے تو میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ کام کرتا ہے، میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ۔" جب مردِ مومن اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے سوائے حق کے کچھ سرزد نہیں ہوتا، اس کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہو جاتا

ہے اور اس کے ہر عمل میں تائید ایزدی شامل ہو جاتی ہے۔ جب یہ صورتِ حال ہو جائے تو باطل قوتیں اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتیں۔ مردِ مومن ہر میدان میں ان قوتوں کو شکست سے دوچار کرتا ہے اور خود ہر معرکے میں سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔ لیکن جب اس پر یقین کی بجائے گمان غالب ہو جائے تو اس سے کچھ بن نہیں پڑتا، وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہتی ؎

خدائے لَمْ یَزَل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

غلامی میں جکڑا ہوا انسان بے بس ہوتا ہے لیکن یقین و ایمان کی پختگی سے یہ زنجیریں بھی کٹ جاتی ہیں ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

زندگی ایک مسلسل جہاد ہے۔ اس لئے جو لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے مسلسل عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی زندگی عمل سے بنتی ہے۔ اس دنیا کی زندگی بھی اور آخرت بھی۔ یہ دنیا انسان کے لئے نہ پھولوں کی سیج ہے اور نہ کانٹوں کا بستر۔ جیسے کوئی محنت کرے گا ویسا پھل پائے گا۔ آخرت میں جنّت اور جہنّم کا فیصلہ بھی اس کے اعمال کے مطابق ہی ہوگا ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی!!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جو لوگ اپنا وقت بے کار مشغلوں میں ضائع نہیں کرتے، کسی بلند تر مقصد کے لئے یقین محکم کے ساتھ مصروفِ عمل رہتے ہیں، دنیا کو اخوّت و محبّت کا پیغام دیتے ہیں، اپنے اخلاق اور سیرت و کردار کی بلندی سے اہلِ دنیا کے دل جیت لیتے ہیں، وہی

فاتحِ عالم ثابت ہوتے ہیں ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

اپنے مقصد میں کامیابی کا یقین اس وقت حاصل ہوتا ہے. جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور اعتقاد ہو. اسی یقین و ایمان کی بدولت مومن کو غیر اللہ سے بے نیازی کی دولت نصیب ہوتی ہے جس کے سامنے بادشاہ بھی جھکتے ہیں.

ہارون الرشید اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔ ایک رات اپنے وزیر فضل بن ربیع سے کہنے لگا کہ دربار میں آنے والوں سے ہم نے بہت باتیں کی ہیں. آؤ آج چند اللہ والوں کے گھروں میں جا کر ان کی باتیں سنیں ـــــ بغداد ان دنوں اللہ والوں کا مرکز تھا۔ وہ مختلف گھروں میں پھرتے رہے۔ آخر حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو ابراہیم ادھم کے مرشد تھے کے گھر پہنچے تمام شہر خوبصورت روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا. مگر اس اللہ والے کے گھر میں معمولی سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جب بادشاہ کے آنے پر اس اللہ کے بندے نے دروازہ کھولا تو وہ بھی ہوا کے جھونکے سے بجھ گیا۔ کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا کیا خوشامدیں اور عذر پیش کرتا اور فوری طور پر بادشاہ کے لئے کوئی عمدہ مسند اور روشنی مہیّا کرتا۔ لیکن یہ کسی دنیا دار کا مسکن نہ تھا، اللہ والے کا گھر تھا. اللہ والوں کی امیدیں اللہ والوں سے وابستہ ہوتی ہیں. وہ دنیا والوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بادشاہ نے بڑھ کر مصافحہ کیا تو حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا " ہارون! تیرے ہاتھ بڑے نرم و نازک ہیں۔ خبردار ایسا کام نہ کرنا کہ یہ دوزخ کا ایندھن بنیں۔ ہارون جب تک وہاں رہا، دین کے متعلق ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ جب وہاں سے رخصت ہوا تو حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگا " آپ کا کوئی قرض ہو تو ارشاد فرمائیں۔ میں ادا کر دوں گا" ہارون نے گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ شاید حضرت فضیل مقروض ہوں گے اور میں قرض ادا کرنے کی سعادت حاصل کروں گا. حضرت فضیل بن عیاض نے کہا

"میرے ذمّے اللہ کی بندگی کا قرض ہے اور یہ مجھے ہی ادا کرنا ہے تو اسے ادا نہیں کر سکتا"۔

جب حجّاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر بنا اور اس نے اپنے اختیارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کیا تو حسن بصریؒ ان معدودے چند رجالِ عظیم میں سے تھے جنہوں نے اس کے منہ زور اور سرکش اقتدار کو لگام دی۔ برسرِ عام اس کی سیاہ کاریوں اور مظالم کو ہدفِ تنقید بنایا اور اس کے منہ پر کلمۂ حق کہنے سے بھی باز نہ آئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ آج بھی ہمارے لئے انتہائی سبق آموز ہے۔ حجاج نے بصرہ اور کوفہ کے درمیان وسطِ شہر میں اپنے لئے ایک محل تعمیر کروایا۔ جب اس کی تعمیر مکمل ہو چکی تو اس نے منادی کرادی کہ لوگ غم غلط کرنے اور سیر و تفریح کے لئے اس محل کو دیکھنے آئیں اور اس کے لئے خیر و برکت کی دعا کریں۔

حضرت حسن بصریؒ نے لوگوں کے اس اجتماعِ عام کو غنیمت سمجھا اور یہ پسند نہ کیا کہ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہٰذا آپ نے فیصلہ کر لیا کہ اس موقع پر لوگوں کو نصیحت کریں گے، انہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں ان کی ذمّہ داریاں یاد دلائیں گے، ان پر متاعِ دنیا کی ناپائیداری اور بے وقعتی واضح کر کے تلقین کریں گے کہ وہ دنیا کی زندگی پر ہی نہ ریجھے رہیں۔ انہیں بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اجر و ثواب ملنے والا ہے وہ دنیا کے مال و متاع سے بڑھ کر ہے۔

جب آپ موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کا جمِّ غفیر اس بلند و بالا اور شاندار محل کے چاروں طرف جمع ہے۔ سب لوگ اس کے حسن و جمال سے متاثر، اس کی وسعت و کشادگی سے متحیّر، اس کی ظاہری آرائش و زیبائش سے مسحور اور اس کے فنّی شکوہ و جلال سے مبہوت ہو رہے ہیں۔ آپ نے مجمع کو اپنی طرف متوجّہ کیا اور اس کے درمیان میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

"دنیا کے خبیث ترین انسانوں میں سے خبیث ترین انسان نے جو عمارت تعمیر کی

ہے وہ ہم نے دیکھ لی، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ فرعون نے اس سے بھی زیادہ مضبوط عمارت بنائی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اس دنیا میں ہی ہلاک کر دیا اور اس کی تعمیر کردہ عمارت کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا۔ کاش حجّاج کو معلوم ہوتا کہ اہلِ آسمان نے اس کی دنیا سے رخصتی کا وقت مقرّر کر رکھا ہے اور کاش کہ اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ اہلِ ارض نے اس کو شدید دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

——— یہ تقریر کیا تھی الفاظ و خیالات کا ایک دریا تھا جو بے روک ٹوک بہتا چلا جا رہا تھا۔ حتّٰی کہ سامعین میں سے کسی کو حجّاج کے جذبۂ انتقام کے بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہوا اور اس نے اٹھ کر حضرت حسنؒ سے کہا "اے ابو سعید! بس کیجیے! یہی کچھ کافی ہے۔"

حضرت حسنؒ نے فرمایا "لوگو یقین جانو، اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے یہ عہد لیا ہوا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دینِ حق کو کھل کر بیان کریں گے اور اس میں سے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھیں گے میں تو بس اسی عہد کو پورا کر رہا ہوں۔"

دوسرے دن حجاج اپنے دربار میں داخل ہوا تو مارے غصّے کے پھٹا پڑ رہا تھا۔ اس نے حاضرین سے کہا:

"دور ہو جاؤ کم بختو! خدا تمہیں برباد کرے۔ بصرہ کا ایک ادنیٰ سا غلام اٹھتا ہے اور ہمارے بارے میں جو جی میں آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے اور تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اٹھ کر اس کی تردید کرے یا اس کا منہ بند کرے۔ بزدلو خدا کی قسم! میں تمہیں ضرور اس کا خون پلا کر چھوڑوں گا۔"

——— اس کے بعد اس نے تلوار اور چمڑے کا فرش (جس پر مجرم کا سر قلم کیا جاتا ہے) لانے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں دونوں چیزیں دربار میں حاضر کر دی گئیں۔ پھر جلّاد کو بلایا۔ جلّاد بھی آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے پولیس کے سپاہیوں کی طرف نگاہ اٹھائی اور حکم دیا:

حسنؒ بن یسار کو دربار میں حاضر کرو ۔ اس کی تعمیل کی گئی ۔ تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ حضرت حسنؒ دربار میں لائے گئے۔

سب کی نگاہیں ان پر مرکوز ہوگئیں ۔ مارے خوف کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ نہ جانے کیا سانحہ پیش آجائے ۔ حضرت حسنؒ کی نظر تلوار چمڑے کے فرش اور جلاد پر پڑی تو صورت حال کو بھانپ گئے ۔ آپ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور آپ سیدھے حجاج کے سامنے چلے گئے ۔ آپ کے چہرے پر ایک مردِ مومن کا جلال ، ایک مسلم حق گو کا سا رعب اور ایک داعیِ الی اللہ کا سا وقار تھا ۔

حجاج نے جو نگاہ اٹھا کر آپ کی طرف دیکھا تو اس پر زبردست ہیبت طاری ہوگئی اور اس کا سارا غیظ و غضب کافور ہوگیا ۔ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلا " آیئے ابوسعید یہاں تشریف رکھئے " یہ کہتے ہوئے وہ سمٹ کر آپ کے لئے جگہ بنا رہا تھا ۔

حاضرین حیرت و استعجاب کے عالم میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے ۔ حتیٰ کہ حجاج نے آپ کو اپنے قریب قالین پر بٹھالیا ۔

جب حضرت حسنؒ اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے تو حجاج نے آپ سے کچھ دینی مسائل پوچھنے شروع کر دیئے ۔

حضرت حسنؒ اپنے وسیع علم کی بدولت بڑی دل جمعی کے ساتھ جادو اثر انداز میں ہر سوال کا جواب دیتے جا رہے تھے ۔

حجاج کہتا جا رہا تھا " بے شک اے ابوسعید ! آپ تو سیّد العلماء ہیں ۔ اس کے بعد اس نے نہایت اعلیٰ درجے کا عطر منگوایا اور آپ کی داڑھی کو لگا کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا ۔

جب حضرت حسنؒ اس کے دربار سے باہر تشریف لائے تو حجاج کے دربان نے لپک کر آپ سے عرض کیا " اے ابوسعید ! حجاج نے آپ سے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس نے آپ

کو اس سے بالکل مختلف مقصد کے لئے بلایا تھا۔ جب آپ آگے بڑھے تھے تو میں آپ کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ آپ کی نظر تلوار اور چمڑے کے فرش پر پڑی تو آپ کے ہونٹوں پر کچھ حرکت ہوئی تھی۔ اس وقت آپ نے کیا کہا تھا؟

حضرت حسنؒ نے فرمایا "میں نے دعا کی تھی، اے میرے ولی نعمت! مصیبت میں میری جائے پناہ! حجّاج کے جذبۂ انتقام کو مجھ پر اسی طرح ٹھنڈا اور باعثِ سلامتی بنا دے جس طرح تو نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا اور باعثِ سلامتی بنایا تھا۔"[1]

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

مردِ مومن کا یقین اس کی زندگی ہی میں نکھار پیدا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی امید کی کرن دکھاتا ہے۔ جب لوگ مایوسی اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں تو مردِ مومن کا یقین ان کے حوصلے بڑھا کر ان کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح جنگل کی تاریک رات میں بھٹکے ہوئے مسافر کے لئے کسی راہب کا دیا بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح مردِ مومن کا یقین مایوسیوں کے شکار لوگوں کے لئے طمانیّت کا باعث بنتا ہے اور منزل کی طرف گامزن رہنے میں معاون ثابت ہوتا ہے

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

○

جرأت و قوت

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ اللہ کے نزدیک طاقتور مومن ضعیف مومن سے

---

[1] سیرتِ تابعین۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا ترجمہ محمد نصر اللہ خاں خازن۔

سے اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دینِ حق کو غالب کرنے کا جو کام امّتِ مسلمہ کے ذمّہ لگا رکھا ہے اس کے لئے عزم و ہمّت اور جرأت و قوّت کی ضرورت ہے۔ مومن اس فریضے سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے اندر اخلاقی اور روحانی قوّت کے علاوہ جسمانی قوّت بھی رکھتا ہو۔ اس میں عزم و حوصلہ کے ساتھ مصائب و آلام برداشت کرنے کی طاقت ہو۔ اس راہ میں بڑی کٹھن گھاٹیوں اور مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کا راز کمزوری اور ناتوانی میں نہیں بلکہ زورِ بازو اور جرأت و قوّت میں ہے۔ کمزور آدمی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ہمّت ہار بیٹھتا ہے۔

منزلِ مراد انہیں لوگوں کا مقدّر بنتی ہے جو اس کے لئے انتھک محنت اور لگن سے جدوجہد کرتے ہیں اور ہر مرحلے پر جرأت و قوّت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ نے مطالبہ کیا کہ "اگر آپ مجھے کشتی میں پچھاڑ دیں تو میں اسلام قبول کر لوں گا" چنانچہ آپؐ نے اس سے کشتی لڑی اور تین مرتبہ اسے پچھاڑ دیا۔

آپؐ اکثر اوقات صحابہ کرامؓ میں گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے تاکہ جسمانی مشقّت سے وہ توانا اور مضبوط ہوں اور باطل پر ان کا رعب طاری ہو۔

مسلمان مدینے سے عمرہ کرنے کے لئے مکّے آئے، کفّار نے مسلمانوں کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا تو کہا مسلمان مدینے جا کر کمزور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکّروں میں دایاں بازو ننگا کر کے ذرا اکڑ اکڑ کر اور دوڑ کر چکّر لگائیں تاکہ کفّار کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور انہیں معلوم ہو کہ مسلمان اپنے اندر جان رکھتے ہیں۔

تُرا یک نکتۂ سربستہ گویم،
اگر درسِ حیات از من بگیری

بمیری گر بہ تن جانے نداری
وگر جانے بہ تن داری نہ میری

اگر تو زندگی کا سبق مجھ سے حاصل کرے تو میں تجھ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ اگر تو جسم میں جان (قوّت) نہیں رکھتا تو تُو مر جاتا ہے۔ اگر تیرے جسم میں جان (قوّت) ہو تو تُو نہیں مرتا۔

انسان روح اور جسم کا مرکب ہے۔ جسمانی قوّت کے ساتھ ساتھ روحانی قوّت بھی لازمی ہے۔ حوصلہ اور ہمت نہ ہو تو جسمانی قوّت بے کار ہے۔ انسان کا دل مردہ ہو جائے، ایمان کی حرارت باقی نہ رہے، شوقِ شہادت ختم ہو جائے، مقصد کی خاطر مَر مٹنے کا جذبہ سرد پڑ جائے تو مادی اور جسمانی قوّتیں بھی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

مشہور مقولہ ہے کہ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ پہلے ان اصولوں پر عمل کیا جائے جو اس نے غیبی مدد کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ اپنے اندر ایمانی قوّت پیدا کریں۔ مومن کی جن صفات کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان صفات سے اپنے آپ کو متّصف کریں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے سچے اور پکّے مسلمان بنیں پھر ہم اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق اور امیدوار ہو سکتے ہیں۔

اگر روح مردہ ہو گئی ہو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے دل زنگ آلود ہو گیا ہو، اس میں موت کا خوف سما گیا ہو، حق کی خاطر جہاد کرنے کا ولولہ ختم ہو چکا ہو تو ایسے بے روح جسم کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں آتی، اس کی مدد ان لوگوں کے لئے آتی ہے جو اپنے اندر جان پیدا کرتے ہیں۔

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

حوصلے اور ہمت کا تعلق دل سے ہوتا ہے ۔ دل بیدار ہو تو وہ جوش اور جذبے سے لبریز ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اس میں باطل قوتوں کا دندان شکن جواب دینے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اگر دل ہی غافل ہو تو مصنوعی دلیری کام نہیں آتی۔ بیدار دل ہی سے جرأت اور حوصلے میں شدت پیدا ہوتی ہے اور انسان کی ضرب کاری ہو جاتی ہے ۔ مردہ دلی کے ساتھ کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا جاسکتا ؎

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

جب کسی قوم کے افراد پر مردہ دلی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو وہ زوال کا شکار ہو کر ذلت کی پستیوں میں جا گرتی ہے۔ کارگاہِ حیات میں وہی لوگ سرخرو ہوتے ہیں جو اپنے دلوں میں جذبات کا ایک سمندر موجزن رکھتے ہیں اور بحرِ حیات کی موجوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔ جو لوگ پُرسکون زندگی کے عادی ہو جائیں اور ساحلِ سمندر سے ہی سمندر کا نظارہ کرنے میں لطف محسوس کریں، سمندر میں اتر کر موجوں کا مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں رہتا۔ جو لوگ مگرمچھ کو دیکھ کر ہی زرد پڑ جائیں، جنہیں کبھی کسی طوفان اور کنارے کی خرابی سے واسطہ نہ پڑا ہو وہ سمندر کی لہروں کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ایسے حالات کا مقابلہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں بلند آرزوؤں اور جذبات کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور وہ کسی آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے سے تیار ہوں ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پُرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ

مردِ مومن کمزوروں، ضعیفوں اور بے کسوں کا سہارا ہوتا ہے۔ مسلمان دنیا سے

ظلم و جور کا خاتمہ کر کے عدل و انصاف قائم کرتا ہے، اپنے مسلمان بھائی کی عزت اور جان و مال کا محافظ ہوتا ہے۔ ان امور کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھتا ہے۔ کمزوری کسی فرد میں ہو یا قوم میں اس کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ جو قوم اپنی قوت میں مسلسل اضافہ نہیں کرتی اس کی سلامتی ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ کوئی قوم دوسروں کے سہارے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ کمزور قومیں ہمیشہ محکوم اور طاقتور ہمیشہ حکمران رہیں۔ مسلمانوں نے جب ایمانی اور اخلاقی قوت کے ساتھ ساتھ دلیری اور بہادری میں دوسری قوموں پر فوقیت حاصل کر لی تو دنیا پر حکمرانی کرتے رہے لیکن جب ان میں کمزوری واقع ہو گئی تو وہ اس منصب سے محروم ہو گئے۔ قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ کمزور پر ہمیشہ موت کی تلوار لٹکتی رہتی ہے جبکہ طاقت ور سے سب لوگ خائف رہتے ہیں ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مسلمان حق و صداقت کا علم بلند رکھنے کے لئے جہاد کرتا ہے اور اس غرض کے لئے ہر طرح کی قوت فراہم کرتا ہے۔ جو شخص اپنی حفاظت پر ہی قادر نہ ہو وہ دوسروں کو ظلم و جور سے کیا نجات دلا سکتا ہے۔ مجاہد دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ پرانے نظام کو درہم برہم کر کے نئے نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ باطل نظریات کی تقلید کرنے کی بجائے انہیں ختم کر کے اسلامی نظریۂ حیات کی اساس پر نیا جہان تعمیر کرتا ہے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار!
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

ہمت اور جرأت کی ضرورت کمزور و ناتواں اور بے وسائل لوگوں کو ہی نہیں امیروں، وزیروں بادشاہوں اور فقیروں سب کو ہوتی ہے۔ اگر کسی کے پاس اسلحہ کے انبار ہوں لیکن انہیں استعمال کرنے کی جرأت نہ ہو تو وہ بے کار ہیں اور اگر نہتے آدمی جرأت مند ہوں تو ان کے ہاتھ ہی ان کے ہتھیار بن جاتے ہیں۔ دنیا میں بزدل اور کم ہمت آدمیوں نے کبھی کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ جہاں جرأت و جسارت کی ضرورت ہو وہاں نہ دولت اور اسلحہ کام آتا ہے نہ منصب اور عہدے سے کام چلتا ہے۔ ہمت اور دلیری ہو تو ان کے بغیر بھی بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنا ہو تو کوئی نہ کوئی خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ خطرات سے دور بھاگنے والا انسان کبھی جرأت سے کام نہیں لے سکتا۔ کوئی امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا وزیر جب تک بے باکانہ جرأت نہ دکھائے کوئی اہم کام نہیں کرسکتا ؎

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ!

○

سخت کوشی

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ○

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھانے کے بعد بیان کیا ہے۔ اس سے اس حقیقت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد عبادت اور فریضہ نیابتِ الٰہی ہے۔ انسان یہاں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ایک ایسا اہم فریضہ انجام دینے کے لئے آیا ہے جس کے لئے

سخت محنت اور مشقت کی ضرورت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو شروع ہی سے سخت کوشی اور مشقت طلبی کا عادی بناتا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں ماں کے پیٹ میں اپنا وجود بننے سے لے کر آخری سانس تک تکلیف، مشقت اور خطرات کے کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ وہ پیدا ہی بے بسی کے عالم میں ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت اسے کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو وہ چند ساعتیں بھی اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چلنے کے قابل ہوتا ہے تو قدم قدم پر گرتا ہے اور چوٹیں کھاتا ہے۔ جوانی سے بڑھاپے تک قسم قسم کے ایسے خطرناک حالات سے دوچار ہوتا ہے جن کا مقابلہ کرنے کے لئے سخت محنت، جرأت اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی کیسا ہی امیر بادشاہ کیوں نہ ہو اسے بھی یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کسی وقت اس کی سلطنت میں کہیں بغاوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ کوئی قارون جتنی دولت کا مالک بن جائے تو اسے بھی یہ غم لاحق رہتا ہے کہ اس کی دولت کسی اچانک حادثے میں ضائع نہ ہو جائے۔ وہ اس کی حفاظت کے لئے مختلف جتن کرتا ہے لیکن پھر بھی اسے ایک پل چین نصیب نہیں ہوتا۔ کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اتنا سخت جان اور مضبوط بناتا ہے کہ کوئی اسے ترنوالہ سمجھ کر اس کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈال دے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے کئی مثالیں بیان کی ہیں اور مسلمان کو سخت کوش بننے کی تلقین کی ہے۔

کہتے ہیں ایک دفعہ ایک پرندے کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں سانس بھی دھوئیں کی ایک لہر بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک باغ میں ہیرے کا ایک ٹکڑا دیکھا۔ پرندے نے اس پتھر کی چمک دمک کی بنا پر اسے پانی خیال کیا اور اس کی طرف لپکا۔ اس پر ایک چونچ ماری لیکن اس کا حلق تر نہ ہوا۔ الماس نے کہا "میں نہ تو پانی کا قطرہ ہوں اور نہ دوسروں کے لئے باقی ہوں۔ تو مجھے تکلیف دینے کا قصد کر کے اپنی دیوانگی کا ثبوت دے رہا ہے اور اپنی زندگی سے بیزار معلوم ہوتا ہے۔ میرا پانی پرندوں کی چونچیں توڑ دیتا ہے اور انسان کو اس کی زندگی کے جوہر سے محروم کر دیتا ہے"۔ پرندہ وہاں سے اڑا۔ اسے پھول پر شبنم کا ایک قطرہ نظر آیا جو اتنا

کمزور تھا کہ سورج کے خوف سے پہلے ہی کانپ رہا تھا۔ پرندے نے شبنم کا قطرہ اپنے حلق میں اتارا اور اپنی پیاس بجھالی۔ قطرۂ شبنم کو اپنی زندگی سے اس لئے ہاتھ دھونے پڑے کہ اس نے اپنے اندر الماس کی طرح سخت جانی اور سخت کوشی کی صفات پیدا نہیں کی تھیں ؎

غافل از حفظِ خودی یکدم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو

اپنی خودی کی حفاظت سے ایک دم بھی غافل نہ ہو۔ الماس کا ٹکڑا بن اور شبنم نہ بن۔

ایک دن ایک کوئلے نے ایک الماس سے کہا "میرے دوست! ہم دونوں کی اصل ایک ہے۔ ہم مدّت سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ میں بے بسی اور بے کسی کے عالم میں موت کے منہ میں چلا جاتا ہوں جبکہ تیری رسائی بادشاہوں کے تاج تک ہو جاتی ہے۔ تیرے پہلو سے ہر وقت جلوے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ تو کبھی بادشاہ کی آنکھوں کا نور بنتا ہے تو کبھی خنجر کے دستے کو زینت بخشتا ہے۔" الماس نے کہا "اے دانا دوست! سیاہ مٹی پختہ ہو جائے تو وہ نگینہ بن جاتی ہے۔ تو اپنے آپ سے جنگ کر اور لڑائی کے ذریعے پتھر کی طرح سخت ہو جا۔ میرا جسم صرف پختگی کی وجہ سے منوّر ہوا ہے اور میرا سینہ اسی سختی کی وجہ سے جلوؤں سے معمور ہے تو اپنی نرمی اور خام وجود کی وجہ سے رسوا ہے اور اسی نازک اندامی کی وجہ سے جلتا ہے۔ حجرِ اسود کی اصل ایک مٹھی خاک ہے لیکن اس کی سختی کی وجہ سے اس کا مرتبہ طُور سے بھی بالاتر ہے۔ اسے سرخ و سیاہ سب بوسہ دیتے ہیں ؎

می شود از وے دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
در صلابت آبروئے زندگی ست
ناتوانی ناکسی ناپختگی ست

جو شخص سخت کوش اور سخت گیر بن جاتا ہے اس سے دونوں عالم منوّر ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی آبرو سخت کوشی میں ہے۔ ناپختگی کمزوری اور بے بسی کا باعث ہے ۔

ناپختہ اور کمزور آدمی بے چارگی اور بے کسی کے عالم میں زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ہر شخص اسے ترنوالہ سمجھتا ہے۔ اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیجاتی۔ اس کی دنیا میں کوئی عزّت نہیں ہوتی! اگر کچھ دیر کے لئے وہ دوسروں کے سہارے اپنی قدر و منزلت بناتا ہے تو وہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہے۔ دنیا میں باعزّت اور باوقار زندگی ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ جو اپنے اندر پختگی اور سختی پیدا کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کے محتاج نہیں ہوتے ۔

خام ہے جب تک کہ ہے مٹی کا اِک انبار تو
پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

یہ دنیا ایک رزم گاہ ہے ۔ اور رزم گاہ میں قوّتِ بازو اور اسلحہ کام آتا ہے ۔ ساز و آواز سے کام نہیں چلتا ۔ زندہ رہنے کے لئے اپنے آپ کو سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنانا پڑتا ہے۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمّت اور قوّت فراہم کرنی پڑتی ہے ۔ پتھروں میں رہتے ہوئے شیشہ بن کر زندگی گزارنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دنیا میں زورِ دست اور کاری ضرب رکھنے والے ہی غالب رہتے ہیں ۔ ساز و آواز سے دل بہلانے والے ہمیشہ مغلوب ہو کر بے بسی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

بظاہر آرام طلبی اور عیش کوشی کی نسبت سختی اور سخت کوشی کی صفات مشکل نظر آتی ہیں لیکن ایک بار جو شخص اپنے آپ کو اس معیار کے مطابق ڈھال لیتا ہے پھر اس کے

لئے اس سے کم تر ہو کر زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے بڑی بڑی مہمات سر کرنے اور سخت کام کرنے میں ہی لُطف محسوس ہوتا ہے۔ پتھر پھاڑنے والوں کے لئے شیشہ سازی کے فن میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ انہیں صرف اسی سامان سے محبّت ہوتی ہے جو زندگی کی سختیوں میں ان کا ساتھ دے سکے۔ عیش و عشرت کے سامان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ؎

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو!!
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

کارگاہِ حیات میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے سخت کوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عیش و عشرت اور آرام طلبی کی خواہش انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ راگ اور رنگ پر مرنے والوں میں سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ مومن اپنے اندر شاہ بازوں کی سی صفات پیدا کرتا ہے وہ بلبل اور مور کی تقلید میں خوش آواز اور خوبصورت بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ خوش گلو اور نازک اندام بننے کی بجائے اپنے آپ کو سختیاں برداشت کرنے کیلئے تیار کرتا ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ!!
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

سختیاں انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہیں۔ سخت اور مخدوش حالات میں انسان اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرتا اور آئندہ زندگی میں اس سے زیادہ سختیاں برداشت کرنے کے تیّار ہوتا ہے۔ سونا آگ کی بھٹی میں سے گزر کر ہی کندن بنتا ہے ؎

پئے شاہبازاں بساط است سنگ
کہ بر سنگ رفتن کند تیز چنگ!

شاہبازوں کے لئے پتھر بھی قالین ہوتے ہیں۔ پتھر پر چلنے سے ان کے پنجے تیز ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک نوجوان حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میری مثال پتھروں کے درمیان شیشے کی سی ہے۔ میری زندگی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ مجھے دشمنوں کے درمیان رہ کر زندگی گزارنے کا طریقہ بتایئے۔ کوئی اور ہوتا تو کہہ دیتا کہ بس اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ پڑھا کرو، دشمنوں کے شر سے محفوظ رہو گے۔ اگرچہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعا بھی مسنون ہے لیکن دعا کا مرحلہ حفاظتی تدابیر اختیار کرنے اور اپنی طرف سے مکمل کوشش کرنے کے بعد آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر میں صحابہ کرامؓ کو میدانِ جنگ میں صف بستہ کرنے کے بعد دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ یہ تین سو تیرہ تیری راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے حاضر ہیں۔ اگر آج انہیں شکست ہو گئی تو تیرا نام لیوا دنیا میں کوئی نہ رہے گا۔ اس لئے ان کی مدد فرما ـــــ حضرت علی ہجویری تو دانائے راز تھے۔ وہ دین کی رمز کو پہچانتے تھے اس لئے انہوں نے نوجوان کی بات سنی اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ تو زندگی کے راز سے ناواقف اور اس کے آغاز و انجام سے غافل ہے۔ تو اپنی خوابیدہ قوت کو بیدار کر اور دشمنوں کے خوف سے آزاد ہو جا۔ جب پتھر اپنے آپ کو شیشہ سمجھ لیتا ہے تو ٹوٹنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اگر مسافر اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگے تو وہ رہزنوں کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تو اپنے آپ کو فقط پانی اور مٹی کب تک سمجھتا رہے گا۔ اپنی مٹی سے شعلۂ طور پیدا کر۔ دوستوں سے ناراض ہونا اور دشمنوں کی شکایت کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باہمت انسان کے لیے دشمن کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے انسان کو اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے

وہ دشمن کے شر سے بچنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے۔ اس سے اس کی ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قوی اور مضبوط بناتا ہے، اس طرح اس کی جسمانی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ دشمنوں کی موجودگی میں غافل ہو کر زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ ہر لمحے ہوشیار رہتا ہے۔ اس طرح دشمن کی وجہ سے زندگی کے اصل راز کو پالیتا ہے۔ بلند ہمت رکھنے والوں کی تلواروں کے لئے راستے کے پتھر بھی سان بن جاتے ہیں۔ سیلاب کے لئے پست و بلند یکساں ہوتے ہیں۔ حیوانوں کی طرح کھانا اور سونا کوئی زندگی نہیں ہے۔ اپنے آپ کو پہچان اور خود کو مضبوط اور توانا بنا۔ ہمّت اور طاقت پیدا کر۔ اس سے تو زمانے کو درہم برہم کر سکتا ہے اور دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ یہی رازِ بقائے زندگی ہے ؎

راست می گویم عدو ہم یارِ تُست
ہستیٔ او رونقِ بازارِ تُست
ہر کہ دانائے مقامِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است
کشتِ انساں را عدو باشد سحاب
ممکناتش را بہ انگیزد ز خواب!
سنگِ رہ آب است اگر ہمّت قوی ست
سیل را پست و بلند و جادہ چیست
مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود
گر نبود محکم نہ بودن چہ سود!

میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ دشمن بھی تیرا دوست ہے۔ اس کی زندگی تیرے بازار کی رونق ہے۔ جو شخص خودی کے مقام سے آگاہ ہے، اس کا دشمن اگر طاقتور ہو تو وہ

اسے اللہ کا فضل سمجھتا ہے۔ دشمن انسان کی کھیتی کے لئے بادل کی مانند ہے۔ وہ اس کی تمام ممکنہ صلاحیتوں کو خواب سے بیدار کرتا ہے۔ اگر ہمت قوی ہو تو راستے کا پتھر پانی بن جاتا ہے۔ سیلاب کے لئے راستے کی بلندی اور پستی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حیوان کی مانند کھانے اور آرام کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر تو اپنے آپ میں مضبوط اور محکم نہیں تو زندگی کا کچھ فائدہ نہیں۔

دین کے راستے میں مسلمان کو سخت آزمائشوں اور امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان آزمائشوں پر پورا اترنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو محنت و مشقت، سخت کوشی اور مصائب و تکالیف برداشت کرنے کا عادی بنائے۔ جب انسان اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، اسی کی رضا کے لئے جیتا اور مرتا ہے اور تمام کام اسی کی رضا کے لئے کرتا ہے تو راستے کی تمام مشکلات آسان نظر آنے لگتی ہیں اور اس کے دل میں غیر اللہ کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا ؎

در رہِ دیں سخت چوں الماس زی
دل بحق بر بند و بے وسواس زی

دین کے راستے میں الماس کی طرح سخت ہو کر زندگی بسر کر۔ دل کو حق کے ساتھ وابستہ کر اور کسی اندیشے کے بغیر زندہ رہ۔

جو شخص نفسانی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے اس کی مثال سمندر کی سطح پر تیرنے والے اس تنکے کی سی ہوتی ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سمندر میں اٹھنے والی ہر لہر اسے اپنے ساتھ بہائے لئے پھرتی ہے۔ برخلاف اس کے جو شخص ان خواہشات پر قابو پا لیتا ہے وہ عزم و ہمت کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ مخالفتوں کے طوفان اس کے ساتھ آ کر ٹکراتے ہیں اور منتشر ہو جاتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ پہ قائم رہتا ہے اور اپنے مقصد سے ذرہ بھر پیچھے نہیں ہٹتا ؎

زیستن تا کے بہ بحر اندر چوں خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

تو سمندر میں کب تک تنکے کی طرح زندگی بسر کرے گا۔ خواہشات پر قابو پا کر پہاڑ کی طرح سخت بن جا۔

دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنے کیلئے سخت محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ مشکلات اور مصائب سے گھبراتے ہیں وہ کبھی بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتے پھول حاصل کرنے کے لئے کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ عقیق ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نگینہ بنتا ہے۔ کوئی فرد، جماعت یا قوم اپنے مقصد میں اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ مشکلات اور مصائب میں ثابت قدمی دکھاتی ہے اور اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کا اہل ثابت کرتی ہے ؎

تمنّا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں۔!
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنیکی خو کرلے

جو شخص کمزور و ناتواں ہو وہ دوسروں کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ دین کی حفاظت اور اشاعت کا کام امتِ مسلمہ کے ذمّے ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو اس مقصد کے لئے سخت جان بننا چاہیئے۔ اگر کانٹے میں ریشم جیسی نرمی آجائے تو وہ پھول کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ مسلمان بھی دین کی حفاظت کے فرض سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود مضبوط اور سخت ہو۔ قرآن پاک نے مومنوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ آپس میں نرم خو ہوتے ہیں لیکن کفار کے مقابلے میں سخت ہوتے ہیں ؎

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

○

خطر پسندی

قرآن پاک کے ایک فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ جنگ کے دوران اگر دشمن ذلیل و خوار ہو کر صلح پر آمادہ ہو اور محکوم و مطیع ہو کر زندگی بسر کرنے پر رضامند ہو جائے تو اس سے صلح کر لو۔ ایسے دشمن پر دوبارہ اس وقت تک لشکر کشی حرام ہے جب تک وہ سرکشی اور بغاوت کا رویہ اختیار نہ کرے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں: جانتے ہو اس فرمان کا راز کیا ہے! راز یہ ہے کہ خطرات میں گھرے ہوئے رہنا اصل زندگی ہے۔ اس طرح دشمن وقتی طور پر اطاعت قبول کر لے گا۔ لیکن مسلمانوں کو اس سے ہر وقت ہوشیار رہنا پڑے گا۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہیگا کہ دشمن طاقت اور قوت حاصل کر کے دوبارہ باغی نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ اپنی قوت مجتمع رکھیں گے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ اگر انہیں کسی طرف سے خطرہ باقی نہ رہے تو وہ آسودہ، آرام طلب اور غافل ہو جائیں گے۔ باطل قوتیں سر اٹھائیں گی اور مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔ اللہ تعالیٰ کا منشا تو اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہوں اور ہر وقت خبردار رہیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں کچھ خطرات درپیش ہوں اور دل میں ان کا احساس موجود ہو ؎

سرِّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست؟
زیستن اندر خطرہا زندگیست!

تو جانتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے اس فرمان کا راز کیا ہے! خطرات میں رہ کر جینا اصل زندگی ہے۔

جو لوگ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں وہ غار و کوہ میں سکون تلاش نہیں کرتے بلکہ خطرات میں گھرے ہوئے رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ انہیں ایسی زندگی میں کوئی لطف محسوس

نہیں ہوتا جس میں کوئی خطرہ نہ ہو ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جسکی گھات میں نہ ہو صیاد

پُرامن زندگی ہر شخص پسند کرتا ہے لیکن پُرخطر زندگی صرف مجاہد کو محبوب ہوتی ہے ۔ اسے خطرات کا مقابلہ کرنے ہی میں سکون ملتا ہے ۔ وہ کسی آسان راستے پر چلنے کی بجائے مشکل راستوں پر چلنا پسند کرتا ہے ۔ وہ دانستہ طور پر اپنے لیے پُرخطر راستے کا انتخاب کرتا ہے اور ایسا راستہ اسے منزل سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے ؎

من نہ رانم کشتیٔ خویش
بہ دریائے کہ موجش بے نہنگ است

میں اس دریا میں کشتی ہی نہیں چلاتا جس کی لہریں مگرمچھوں سے خالی ہوں ۔

ایک دفعہ ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے دردِ دل کہتے ہوئے بیان کیا کہ میں تو اب حرم میں اپنا مسکن بنانا چاہتا ہوں ۔ صحرا کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے ۔ ہر وقت شکاری کا کھٹکا لگا رہتا ہے ۔ نہ ہمیں صبح چین میسّر آتا ہے نہ شام ۔ حرم کعبہ میں چونکہ شکار اور قتل و غارت حرام ہے اس لئے وہاں امن اور چین سے زندگی بسر کروں گا ۔ اس کے دوست نے کہا اے دانا دوست ! اگر تو زندگی چاہتا ہے تو خطرے میں زندگی بسر کر ۔ خطرے ہی سے اپنی طاقت و قوت کا امتحان ہوتا ہے اور خطرہ ہی جسم و جان کی توانائیوں کے لئے کسوٹی ہے ؎

رفیقش گفت اے یارِ خردمند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است !

اس کے ساتھی نے کہا اے دانا دوست ! اگر تو زندگی چاہتا ہے تو خطرے میں زندگی

بسر کر خطرہ طاقت و قوّت کے لئے امتحان ہے اور جسم و جان کی توانائیوں کے لئے کسوٹی ہے ـــــ !!!

○

عزم و توکّل

قرآن پاک میں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ

جب کسی معاملے میں مصمّم ارادہ کر لو تو اللہ تعالیٰ پر توکّل کرو .

بظاہر یہ خطاب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہے لیکن اصل میں اس کے مخاطب تمام مسلمان ہیں۔ جب کسی نیک کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ عملی اقدام میں تاخیر سے شیطان کو موقع مل جاتا ہے اور وہ انسان کے دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا کر کے اسے اس کی تکمیل سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اہل عزم و ہمّت کا ہمیشہ سے یہ وتیرہ رہا ہے کہ وہ جس چیز کو حق سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں اسے انجام تک پہنچانے کے لئے پوری جد و جہد کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں ۔ ارادے باندھنا اور توڑ دینا پختہ کردار کی علامت نہیں ہے ۔ مومن کا ارادہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ وہ خطرات سے گھبرا کر اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ بلکہ اگر اس کے عزم کی راہ میں ساری دنیا بھی حائل ہو جائے تو وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اسے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد جاری رکھتا ہے

دنیا میں لوگ مختلف چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کوئی اپنے مال پر بھروسہ کرتا ہے، کوئی اپنے رشتہ داروں اور دوستوں پر بھروسہ کرتا ہے، کسی کو اپنی قوّتِ بازو پر بھروسہ ہوتا ہے۔

لیکن مومن کا توکل اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ :

جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر کامل توکل سے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ حضرت عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کا دل ہر وادی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ جو شخص وادیوں میں بھٹکنے کے لیے اپنے دل کو چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا نہیں ہوگی کہ اسے کون سی وادی تباہ کرتی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کو ان وادیوں اور راستوں میں بھٹکنے اور تباہ ہونے سے بچائے گا۔

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر نہ دارد ایں دو جوہر کافر است

مومن عزم و توکل سے غالب ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ دو صفات نہیں رکھتا تو کافر ہے۔

○

ذوقِ تحقیق و تجسس

علامہ اقبال فرماتے ہیں قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان میں کتاب یعنی قرآن پاک اور حکمت کی تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے امتِ مسلمہ کا ساز و سامان یہی دو چیزیں ہیں۔ مردِ مومن ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ قرآن پاک کے ذریعے ذوق و شوق کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اور حکمت کے ذریعے اشیاء کی ماہیت معلوم کر کے نظامِ عالم کو مسخر کرتا اور نئے جہان کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے تحقیق و تجسس کو ترک کر کے تقلید کی روش اختیار کر لی ہے اور غیر مسلموں نے اسے اختیار کر کے دنیا کی قیادت

سنبھال لی ہے۔ حالانکہ علم وحکمت کا موتی ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں بلکہ انہوں نے اسے مسلمانوں سے حاصل کیا ہے۔ مسلمان جب یورپ میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں علم وحکمت کی بنیاد رکھی۔ اہلِ یورپ نے اسے اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کیں اور مسلمان اسے ترک کر کے ان کے دست نگر بن گئے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اسے دوبارہ حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کریں ؎

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد
علم وحکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست
باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست

جب عرب یورپ میں وارد ہوئے تو انہوں نے علم وحکمت کی نئی بنیاد رکھی۔ ان صحرا نشینوں نے دانہ کاشت کیا اور اس کا فائدہ فرنگیوں نے اٹھایا۔ یہ پری (علم وحکمت) ہمارے اسلاف کے شیشے کی ہے اس کا دوبارہ شکار کر کہ وہ ہمارے ہی "قاف" سے ہے۔

قرآن پاک میں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ..... الخ کہہ کر کئی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انسان کی توجہ اس طرف دلائی گئی ہے کہ وہ حیوانات، جمادات اور زمین و آسمان پر غور کرے اور اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے۔ یہ آیات حقیقت میں علم وحکمت کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ مردِ مومن جب اشیا کا علم حاصل کرتا ہے تو وہ پہلے سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا بن جاتا ہے اور اپنے علم کو نوعِ انسانی کی فلاح کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن یہی علم غیر مسلموں کے ہاتھ آتا ہے تو اس کی تاثیر بدل جاتی ہے۔ ان کی عقل خوب وزشت سے عاری ہو جاتی ہے۔ ان کی آنکھ بے نم اور دل اینٹ اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ علم ان کے ہاتھ میں تلوار کی طرح ہوتا ہے اور

وہ اسے نوعِ انسانی کی ہلاکت کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے۔ مردِ مومن کا فرض ہے وہ غیر مسلموں سے اس تلوار کو چھینے۔ خود تحقیق و تجسس سے کام لے۔ جدید علوم و فنون میں مہارت حاصل کر کے نئی نئی دریافتیں اور ایجادات کرے تاکہ انہیں دنیا میں عدل و انصاف کی حکومت اور امن قائم کرنے کے لئے استعمال کر سکے ؎

علمِ حق را ساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند
ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر
تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر

انہوں نے علم حق کو جادوگری سکھادی۔ جادوگری ہی نہیں بلکہ کافری سکھادی (یعنی علم و حکمت کے ہتھیار کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق استعمال کرنے کی بجائے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے استعمال کیا) جس کی وجہ سے ہر طرف فتنے اور فساد ہجوم کئے آ رہے ہیں۔ اس تلوار کو رہزن کے ہاتھ سے پکڑ لے یعنی تحقیق و تجسس کو اپنا شعار بنا کر سائنسی علوم میں خود مشتقی

مردِ مومن دنیا میں غلامی کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر حریت و مساوات کا پیغام دینے کے لئے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت و سلطنت کا کام چلانا عین تقاضائے ایمان ہے۔ مردِ مومن کا فرض ہے کہ وہ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے جد و جہد کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ جدید دور میں اس تقاضے کو بطریق احسن پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنسی علوم میں برتری حاصل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی جن چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے، ان میں مزید تحقیق کر کے اس علم کو انسان کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے اور دنیا میں نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم کیا جائے تاکہ انسان انسان کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے سکھ کا سانس لے۔

ولایت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

مردِ مومن کی بعض دیگر صفات

مومن زندگی کے ہر لمحے ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور کبھی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ کارزار میں برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ کبھی قلم سے جہاد کر رہا ہوتا ہے اور کبھی زبان سے یہی فریضہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی وہ اللہ کی راہ میں مال نثار کر رہا ہوتا ہے اور کبھی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ کبھی قرآنِ پاک کی تلاوت سے دل کا زنگار دور کر رہا ہوتا ہے اور کبھی میدانِ جہاد میں نعرۂ تکبیر بلند کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی بے کسوں، بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کی خبر گیری میں مصروف ہوتا ہے۔ اور کبھی بیماروں کی عیادت کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی وہ کسی برائی کو مٹانے کے لئے مرنے مارنے پر تُلا کھڑا ہوتا ہے۔ اور کبھی کسی نیکی کے کام میں دوسروں کا ہاتھ بٹا رہا ہوتا ہے۔ کبھی وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے اور کبھی باطل کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کی تدبیریں کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی خوشی میں اسے مبارک باد دے کر اس کی خوشی میں شریک ہو رہا ہوتا ہے اور کبھی کسی جنازے کو کندھا دے کر فرضِ کفایہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی وہ رزقِ حلال کمانے کے لئے تگ و دو کر رہا ہوتا ہے اور کبھی اسے دونوں ہاتھوں سے اللہ کی راہ میں لٹا رہا ہوتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی سے تعلق بڑھا رہا ہوتا ہے اور کبھی اس کی

خاطر کسی سے دور ہو رہا ہوتا ہے ۔ کبھی اس کی آواز حکومت کے ایوانوں میں گونج رہی ہوتی ہے اور کبھی قَد قامَتِ الصَّلوٰۃ کے دل نشیں الفاظ اس کی زباں سے ادا ہو رہے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خود دوسروں کے حقوق ادا کر رہا ہوتا ہے اور کبھی وہ حقوق سے محروم لوگوں کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا ہے۔ الغرض اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بسر ہوتا ہے ۔ اس طرح وہ گفتار اور کردار میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل بن جاتا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

مومن طاغوتی طاقتوں کے لئے قہر الٰہی بن جاتا ہے ۔ وہ کسی غلط کام میں باطل سے مصالحت پر آمادہ نہیں ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم توڑنے والوں کے لئے سخت ہوتا ہے، کسی برائی کو دیکھ کر غضب ناک ہو جاتا ہے اور اسے مٹانے کے لئے اپنی قوت صرف کرتا ہے ۔ حق پر مضبوطی کے ساتھ جما رہتا ہے اور باطل کو مٹانے کے لئے اس کے دل میں جو جذبہ ہوتا ہے وہ کبھی سرد نہیں ہوتا ۔

مومن کو کسی سے تکلیف پہنچتی ہے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کی راہ میں ہر مصیبت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ ہر قسم کی مشکلات پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے وہ کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ مسلمان بھائیوں کے لئے اس کا دل شیشے کی طرح صاف ہوتا ہے۔ جتنا وہ باطل کے لئے سخت ہوتا ہے ، اپنے مسلمان بھائیوں کیلئے اتنا ہی نرم ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے عذر قبول کرتا ہے اور انہیں کسی موقع پر شرمندہ نہیں کرتا۔

مومن کا کردار بے داغ ہوتا ہے ۔ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ وہ عالی ظرف ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ پاکیزہ ہوتی ہے۔ وہ کسی کا حق غصب نہیں کرتا۔ ہر معاملے میں دیانت و امانت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ صدق و صفائی کا پیکر

ہوتا ہے، کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کی پوری زندگی پاکیزگی اور طہارت کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔

مومن کے دل میں نورِ ایمان کی دولت ہوتی ہے اور یہ دولت ایسی ہوتی ہے کہ دنیا کے تمام خزانے اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس لئے مومن اپنے آپ کو کفار سے ہمیشہ اعلیٰ اور برتر سمجھتا ہے۔ وہ دوسرے مسلمانوں کو اپنے آپ سے بہتر اور کافروں کو کمتر سمجھتا ہے۔ کافروں کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتا اور ان پر اپنا دبدبہ قائم رکھتا ہے ؎

قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

کافر کا مقصود یہی دنیا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ساری تگ و دو دنیا کی خاطر ہوتی ہے۔ وہ دنیا طلبی میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کو آفاق میں گم کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جس طریقے سے بھی مال ملے حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عیش کوشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے مردِ مومن کی زندگی کا مقصد دنیا نہیں بلکہ آخرت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو ایک حقیر متاع سمجھتا ہے۔ وہ وہی کام کرتا ہے جس سے اسے اپنی آخرت سنوارنے میں مدد مل سکے۔ وہ دنیا میں ایک مسافر کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اس میں اتنا مگن نہیں ہو جاتا کہ اپنے اصل مقصد کو بھول جائے۔ اس کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی میں بسر ہوتا ہے۔ مومن کی شان نرالی ہوتی ہے۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بے نیاز مالک کا بندہ ہوتا ہے — وہ اپنے آپ کو صرف خدا کا محتاج سمجھتا ہے۔ اس لئے دنیا کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی نظر بلندیوں پر ہوتی ہے۔ اس لئے دنیا کی پستیاں اس کے وجود میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کی زندگی میں دنیا کی محبت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ البتہ اسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اس کے نظریات، عقائد اور اصلاح کے پروگرام آفاقی اور عالم گیر ہوتے ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

کافر دنیا میں ساز و سامان اور عسکری قوت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اس کے پاس جذبۂ ایمانی نہیں ہوتا جس کے ساتھ وہ ہتھیاروں کے بغیر جنگ آزما ہو سکے۔ برخلاف اس کے مومن کے پاس ایمان کی دولت ہوتی ہے۔ اس کا توکّل خدا پر ہوتا ہے۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کسی وقت بے سروسامانی کے عالم میں کافروں سے لڑنا پڑے تو وہ گریز نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زندگی کی معراج شہادت کی موت ہوتی ہے اس لئے وہ اسلحے کے بغیر بھی مجاہدوں کی طرح مقابلہ کرتا ہے ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ!
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

قرآن پاک میں مومنوں کی یہ نشانی بیان کی گئی ہے کہ

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ یعنی وہ کافروں پر سخت ہوتے ہیں اور آپس میں رحیم ہوتے ہیں۔

مومن آپس میں ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اپنی نسبت دوسرے بھائیوں کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ان میں ایثار کا جذبہ ہوتا ہے۔ خود تکلیف برداشت کر لیتے ہیں لیکن دوسرے بھائیوں کو آرام پہنچاتے ہیں۔ نہایت نرم اور شفیق ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سلام کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی مومن باطل کے مقابلے میں سخت جان ہوتے ہیں۔ وہ سر پر کفن باندھ کر میدان جہاد میں نکلتے ہیں اور بے جگری سے لڑتے ہیں۔ وہ دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے ہیں اور اللہ کے دین کی خاطر لڑتے ہوئے انہیں کفار پر قطعاً رحم نہیں آتا۔ حق و باطل کے ہر معرکے میں نہایت سخت ثابت

ہوتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم!
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مومن ہر وقت اللہ کے سپاہی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ کم سامانی کا بہانہ کرکے گوشہ نشین نہیں ہو جاتا بلکہ اللہ پر کامل ایمان اور توکل سے جہاد میں حصّہ لیتا ہے۔ اس کی زرہ بھی لا الٰہ الا اللہ ہوتی ہے۔ و رتلواروں کے سائے میں اس کی پناہ بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان ہر حال میں اس کا سہارا ہوتا ہے۔

دِ سپاھی ہے وہ اس کی زرہ لَا اِلٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لَا اِلٰہ

اللہ تعالیٰ نے کئی طرح کی مخلوق پیدا کی ہے۔ ان سب میں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جمادات، نباتات اور دیگر مخلوقات کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ اس سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہٹتے۔ پہاڑوں کو زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ نباتات زمین میں اپنی جڑیں قائم کئے ہوئے نشو و نما کی ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں لا سکتے۔ انہوں نے انسانوں یا حیوانوں کی خوراک بننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ زمین، سورج اور دیگر سیارے اپنے اپنے راستوں پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنے مقررہ راستوں سے ذرّہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ ان کے ذمّے اللہ تعالیٰ نے جو کام لگا رکھا ہے، اسے سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی فطرت میں اطاعت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے سب کی سب مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قسم کا اختیار نہیں دیا اس لئے وہ کسی جزا سزا کی بھی مکلّف نہیں۔ انہیں جس کام میں لگا دیا گیا ہے دن رات اسی میں مصروف ہیں۔ برخلاف اس کے انسان کو اللہ تعالیٰ نے شر اور خیر، نافرمانی اور اطاعت کے دونوں راستے سمجھا کر اختیار دیا ہے کہ وہ جو

راستہ چاہے اختیار کرلے ۔ وہ اپنی مرضی سے جو راستہ بھی اختیار کرے گا اس کی آخرت کی منزل اسی راستے کے ذریعے متعین ہوگی۔ اگر وہ اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسے جنّت کی طرف لے جائے گا اور اگر وہ نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسے جہنّم میں پہنچا دے گا۔ مردِ مومن ان دونوں راستوں میں سے اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں بسر کرتا ہے ۔ وہ تقدیر کا بہانہ بنا کر بے عملی اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اعمالِ خیر کا ذخیرہ جمع کرتا ہے ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود بھی عمل کرتا ہے اور دوسروں سے ان پر عمل کرانے کی کوشش بھی کرتا ہے ۔ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام کو حکومت کے تمام شعبوں میں جاری وساری کرانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کر سکے ؎

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

مومن اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اپنی جدوجہد ہمیشہ جاری رکھتا ہے۔ اس کے نتائج اس کی توقع کے خلاف بھی نکلیں تو وہ مایوس نہیں ہوتا ۔ اگر ایک محاذ پر اسے ہزیمت اٹھانی پڑے تو کسی دوسرے محاذ پر فتحیاب ہو جاتا ہے ۔ اگر اس کے کام کرنے کا ایک راستہ بند کر دیا جائے تو وہ اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کر لیتا ہے ۔ اللہ کی زمین وسیع ہے، ایک جگہ کام کرنے کے مواقع ناپید ہوں، حالات سازگار نہ ہوں تو کسی دوسری جگہ کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے ۔ مومن ہر حال میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھتا ہے ۔ اگر اسے ایک جگہ زوال ہوتا ہے تو دوسری جگہ غلبہ حاصل ہو جاتا ہے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

مسلمان دنیا کو اپنا مستقل مستقر نہیں سمجھتا ۔ بلکہ اسے ایک راہ گزر تصوّر کرتا ہے۔ اس

لئے اس کی آرزوئیں اور تمنائیں قلیل ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ضروریات سے زیادہ کی خواہش نہیں رکھتا۔ اسے مال و دولت کی ہوس اور عیش و عشرت کی تمنا نہیں ہوتی۔ وہ کسی گھٹیا مقصد کے لئے کوئی کام نہیں کرتا بلکہ بلند تر مقاصد کے لئے زندگی گزارتا ہے۔ اس کا اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اگر جنگ بھی کرتا ہے تو اس کا مقصد امن قائم کرنا ہوتا ہے۔ وہ دنیا سے ظلم و ستم مٹا کر عدل و انصاف قائم کرتا ہے، برائیوں کو مٹاتا اور بھلائیوں کو پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کے لئے سراپا خیر ہوتا ہے۔ اس کے انداز اور طور طریقے بڑے دلنواز ہوتے ہیں وہ اپنی خوش گفتاری، شائستگی اور حسنِ عمل سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اپنائیت، محبت اور شفقت کارفرما ہوتی ہے۔ وہ جس طرف اٹھتی ہے دلوں کو مسخر کرتی چلی جاتی ہے ؎

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگاہ دل نواز

مسلمان بڑی نرمی اور محبت سے بات کرتا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ نہ وہ کسی کو گالی دیتا ہے نہ کسی پر اتہام لگاتا ہے اور نہ ہی سخت کلامی سے پیش آتا ہے۔ وہ بات کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اس کی زبان سے ہمیشہ کلمۂ خیر نکلتا ہے۔ جب وہ اپنے مقصد کے لئے سرگرمِ عمل ہوتا ہے تو بڑی تیزی سے کام کرتا ہے اور اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں اس کے حصول کے لئے صَرف کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقصد سے عشق ہے اور اس مقصد کے لئے جد و جہد کے سوا اسے کوئی کام نہیں ہے۔ وہ دوستوں کی محفل میں ہو یا میدانِ کارزار میں دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو، ہمیشہ پاک دل اور پاکباز ہوتا ہے۔ وہ دل میں کسی کے خلاف حسد، بغض اور کینہ نہیں رکھتا اس کی دوستی اور دشمنی اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے۔ وہ کسی سے فریب نہیں کرتا، خیانت نہیں

کرتا اور کسی کا حق غصب نہیں کرتا ۔ جنگ میں بھی اپنے اعلیٰ اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ سات آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے۔ فلسطین کے میدان میں صلاح الدین ایوبی انگلستان کے بادشاہ رچرڈ سے برسرِ پیکار تھا۔ رچرڈ کو بہت سے یورپی حکمرانوں کی امداد حاصل تھی ۔ عیسائی بادشاہوں نے صلیب کے نام پر یورپ کے اکثر عیسائی حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ مسلمان مسجد اقصیٰ کے لئے لڑ رہے تھے۔ دشمن کی فوجوں نے شہروں کے شہر تباہ کر دیئے، مسجدیں مسمار کر دیں اور وہاں کی شہری آبادیوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ ہلاکو اور چنگیز کی یاد تازہ کر دی۔ اچانک جنگ کے دوران رچرڈ بیمار ہو گیا۔ صلاح الدین کو پتہ چلا تو اس نے جنگ روک دی وہ چاہتا تو اس کی بیماری اور کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن مسلمان صلح و جنگ، ہر حالت میں پاک دل اور پاکباز ہوتا ہے۔ اس لئے صلاح الدین نے جنگ روک کر رچرڈ کو کہلوا بھیجا کہ جب تک تم تندرست نہیں ہو جاتے میں رکا رہوں گا۔ رچرڈ کی حالت زیادہ بگڑ گئی اور اس کے ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو صلاح الدین کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے بہترین طبیب کو بلایا اور حکم دیا کہ جاؤ اور رچرڈ کا علاج کرو اور دیکھو علاج کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ صلاح الدین کا طبیب دشمن کے کیمپ میں پہنچا تو انہوں نے اسے گھیر لیا اور مشہور کر دیا کہ یہ بادشاہ کو زہر دینے آیا ہے۔ رچرڈ نے ساری باتوں کی تفصیل سنی تو اس نے کہا طبیب کو میرے پاس آنے دو۔ بے شک وہ نیک نیتی اور اچھے ارادے سے آیا ہے۔ میں اس سے علاج کراؤں گا۔ چنانچہ رچرڈ نے اس طبیب سے باقاعدہ علاج کرایا۔ صلاح الدین نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور جب تک رچرڈ بیمار رہا وہ جنگ سے رکا رہا۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

بعض انسان معمولی معمولی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ان میں تحمل اور ضبطِ نفس نہیں ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو بھلا دینے کی بجائے انتقامی جذبات کو پروان چڑھاتے ہیں۔ دل میں حسد اور کینہ رکھتے ہیں، حد سے زیادہ حریص اور لالچی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ عالی ظرف

اور بلند طبیعت کے مالک نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے جو لوگ غصہ نہیں کرتے، انتقام نہیں لیتے، برا سلوک کرنے والے کے ساتھ بھی احسان کرتے ہیں۔ لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں۔ فراخ دل اور فراخ حوصلہ ہوتے ہیں۔ وہ عالی ظرف اور بلند طبیعت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ انسان کو معاملات کا کھرا ہونا چاہیئے۔ اس کے طور طریقے پاکیزہ ہوں۔ وہ بلند اخلاق کا مالک ہو۔ کسی سے دھوکا نہ کرے اور ہر ایک کا خیر خواہ ہو۔ اس کے دل میں اپنے نصب العین سے عشق ہو۔ کیونکہ عشق ہی سے دل میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور انسان فعّال اور متحرک بنتا ہے۔ اس کی نگاہ میں پاکیزگی اور طہارت ہو۔ اس کی جان بیچین اور بیقرار رہنے والی ہو کسی برائی کو دیکھے تو اسے مٹانے کے لئے بے چین ہو جائے۔ اور کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھے تو اس کی مدد کے لئے بے تاب ہو جائے۔ یہی مردِ مومن کی صفات ہیں۔ جس میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں اس میں مردِ مومن کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں ؎

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جان بیتابے

مرد کو اس کے سوا اور کیا چاہیئے کہ اس کی طبیعت بلند ہو، اس کے طور طریقے پاکیزہ ہوں، وہ گرم دل، پاک بیں نگاہ اور بے تاب جان رکھتا ہو۔

کسی نظریے کو زبانی تسلیم کر کے پھر اس کے تقاضوں سے لاتعلق ہو جانا اس سے وفاداری نہیں بلکہ غداری ہے۔ وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے اور اس کی حفاظت کے لئے ہر وقت کمربستہ رہے۔ اس نظریے کے خلاف باتیں بنانے اور اسے نقصان پہنچانے والوں کا محاسبہ کرے۔ حق کے خلاف باتیں سن کر خاموش رہنا ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔ مردِ مومن کسی موقع پر بھی خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کرتا۔ بلکہ وہ باطل کو مٹانے اور حق کا دفاع کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ وہ باطل کیلئے تلوار اور حق کے لئے ڈھال ثابت ہوتا ہے۔ مومن کسی موقع پر بھی حق کا دامن ہاتھ سے نہیں

چھوڑتا۔ وہ بلند کردار اور پاکیزہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے اعمال کو دیکھ کر خیر اور شر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ جس کام کو سرانجام دیتا ہے وہ نیکی ہوتا ہے اس لئے کہ اس سے برائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور جس کام سے وہ رک جاتا ہے وہ برائی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی بھلائی کے کام سے رک نہیں سکتا۔ اس طرح اس کا کسی کام کا کرنا اور کسی کام سے رک جانا خیر و شر کی کسوٹی بن جاتا ہے۔ لوگ اس کے اعمال کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بھلائی کیا کیا ہے اور برائی کیا ہے ؎

پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر
امر و نہی او عیارِ خیر و شر

وہ باطل کے سامنے تلوار اور حق کے لئے ڈھال ہوتا ہے، اس کا کسی کام کو کرنا اور کسی سے رک جانا خیر و شر کی کسوٹی ہوتا ہے۔

مردِ مومن کے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے صرف خدا کی رضا کے لئے کرتا ہے۔ اس کے دل میں ریا اور نمود و نمائش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرمانروا کی طاقت سے خوف نہیں کھاتا اور بے دھڑک اسے اس کی غلطیوں پر ٹوکتا ہے اور اس کے سامنے بے باکی کے ساتھ کلمۂ حق کہتا ہے۔ وہ کسی حاکم کے سامنے خوشامدانہ لہجہ اختیار نہیں کرتا اور نہ ہی ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے بلکہ اسے راہِ راست پر رکھنے کے لئے ہمیشہ حق گوئی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے ؎

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوّتِ فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

○

چھٹا باب

عبادت

قرآن پاک میں ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد سوائے عبادت کے اور کچھ نہیں عبادت کے معنی بندگی اور غلامی کے ہیں۔ یعنی انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا آقا اور مالک ہے۔ جب کوئی شخص کسی کا غلام بن جاتا ہے تو اس میں وقت کی تخصیص نہیں ہوتی کہ فلاں وقت وہ اپنے آقا کا بندہ ہوگا اور فلاں وقت اس کی بندگی سے آزاد ہوگا۔ غلام کا کام اپنے آقا کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری ہوتا ہے ۔ وہ ہر لمحے اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ جس کام کے کرنے کا وہ حکم دیتا ہے اسے وہ بخوشی سرانجام دیتا ہے اور جس کام سے وہ منع کرتا ہے اس سے رک جاتا ہے ۔ وہ پوری زندگی اپنے آقا کی وفاداری میں گزارتا ہے۔ آقا سے جس کی دوستی ہو اس سے دوستی رکھتا ہے اور آقا کی جس سے دشمنی ہو اس سے دشمنی رکھتا ہے ۔ وہ غیروں کی اطاعت اور وفاداری کا دَم نہیں بھرتا بلکہ ہر دم اپنے آقا کا وفادار رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی ہیں ۔ اس لئے بندگی بھی صرف اسی کے لئے مخصوص ہونی چاہیئے۔ جو شخص اپنے آقا کی دی ہوئی نعمتیں استعمال کرتا ہے لیکن بندگی غیروں کی کرتا ہے وہ اپنے آقا کا سچا اور وفادار

غلام نہیں کہلا سکتا اور آقا کبھی اس سے خوش نہیں ہوتا۔

بعض لوگوں نے عبادت کے مفہوم کو بالکل محدود کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا اور دوسرے ارکانِ اسلام کی پابندی کر لینے سے عبادت کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مسلمان کثرت سے ملتے ہیں جو نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن رشوت بھی لیتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں لیکن جھوٹ بھی بولتے ہیں، ذکر اذکار بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو دھوکا بھی دیتے ہیں۔ وہ باہمی اخوت و محبت رکھنے کا حکم قرآن پاک میں بار بار پڑھتے ہیں لیکن اپنے دل میں دوسروں کے خلاف نفرت، حسد، کینہ اور بغض بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد میں ممد ہونے کے بجائے فرقہ پرستی کو ہوا دینے کا ذریعہ بنتے ہیں، معمولی معمولی مفادات کی خاطر حق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، مذہبی معاملات میں خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں یا زمانے کا ساتھ دیتے ہیں۔ دنیوی نفع کی خاطر بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، اپنا مال اور وقت صرف کرتے ہیں لیکن خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کا معاملہ ہو تو طرح طرح کے حیلے بہانے کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ

پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق مالک اور حاکم تسلیم کر لیا ہے تو اسی کے دیئے ہوئے آئین کی پیروی کرو۔ محض عبادات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کو الٰہ مان لینے کو اللہ تعالیٰ کی جزوی بندگی تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس عمل کو مکمل بندگی نہیں کہا جا سکتا۔ مکمل بندگی تو اسی وقت ہوتی ہے جب سیاست، معیشت، معاشرت، علوم و فنون، نظامِ حکومت سب میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کیجائے۔ اس کے احکام سے انحراف کرنا اور اس کی مکمل اطاعت نہ کرنا منافقانہ روش ہے جسے قرآن پاک نے یوں

بیان کیا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذَالِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

کیا تم خدا کی کتاب کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے کو رد کرتے ہو۔ بتاؤ! جو لوگ خدا کی کتاب کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب سے دوچار کئے جائیں۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

نماز میں ہم بار بار اللہ تعالیٰ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں لیکن نماز سے فارغ ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس عہد کو بھول جاتے ہیں اور بد دیانتی، رشوت، خیانت اور دوسری معاشرتی برائیوں کا ارتکاب کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت سے انحراف کر کے اس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ دراصل ہم نے دین اور دنیا کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے۔ حالانکہ اسلام دین و دنیا کی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ اگر کوئی کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور سنّتِ رسولؐ کے مطابق سرانجام دیا جائے تو وہ عین عبادت ہے۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دنیوی کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔ زندگی کے ہر معاملے میں حلال و حرام، جائز و ناجائز اور گناہ و ثواب کا خیال رکھنا خدا کی بندگی کا اوّلین تقاضا ہے۔

اپنا نقصان برداشت کر لینا لیکن حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا عین ایمان ہے۔ زمانے کے رسم و رواج کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی کرنا اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کا خیال نہ کرنا عین عبادت ہے۔ اگر کسی وجہ سے معاشرے میں کوئی ایسا قانون ہو جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو تو اس کی بر ضا و رغبت تعمیل اللہ تعالیٰ

کے احکام سے انحراف اور اسے کتاب وسنّت کے مطابق بدلنے کی کوشش کرنا عین عبادت ہے۔

حق کو چھوڑ کر اپنے نفس، آباؤ اجداد یا زمانے کی پیروی کرنا سراسر گمراہی اور جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مسلمان کی عزّت اور زمانے کی پیروی اس کی رسوائی کا سبب ہے۔ زندگی سے منافقت اور تضاد کو دور کرنا اور خالص اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر زندگی بسر کرنا ہی عبادت ہے۔ اسلام میں دو رنگی اور منافقت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر کوئی رنگ نہیں اور مسلمان کی زندگی پہ یہی رنگ غالب ہوتا ہے ؎

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

○

ساتواں باب

اسلام اور اجتماعیّت

دنیا کی ہر چیز اس بات کی شاہد ہے کہ اس کائنات کا سارا نظام باہمی ربط سے قائم ہے ۔ زمین، ستارے، پہاڑ، سمندر کسی چیز پر بھی انسان غور کرے تو اس پر یہ حقیقت آشکارا ہو گی کہ ان سب کا وجود اتحاد کا مرہون منّت ہے ۔ ذرّات کے ملنے سے صحرا اور قطرات کے ملنے سے سمندر وجود میں آتے ہیں ۔ اسی طرح قومیں اور ملّتیں بھی افراد کے اتحاد ہی سے بنتی ہیں ۔

علاّمہ اقبال نے بزمِ انجم کے عنوان کے تحت ایک نظم میں ستاروں کی زبانی انسانوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے باہم متّحد رہیں اور ستاروں کی زندگی سے سبق حاصل کریں ۔ ستاروں کی زندگی باہمی ربط سے قائم ہوتی ہے ۔ وہ اپنی کشش کے ذریعے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں ۔ اگر ان کا یہ ربط ختم ہو جائے تو انہیں اپنا وجود برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جائے ۔

اک عمر میں نہ سمجھے جس کو زمین والے
وہ بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں ربطِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان ایک عمارت کی مانند ہیں جس طرح عمارت کی اینٹیں مل کر عمارت بناتی ہیں اور ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور مل کر ایک مضبوط قوم بن جاتے ہیں ۔ دنیا

میں جن قوموں نے غلبہ حاصل کیا اس کا بڑا سبب ان کا باہمی اتحاد تھا اور جو قومیں مغلوب ہوئیں اس کا بڑا سبب ان کا باہمی انتشار تھا۔ مسلمان جب تک متحد رہے، انہوں نے دنیا پر حکمرانی کی۔ کوئی طاقتور سے طاقتور قوم ان کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ لیکن جب امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھر گیا تو دوسری اقوام کو غلبہ حاصل ہو گیا ؎

رشتۂ وحدت چوں قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کارے ما فتاد
ما پریشاں در جہاں چوں اختریم!
ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم!!
باز ایں اوراق را شیرازہ کن
باز آئینِ محبت تازہ کن

جب قوم نے اتحاد کا رشتہ چھوڑ دیا تو ہمارے کام میں سینکڑوں گرہیں پڑ گئیں۔ ہم ستاروں کی مانند جہاں میں بکھرے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ ان اوراق کی دوبارہ شیرازہ بندی کر۔ محبت کے آئین کو پھر تازہ کر۔

اسلام کی سربلندی کے لئے مسلمانوں کا باہمی اتحاد نہایت ضروری ہے۔ اتحاد میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے اتحاد کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی رسّی قرآن پاک کو مضبوطی سے تھام لیں۔ فروعی اختلافات میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی بجائے اپنی اصلاح کریں اور پھر اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے اتحاد میں برادریوں کے بندھن، فرقہ پرستی اور رسم و رواج سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے ایک دوسرے کو اپنا بھائی تصور کریں اور باہمی اتحاد کو اللہ تعالیٰ کا ایک حکم سمجھیں، شعوب و قبائل اور رسومِ کہن کی زنجیروں کو توڑ دیں تو وہ دنیا میں توحید عام کرنے کے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں ؎

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم یہی فتحِ باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

اتحاد کے راستے میں ایک رکاوٹ رنگ و نسب پر بے جا افتخار بھی ہے۔ اسلام میں فضیلت کی بنیاد رنگ و نسل اور خاندان نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مکرّم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کام کرنے سے پہلے اس احساس کو ختم کرنا ضروری ہے تاکہ سب مسلمان مل کر اس فریضے کو سرانجام دے سکیں ؎

غبار آلود ہیں رنگ و نسب سے بال و پر تیرے !
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پَر فشاں ہو جا

قرآن پاک کا فرمان ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے تمام مسلمان جسدِ واحد کی مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو تمام جسم مضطرب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف سبھی محسوس کرتے ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کا تعلق کس خطے یا خاندان سے ہے۔ بھائیوں میں معمولی اختلافات بھی ہو جاتے ہیں لیکن وہ کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن نہیں بن جاتے۔ مسلمانوں کو بھی فروعی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف حسد، بغض اور کینہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ کینہ اعمال کو اس طرح ضائع کر دیتا ہے جس طرح سرکہ شہد کو۔ مسلمان کو اپنا دل ہر طرح کے تعصب سے پاک رکھنا چاہیئے تاکہ باہمی محبت اور اخوّت کی فضا بن سکے ؎

تعصّب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں —!!
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

عام طور پر جب کچھ افراد کا مفاد ایک ہو تو ان میں باہمی اتحاد اور یگانگت پائی

جاتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے لئے مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ مسلمانوں کا مفاد ایک ہے، ان کا نقصان بھی ایک ہے، ان کا دین، ایمان، نبیؐ، حرم پاک اور قرآن بھی ایک ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں باہمی اتحاد اور یگانگت کا فقدان ہے۔ اگر مسلمان اس نکتے کو سمجھ لیں تو وہ ایک ہو سکتے ہیں اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کر سکتے ہیں ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

یوں تو دنیا میں کئی قسم کے اتحاد ہوتے ہیں۔ چور اور ڈاکو بھی اپنا ایک گروہ بنا لیتے ہیں۔ عیش پرست اور مے خوار بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں کسی ایسے ہی دوسرے مقصد کے لئے بھی افراد مجتمع ہو جاتے ہیں لیکن اسلام جس اتحاد کی تلقین کرتا ہے اس کی بنیاد " حبل اللہ " ہے اس کے علاوہ جو اتحاد بھی معرض وجود میں آئے گا وہ نہ صرف مطلوب نہیں ہے بلکہ مبغوض ہے اور " لَا تَفَرَّقُوْا " کے تحت اس کی باز پرس ہو گی۔ اسلام نے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اجتماعی عبادات کا ایک ایسا شاندار اور منظم پروگرام دیا ہے جو اس مقصد کی واضح طور پر عکاسی کرتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت، جمعۃ المبارک کا اجتماع، عیدین کے اجتماعات اور پھر حج کے موقع پر عالم گیر اجتماع اس اتحاد کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے مختلف اقدامات ہیں۔

امتِ مسلمہ کی زندگی کا مقصد دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ایک منظم اتحاد اور جماعت کا متقاضی ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کا قول ہے: لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاِمَارَةِ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِالطَّاعَةِ ۔ جماعت کے بغیر اسلام نہیں اور امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔ قرآن پاک نے بہت سے مقامات پر کسی فرد کی بجائے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر خطاب کیا ہے۔ اسلام کے بہت سے احکام ایسے ہیں جنہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے فرد کی بجائے جماعت کی ضرورت ہے۔ کسی فرد کا جماعت سے وابستہ ہونا اس کے لئے رحمت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے"۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو امیر بنالیں"۔ حضرت معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس طرح بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہوتا ہے اور اپنے ریوڑ سے الگ ہونے والی بکریوں کو آسانی سے شکار کر لیتا ہے اسی طرح شیطان انسان کا بھیڑیا ہے۔ اگر جماعت بن کر نہ رہیں تو ان کو الگ الگ آسانی سے شکار کر لیتا ہے۔ اے لوگو! پگڈنڈیوں پر مت چلنا بلکہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ جماعت اور عامۃ المسلمین کے ساتھ رہو"۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص جنّت کے وسط میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہو اسے جماعت سے چمٹے رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ شیطان ایک آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہ دو ہو جائیں تو وہ دور ہو جاتا ہے"۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

فرد کے لئے جماعت رحمت ہے۔ اس کی خوبیوں کو ملّت کے ذریعے ہی کمال حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ وابستہ رہ اور آزاد لوگوں کے ہنگامے کی رونق بنا رہ۔

جس طرح قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت میں شامل ہونے سے فرد کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے ۔ فرد تنہا اپنے مقاصد سے غافل ہوتا ہے لیکن جماعت کے ساتھ مل کر اسے اپنے مقاصد کی طرف توجہ دینے کا موقع ملتا ہے ؎

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوّتش آشفتگی را مائل است

فرد جب جماعت میں گم ہو جاتا ہے تو وہ وسعت طلب قطرے کی طرح سمندر بن جاتا ہے۔ تنہا آدمی اپنے مقاصد سے غافل ہوتا ہے ۔ اور اس کی طاقت انتشار کی طرف مائل ہوتی ہے ۔ فرد جماعت کے ساتھ مل کر زیادہ قوّت کا حامل بن جاتا ہے۔ ریت کے ذرّے اور پانی کے قطرے کی صحرا اور دریا سے الگ کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ذرّات اجتماعی صورت اختیار کرتے ہیں تو صحرا بن جاتا ہے ، اور قطرے ملتے ہیں تو دریا بن جاتا ہے اور پھر اس میں اتنی قوّت پیدا ہو جاتی ہے کہ خس و خاشاک کو بہالے جاتا ہے۔ سیلاب بن کر اٹھتا ہے تو بڑے بڑے بند بھی اس کے آگے نہیں ٹھہر سکتے ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں !
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کر دینِ اسلام کی عظمت اور سربلندی کے لئے کام کرے ۔ کیونکہ انسانیت کی فلاح اسی دین پر عمل کرنے میں ہے۔ امّتِ مسلمہ کی سربلندی اور عظمت بھی اسلام کی سربلندی سے وابستہ ہے ۔ ملّت کے ساتھ وابستگی ہی سے ایک عالم گیر اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے جو اسلام کا منتہائے مقصود ہے ؎

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

مسلمانوں کی آخری منزل کسی ایک ملک یا خطّے میں ان کا باہمی اتحاد نہیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہر ملک کے مسلمان نسلی، خاندانی، علاقائی اور فروعی اختلافات کو ختم کر کے متحد ہوں اور اپنے اپنے ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم کریں اور پھر تمام دنیا کی اسلامی حکومتیں ایک عظیم تر اتحاد کی بنیاد رکھیں اور پوری دنیا میں اللہ کے کلمے کو بلند کر کے انسانوں پر سے انسانوں کی حکومت ختم کریں اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کر کے اس کی رضا حاصل کریں ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

آٹھواں باب

امامت

اسلام انفرادی تزکیۂ نفس کیساتھ ساتھ اجتماعی زندگی میں باقاعدگی پیدا کرنے اور قانون کی پابندی پر زور دیتا ہے۔ کوئی جماعت صحیح قیادت کے بغیر منظم نہیں رہ سکتی۔ قیادت کے بغیر ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کی سوچ اور فکر میں یکسانیت نہیں رہتی۔ افکار کی وحدت سے کردار کی وحدت پیدا ہوتی ہے اور قوم وحدتِ فکر و عمل سے مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے۔ کسی قوم یا جماعت کو اپنے نصب العین کی طرف صراطِ مستقیم پہ گامزن رکھنے کے لئے ایک قائد اور امام کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کو اس حد تک واضح کیا ہے کہ سفر میں بھی انفرادی زندگی اختیار کرنے کی بجائے ایک امیر کے تحت اجتماعی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے تین آدمی سفر پہ ہوں تو ایک کو امیر منتخب کرلیں۔

علامہ اقبال نے امامت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ محض نماز کی امامت نہیں بلکہ اس سے ان کی مراد ملت کی قیادت اور امامت ہے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ امامت و قیادت کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کریں جو اسلام کو صحیح طور پر سمجھتے ہوں اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق حکومت کے تمام شعبوں میں اسلامی نظام کو رائج کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ جب تک نظامِ حکومت خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گا، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، معیشت، معاشرت، صنعت و تجارت قانون، بین الاقوامی تعلقات اور دیگر امور پر ان کا کنٹرول رہے گا، ایک مسلمان کے لئے صحیح

اسلامی زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رکھنا عملاً محال ہوگا بلکہ آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت بھی صحیح اسلامی خطوط پر ممکن نہیں ہوگی۔

مسلمان پر دیگر فرائض کے علاوہ یہ فرض بھی عائد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے دنیا سے فتنہ و فساد ختم کر کے اصلاح کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی شخص انفرادی طور پر نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اپنے ملک میں نظامِ حکومت ایسے لوگوں کے سپرد کریں جو سچے اور پکے مسلمان ہوں اور پھر پوری دنیا میں اصلاح کی کوشش کریں۔ جب تک زمامِ اقتدار فسّاق و فجّار اور خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں رہے گی، دنیا سے ظلم و جور اور فتنہ و فساد کی راہیں بند نہ ہوں گی۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ دنیا میں گمراہ لوگوں کو پیشوائی سے ہٹائیں اور کفر و شرک کو مٹا کر دینِ حق قائم کریں۔ اگر صحیح صاحبِ ایمان امام میسّر آجائے تو اس کی رہنمائی میں بکریاں چرانے والا بھی بہت جلد بلند مقام تک پہنچ جاتا ہے ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسّر،
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

امام کے لئے مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہونا ضروری ہے :

صداقت

زبان سے سچ بولنا اور اپنے ہر عمل میں راست بازی کا مظاہرہ کرنا، جھوٹ، فریب، خیانت بد دیانتی اور اسی قسم کی دوسری برائیوں سے بچنے اور سچی اور صاف زندگی بسر کرنے کا نام صداقت ہے۔ سب سے بڑی صداقت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبیٔ آخر الزماںؐ کی رسالت پر صدق دل سے ایمان لانا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے توحید کی تعلیم سنتے ہی ایمان لے آئے اور پھر پوری زندگی اس تعلیم کو عام کرنے اور لوگوں کو ضلالت و

دگمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لانے میں صرف کردی۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معراج کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز فرمایا اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو معراج کے واقعے کی تفصیلات بتائیں تو بعض لوگ شک میں پڑ گئے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانی ابھی اس واقعے کے متعلق کچھ نہ سنا تھا کہ ابوجہل سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ابوجہل نے حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے کہا کچھ سنا ہے تمہارا یار کیا کہتا ہے؟ حضرت ابوبکر صدّیق نے کہا انہوں نے کیا فرمایا ہے؟ ابوجہل کہنے لگا وہ کہتے ہیں میں راتوں رات آسمانوں سے ہو آیا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدّیق نے فرمایا خدا کی قسم اگر انہوں نے کہا ہے تو وہ یقیناً آسمانوں سے ہو کر آئے ہیں۔ اسی کامل ایمان کی بنا پر ہی آپ "صدّیق" کہلائے۔

ایمان لانے کے بعد ہمیشہ سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا اور زندگی کے ہر معاملے میں جھوٹ اور مکر و فریب کو چھوڑ کر سچائی اور دیانت داری کا رویّہ اختیار کرنے، خدا کا خوف رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے اور سچّے لوگوں کا ساتھ دینے کا نام صداقت ہے۔ یہی وہ صداقت ہے جس کے متعلق قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ فرمائیگا "آج وہ دن ہے کہ جس دن سچّے لوگوں کی صداقت ان کے کام آئے گی۔ ان کے لئے جنّت ہے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں — وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے"۔

○

عدالت

عدالت سے مراد وہ صفات ہیں جو محدّثین نے کسی راوی یا فقہا نے کسی گواہ کے عادل ہونے کے لئے مقرر کی ہیں۔ ان سب میں سے بڑی صفت تقویٰ ہے۔ امامت کے لئے جس شخص کو منتخب کیا جائے وہ بہت زیادہ خدا سے ڈرنے والا، متقی اور پرہیزگار ہو۔

شرک، فسق، بدعت اور کبائر سے اجتناب کرنے والا ہو۔ امام کا سب سے بڑا کام کفر و شرک کو ختم کر کے اسلام کا عادلانہ نظام قائم کرنا ہے۔ اگر وہ خود ہی شرک و بدعت میں مبتلا ہوگا تو لوگوں کو اس سے کیسے باز رکھ سکے گا۔ اس کی برائیوں کا اثر پوری قوم پر پڑے گا۔ اس لئے امام کا تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر پورا اترنا ضروری ہے۔ وہ لوگوں میں جھوٹا مشہور نہ ہو، جھوٹے وعدے بھی نہ کرتا ہو۔ وعدے کی پابندی کرنے والا ہو اور سنّتِ رسولؐ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو الغرض وہ ہر لحاظ سے سچّا اور پکّا مسلمان ہو۔ جب بھی اسے زندگی کے کسی معاملے میں فیصلہ کرنا ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے اسی کا نام عدالت ہے۔ قاضی کی حیثیت سے مقدمات کا فیصلہ کرنا ہی عدالت نہیں بلکہ زندگی میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فیصلہ کرنا ہو تو اس میں کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا بھی عدالت ہے۔ اس قسم کے فیصلے کرنے کے مواقع ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔ خواہ اسے بحیثیت قاضی کام کرنے کا ایک دن بھی موقع نہ ملا ہو۔

شجاعت

شجاعت سے مراد دلیری اور بہادری ہے۔ امامت کا فریضہ ادا کرنے والے شخص کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جتنی کسی کی ذمے داریاں زیادہ ہوتی ہیں اتنی ہی اسے زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں۔ امامت کی ذمہ داری قبول کرنے والے کو رات کی نیند اور دن کا آرام بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ راتکو تنہا گشت کیا کرتا تھے تاکہ لوگوں کی تکالیف معلوم کر کے ان کا ازالہ کریں۔ سربراہِ مملکت یا اقتدار میں شامل دوسرے عمّال کو طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ایسے فتنے کھڑے کرتے ہیں کہ کمزور اعصاب کا آدمی ہمّت ہار بیٹھتا ہے۔ ایسے فتنوں کو فرو کرنے کے لئے جرأت و

ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مملکت کا نظام چلانا بزدل، کم ہمّت اور آرام طلب آدمی کا کام نہیں ہوتا۔ رہنما بزدل ہو تو اس کے اثرات پوری قوم پر پڑتے ہیں۔ اگر رہنما دلیر اور شجاع ہو تو وہ مردہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دیتا ہے۔ بعض اوقات کسی معاملے میں عوام کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مواقع پر ایک دلیر آدمی ہی استقامت کا مظاہرہ کر کے اپنے اصولوں پر قائم رہ سکتا ہے ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے کچھ عرصہ قبل اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا تھا۔ ابھی یہ لشکر روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کو روانگی کا حکم دیا تو بعض صحابہؓ نے اس حکم کی مخالفت کی اور مشورہ دیا کہ اس وقت مدینہ مختلف خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ منکرینِ زکوٰۃ کی طرف بھی لشکر بھیجے جا رہے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ اسامہ بن زیدؓ والے لشکر کو مدینے ہی میں رہنے دیا جائے تاکہ کسی امکانی خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ آپ نے فرمایا اس لشکر کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے روانہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا اس لئے یہ ضرور اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگا۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں اور بھیڑیے مجھے کھا جائیں گے تو میں پھر بھی اس لشکر کو ضرور روانہ کروں گا۔ چنانچہ آپ نے اس لشکر کو روانہ کیا اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ دلیرانہ فیصلہ درست تھا۔ الغرض امامت کے لئے شجاعت کا وصف بھی نہایت ضروری ہے ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بلندیٔ نگاہ

امام کی نگاہ بلند ہونی چاہیئے۔ وہ ایک نظر میں معاملے کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہو دوراندیش اور معاملہ فہم ہو۔ اس کے سامنے ہر معاملے کا ایک اعلیٰ معیار ہو اور اسی معیار کو سامنے رکھ کر وہ اس کو سرانجام دے۔ اپنی منزل کو آسمانوں سے بھی بلند تصوّر کرے۔ اس کی نگاہ اسی منزل پر مرکوز رہے۔ اور اس کے حصول کے لئے دن رات ایک کر دے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کی نگاہ سورج اور چاند کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہ دل کے توہمات میں الجھنے کی بجائے مشاہدہ حق سے بہرہ ور ہوتی ہے ؎

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں

ہوس پرست انسان سمجھتا ہے کہ نگاہ کا کام بس نظارہ کرنا ہے اور وہ اسے ایسے ہی پست مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں نگاہ اس سے بلند تر کام سرانجام دیتی ہے۔ نگاہِ بلند انسان کو بلندیوں پر پرواز کرنا سکھاتی ہے۔ معاملات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور نیک و بد کی پہچان کا سلیقہ عطا کرتی ہے ؎

نرا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
کسی نے کچھ سمجھ کر ہے بنایا چشمِ آدم کو

تنگ نظری سے انسان کا دل بھی تنگ ہو جاتا ہے اور نگاہ میں وسعت اور بلندی ہو تو دل بھی کشادہ ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان میں بلند ہمتی اور عالی ظرفی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں پوری دنیا کو فتح کرنے کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن نگاہوں میں آفاقیت نہ ہو تو دل بھی جہانگیری کے جذبے سے خالی رہتا ہے ؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

دلنوازیٔ سخن

سخن کی دلنوازی بھی ایک عمدہ صفت ہے ۔ میرِ کارواں کی بات میں دلوں کو مسخر کرنے والی تاثیر ہونی چاہیئے۔ وہ جس سے بات کرے مخاطب یہی سمجھے کہ یہ میرے دل کی بات کر رہا ہے۔ دل اور زبان میں موافقت ہو تو وہ دوسرے دلوں پر یقیناً اثر کرتی ہے ؎

دِل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے !

زبان نشتر بھی ہے اور مرہم بھی۔ اس کے ذریعے کسی کی تکلیف کو دور بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور بڑھایا بھی جاسکتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ اچھا طبیب وہ ہوتا ہے جو دلنواز باتوں ہی سے مریض کا آدھا مرض دور کر دیتا ہے ۔ میرِ کارواں کی بات بھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس بندھانے والی اور مردہ دلوں میں نئی روح پھونکنے والی ہو۔

زبان انسان کو بہت سے فتنوں میں مبتلا کر دیتی ہے اور زبان ہی انسان کو ہر دلعزیز بناتی ہے ۔ زبان ہی کے ذریعے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے ۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا

لوگوں سے اچھی بات کرو۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اسلام کیا ہے ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "عمدہ کلام"۔ زبان سے کسی کی دل آزاری نہ کرنا، محبت، سلیقے اور اخلاق سے بات کرنا اسلام

کی خوبیوں میں سے بہترین خوبی ہے۔

سوزِ دروں

سوزِ دروں دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں اپنے فرائض کی تکمیل کا احساس شدید ترین حالت میں موجود ہو۔ انسان کا اپنے مقصد کے حصول کے لئے بے چین اور بے تاب ہونا اسی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ ایسا شخص جس کا اپنا دل حرارت سے خالی ہو، دوسروں کے دلوں کو نہیں گرما سکتا اس لئے میرِ کارواں میں سوزِ دروں کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں سوز نہ ہو تو اس پر جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عمل کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل سے حصولِ مقصد کا عشق ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال دعا کرتے ہیں کہ "یا اللہ مجھے میرے اسلاف کا سوزِ دروں عطا کر اور اس گروہ میں شامل کر دے جس کے متعلق تیرا فرمان ہے: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔ میں نے عقل سے بہت کام لیا ہے۔ لیکن میرا مقصد مجھے حاصل نہیں ہو سکا۔ اس لئے مجھے عشقِ حقیقی سے بہرہ ور کر تاکہ میں کامیابی سے ہم کنار ہو سکوں"۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا يَحْزَنُونَ کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

سوزِ دروں سے ہی انسان متحرک، فعال اور سرگرم عمل ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جب کسی کے دل میں سوز پیدا ہو جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی متحرک کر سکے۔ اسی تپش اور حرارت سے دل زندہ ہوتے ہیں اور اسی حرارت کے ختم ہو جانے

کا نام مردہ دلی ہے۔ سوزِ دل رکھنے والے کی نظر کیمیا بن جاتی ہے۔ وہ جس کی طرف بھی توجہ کرتا ہے اسے کندن بنا دیتا ہے۔ ایسے شخص میں دوسروں کی اصلاح کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جو بات کرتا ہے اس میں تاثیر ہوتی ہے۔ اس لئے دوسروں پر اثر کرتی ہے ؎

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

علامہ اقبال فرماتے ہیں میں نے سنا کہ میرے کتب خانے میں ایک کتابی کیڑے نے پروانے سے کہا میں ایک عرصہ تک حکیم بوعلی سینا کی کتابوں میں سکونت پذیر رہا ہوں۔ مشہور مفکر اور مسلمان فلسفی فارابی کی کتابوں کو بھی چاٹ گیا ہوں لیکن مجھے زندگی کا راز ہاتھ نہیں آیا۔ میری زندگی پہلے کی طرح ہی تاریک ہے۔ پروانے نے اس سے یہ کہا کہ یہ نکتہ تجھے کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اگر زندگی چاہتا ہے تو کسی بلند تر مقصد کے لئے جلنا سیکھ لے۔ تجھے زندگی کا راز معلوم ہو جائیگا:

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

حرارت زندگی کو زندہ تر کر دیتی ہے۔ حرارت زندگی کو بال و پر عطا کرتی ہے۔ دل کی حرارت سے انسان زندگی کی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کی زندگی تاریک رہتی ہے۔ اسی جذبے کی بنا پر انسان خود تکلیفیں برداشت کرتا ہے مگر دوسروں کی تکلیف دیکھ نہیں سکتا ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

صداقت، عدالت، شجاعت، بلندیٔ نگاہ، دلنوازیٔ سخن اور سوزِ دروں کے علاوہ کچھ اور صفات بھی ایسی ہیں جو حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز شخص کے لئے ضروری ہیں۔ عام طور پر انسان اپنی قریب ترین چیزوں کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں اسے موجود نظر آتی ہیں یا جن

سے فوری فائدے کی توقع ہوتی ہے ان پر زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس دنیا کی چیزیں انسان کو نظر آتی ہیں، ان سے اسے فوری فائدے کی توقع ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو حاضر اور موجود چیزوں کے لئے ہوتی ہے۔ وہ مال و دولت اور دنیا کے منافع حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ آخرت چونکہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتی، اس کا تعلق ایمان بالغیب سے ہوتا ہے۔ اس لئے انسان دنیا طلبی میں آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے بہترین انعامات آخرت میں رکھے ہیں۔ دنیا کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسی لئے قرآن میں اسے متاعِ قلیل کہا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔ مومن کی جنت اسے آخرت میں حاصل ہوگی۔ اسی لئے دنیا میں مومن کو نیک اعمال سرانجام دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ دنیا میں انسان کو مال و دولت سے محبت کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی محبت سے بہرہ ور ہونے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے۔ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مومن کو حاضر و موجود سے بیزار کر کے اسے غیب کی طرف متوجہ کر دے اور دنیا کی محبت کی بجائے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اسے موت زندگی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اس لئے کہ موت اس کے لئے اللہ سے ملاقات کا ذریعہ بنتی ہے۔ دنیا میں جو چیز انسان کو بزدل اور کم ہمت بناتی ہے، وہ موت کا خوف ہے۔ جن لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف نکل جاتا ہے وہ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمان موت سے نہیں ڈرتے تھے اس لئے انہیں ہر میدان میں فتح نصیب ہوئی۔ انہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں اسلحہ سے لیس کئی گنا دشمن فوج کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ میدان ان کے ہاتھ رہا۔ وہ دنیا میں ایک غالب قوم کی حیثیت سے ابھرے اور دنیا سے اپنی شجاعت و بہادری کا لوہا منوایا۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل کی اور دنیا پر حکمرانی بھی کرتے رہے۔ امام میں یہ صفت ہونی چاہیئے کہ وہ مومن کے دل میں عشقِ الٰہی پیدا کرے۔ اور پھر اسے یہ سبق دے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا واحد ذریعہ اس کی راہ میں شہادت ہے۔ اس طرح موت کے آئینے میں رُخِ یار دکھا کر اسے شہادت کیلئے تیار کرے۔ انسان پر بے عملی کی کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب اسے اپنے نفع و نقصان کا احساس نہ رہے۔ جس شخص کے دل میں اپنے نقصان کا احساس پیدا ہو جاتا ہے وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی تلافی کی کوشش کرتا ہے۔ مسلمانوں میں اب اپنے اسلاف جیسے کارنامے سرانجام دینے کا شوق نہیں رہا۔ جب مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کو اپنا نصب العین قرار دے کر اس کی راہ میں جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی خلافت سے سرفراز فرمایا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کے دلوں پر موت کا خوف طاری ہو گیا وہ دنیا میں ایسے منہمک ہو گئے کہ آخرت کو بھول گئے اور ملک "لا یبلیٰ" کو چھوڑ کر "متاعِ قلیل" سے محبت کرنے لگے۔ یہ ایسا نقصان ہے جسے قرآن پاک نے زمانے کی قسم کھا کر بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سب انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک اعمال کئے، حق کی وصیت کرتے رہے اور اللہ کی راہ میں مشقتیں اٹھانے پر خود بھی صبر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ ہماری موجودہ بے عمل اور بے کیف زندگی سے دین و دنیا کا نقصان ہو رہا ہے لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہے ؎

وائے نادانی متاعِ کارواں جاتا رہا —!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

امام میں یہ وصف ہونا چاہیئے کہ وہ قوم کو نقصان کا احساس دلا کر اس کا لہو گرما دے اور اسے حق کو غالب اور باطل کو سرنگوں کرنے کے لیے بے تاب کر دے۔

دنیا کی محبّت انسان کو اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ اس کے دل سے حلال و حرام کی تمیز کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ دولت کی حرص اور ہوس میں انسان اپنے مرتبے کو بھی نہیں پہچانتا اور جس طرح بھی اسے دولت میسّر آئے حاصل کرتا چلا جاتا ہے ۔ جلبِ زر کی دوڑ شروع ہو تو رند اور فقیہہ، امیر اور وزیر سب اس میں شریک ہو جاتے ہیں اور ہر شخص دوسروں سے سبقت لے جانے کی فکر میں رہتا ہے ۔ دین کو غالب کرنے کی فکر دلوں سے محو ہو جاتی ہے اور انسان سیم و زر کا غلام بن کر رہ جاتا ہے ۔ ان سب باتوں کا علاج فقر ہے ۔ جب مسلمان فقر کی سان پر چڑھتا ہے تو تلوار بن جاتا ہے ۔ فقر کے ساتھ اس میں زورِ حیدری اور صدقِ سلمانی جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو دنیا سے جور و استبداد کو مٹا کر ایک اسلامی عادلانہ حکومت قائم کرنے کا ذریعہ ہیں ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانی

قائد میں یہ صفت ہونی چاہیئے کہ وہ مسلمانوں میں فقر کی شان پیدا کر کے انہیں غیر اللہ سے بے نیاز کر دے ۔ غیر اللہ کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے والا شخص جسمانی طور پر آزاد بھی ہو جائے تو پھر بھی ایک مدّت تک ذہنی غلامی میں مبتلا رہتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے صاحبِ اقتدار اشخاص کے تقرّب میں عزّت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے وہ خوشامد اور چاپلوسی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے ۔ حاکمِ وقت کے ساتھ وفاداری اس کا دین بن جاتا ہے ۔ صاحبِ اقتدار اپنی عزّت اسی میں سمجھتا ہے کہ اس کا اپنا حکم چلے کیونکہ خدا کا حکم نافذ کرنے میں وہ بھی عام آدمی کے مساوی ہو جاتا ہے ۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے امام اور شیوخ بھی امّت میں بیداری، فقر اور خودداری پیدا کرنے کی بجائے انہیں حاکمِ وقت سے وفاداری کا درس دیتے ہیں اور یوں زندہ قوم میں موت کے آثار پیدا کر کے اسے بہت بڑے فتنے سے دوچار کر دیتے ہیں اس لئے حقیقی قائد وہی ہے جو امّت کو سلاطین کا پرستار بنانے کی بجائے خدا کا پرستار بنائے ؎

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

نواں باب

اسلام میں عورت کی حیثیت

اسلام میں عورت کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ عورت کو جو مقام اور مرتبہ اسلام نے عطا کیا وہ کسی اور فلسفے اور نظریے میں نہیں۔ اسلام نے عورت کی فطرت کے مطابق اس کے حقوق و فرائض متعیّن کئے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے جسم اور مزاج میں جو فرق ہے اسلام نے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لئے الگ الگ دائرہ کار مقرر کر دیا ہے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ عورت اور مرد ہر معاملے میں یکساں ہیں۔ دراصل یہ ایک نفسیاتی الجھن ہے جو ان لوگوں کی پیدا کردہ ہے جو عورت کو سامانِ عیش بنانا چاہتے ہیں اور اس کے تقدس اور احترام کے قائل نہیں۔ اسلام میں عورت کو جو تقدّس حاصل ہے وہ نہ تو اسے زمانۂ جاہلیت میں حاصل تھا اور نہ ہی جدید دور کے فلسفوں میں عطا کیا گیا ہے۔ یونانی فلسفے، زردشتی افکار، ہندو دھرم، کلیسائی نظریات، اشتراکیت اور دیگر خود ساختہ نظریات میں سے کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں جس میں عورت کے احترام کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ عورت صرف مرد کی شریکِ حیات ہی نہیں بلکہ گھر اور بچوں کی نگران بھی ہے۔ ان کی تعلیم اور کردار سازی میں اس کا اہم کردار ہے۔ عورت کا مرتبہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دنیا کی پسندیدہ چیزوں میں خوشبو اور نماز کے ساتھ عورت کا ذکر کیا ہے۔

آنکہ نازد بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جن کے وجود پر کائنات کو ناز ہے نے عورت کا ذکر خوشبو اور نماز کے ساتھ کیا ہے ۔

عورت مرد کی کنیز نہیں ہوتی کہ اس کے ہر جائز اور ناجائز حکم کی تکمیل کرتی چلی جائے جو لوگ اس حد تک عورت کو اپنا پرستار بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور انہوں نے قرآن پاک کی حکمت کو نہیں سمجھا۔ جس طرح مردوں پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ مرد اُن کے اِن فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ جس کام میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی ہوتی ہو اس میں کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ عورتوں کے لئے اپنے شوہروں کی اطاعت بھی اسی اصول کے تحت ہے ۔ اگر عورت کوئی صحیح مشورہ دے تو اس پر عمل ہونا چاہیئے۔ اگر مرد کی رائے بہتر ہو تو اس کے مطابق کام ہونا چاہیئے۔ عورت کی حیثیت گھر کی مالکہ کی ہوتی ہے کنیز اور خادمہ کی نہیں ہوتی۔ جو لوگ عورت کو کنیز اور خادمہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے زیادہ اسے کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں وہ غلطی پر ہیں۔

ابنِ ماجہ میں ہے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بیویوں کو مارنے پیٹنے سے منع فرما دیا تھا۔ ایک دن حضرت عمرؓ خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! عورتیں بہت شوخ ہو گئی ہیں انہیں مطیع کرنے کے لئے مارنے پیٹنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ آپ نے اجازت دے دی۔ لوگ نامعلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے اور محض حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روکنے کی وجہ سے بیویوں کو مارنے سے رُکے ہوئے تھے۔ یہ اجازت ملتے ہی ان لوگوں کو موقع مل گیا جنہیں اپنی بیویوں کے خلاف شکایت تھی چنانچہ انہوں نے اپنی بیویوں کو مار پیٹ کر دل کی بھڑاس نکالی ـــــ اس طرح ستّر عورتیں اپنے گھروں میں خاوندوں کی مار پیٹ سے متاثر ہوئیں۔ اگلے دن عورتیں جمع ہو کر خدمتِ نبویؐ میں فریاد کناں ہوئیں اور اپنے اپنے خاوندوں کے خلاف مار پیٹ کی شکایت کی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے

لوگوں کو جمع کیا اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا " آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکّر لگایا ہے ۔ ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ۔" (عربی میں ستر کا لفظ کثرت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اس لئے ستر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سی عورتوں نے شکایت کی ہے)، قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ عورتوں کے ساتھ اچھے انسانوں کی طرح زندگی گزارو ۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو شخص عورت کو محض باندی اور پرستار سمجھتا ہے وہ حکمتِ قرآن سے بے بہرہ ہے ؎

مسلمے کو را پرستارے شمرد
بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد

جو مسلمان عورت کو اپنا پرستار سمجھے اس نے حکمتِ قرآن سے کچھ حصہ نہیں پایا ۔

بچّے کی ابتدائی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے ۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمان عورتوں نے اسلامی اصولوں کے مطابق بچّوں کی تربیت کر کے ایسے مجاہد پیدا کئے کہ انہوں نے اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جہاد کیا اور شجاعت و جوانمردی کے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ ان کی بدولت تاریخ اسلامی کے اوراق آج بھی تابندہ ہیں۔

بچّے کی تعلیم و تربیت میں جو مشقّت اٹھانی پڑتی ہے اس میں ماں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے اولاد کے لئے اس کے حُسنِ سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ماں کو قرار دیا گیا ہے ۔

ایک صحابیؓ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے ۔ آپؐ نے فرمایا تیری ماں ۔ اس نے پھر پوچھا اس کے بعد کون ہے ؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں ۔ اس نے پھر پوچھا اس کے بعد کون ؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں ۔ چوتھی مرتبہ دریافت کرنے پر آپؐ نے فرمایا : تیرا باپ ۔

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ جنّت ماں کے قدموں تلے ہے ؎

گفت آں مقصود حرفِ کُن فکاں

زیرِ پائے امّہات آمد جناں

اس مقصودِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جنّت ماں کے قدموں تلے ہے۔ عورت کا وجود ملّت کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔ اس کی ہی گود میں بڑے بڑے انبیاء اور اولیا نے پرورش پائی۔ ماؤں ہی نے ایسے مجاہدوں کی تربیت کی جنہوں نے دنیا میں انقلاب برپا کئے اور باطل نظام ہائے زندگی کو مٹا کر حق کے چراغ روشن کئے۔ قوموں کی سیرت و کردار کی تشکیل میں ماؤں کا بڑا دخل ہوتا ہے ؎

نیک اگر بینی امومت رحمت است

زانکہ او را با نبوّت نسبت است

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است

سیرتِ اقوام را صورت گر است

اگر تو خوش نظری سے کام لے تو ماں کا وجود رحمت ہے۔ کیونکہ اسے نبوّت سے تعلقِ خاطر ہے۔ اس کی شفقت پیغمبر کی شفقت ہے اور وہ قوموں کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔

ماں بچّے کو ابتدا میں جو اچھی باتیں بتاتی ہے وہ اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ بچّے زندگی کے طور طریقے اور آداب ماں ہی سے سیکھتے ہیں۔ ماں کی تربیت بچّے کی گفتار و کردار، رنگ ڈھنگ اور اندازِ فکر پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ بچپن میں سیکھی ہوئی باتیں دل و دماغ میں نقش کالحجر ہو جاتی ہیں اس لئے اچھی مائیں بچّے کے زبان کھولنے پر اللہ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ سکھاتی ہیں۔

کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شُست لا اِلٰہ آموختی او را نخُست

می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما
فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

ہمارے بچے نے جب اپنے لب تیرے دودھ سے دھولئے یعنی دودھ پلنا چھوڑ دیا تو تو نے سب سے پہلے کلمہ طیبہ سکھایا۔ تیری محبت ہمارے طور طریقے، ہماری فکر، ہماری گفتار اور ہمارے کردار کی تشکیل کرتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر ننگی رہیں (یعنی بہت باریک کپڑے یا مختصر اور تنگ لباس پہنیں) اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کریں اور خود ان کی طرف مائل ہوں اور بختی اونٹ کی طرح گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی۔

یوں تو جبلتِ خود نمائی ہر شخص میں موجود ہوتی ہے لیکن عورتوں میں یہ جبلت زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنے حسن کی نمائش کے لئے تیز سے تیز رنگ کا انتخاب کرتی ہیں۔ ابروؤں اور آنکھوں کو مصنوعی طریقوں سے جاذبِ نظر بناتی ہیں۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے بالوں کی آرائش کرتی ہیں۔ اور اس طرح بنتی سنورتی ہیں کہ وہ جس محفل میں جائیں رونقِ محفل بن جائیں۔ اسلام نے عورت کو ہر طرح کی زیب و زینت کی اجازت دی ہے لیکن اسے نامحرم مردوں کے سامنے نمائش سے منع کیا ہے۔

فرعون اپنے زمانے کا جابر حکمران تھا۔ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے۔ جو اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا اور لوگوں کو اس کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرے گا تو اس نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرانا شروع کر دیا تاکہ اسے ان کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں اس دور میں حکمتِ فرعونی تبدیل ہو گئی ہے۔ اب بچوں کو جسمانی طور پر قتل نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی روحوں کو بے جان کر دیا جاتا ہے۔ بے پردہ

مائیں جو بازاروں میں بن سنور کر نکلتی ہیں اور لوگوں کی نظروں کے لیے سامانِ عیش فراہم کرتی ہیں، مجاہد بچوں کو جنم نہیں دے سکتیں۔ اس دور کے فرعونوں کی یہ حکمت ہے کہ انہوں نے عورتوں کو مساوات اور آزادی کے نام پر بے حجابی اور بے حیائی کا درس دیا تاکہ وہ باکردار مجاہد بچوں کو جنم دے کر ان کی خدائی کے لیے خطرہ پیدا نہ کریں۔ ایسی عورتیں اوّل تو بچوں کی تربیت کے کام سے ہی بیزار ہو گئیں۔ اور اگر انہوں نے بچوں کی تربیت بھی کی تو وہ مجاہد پیدا نہ کر سکیں۔ جن بچوں کی وہ تربیت کرتی ہیں وہ اسلام کی محبت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ ان میں حق کی خاطر مرمٹنے کے جذبے کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں لازوال آرزوئیں اور تمنائیں نہیں ہوتیں۔ دنیا کی بے ثبات آرزوؤں کے سوا ان کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے ان کی ماؤں نے مُردہ جنا ہو۔ لڑکیاں ہر وقت اپنی زلفیں سنوارنے میں منہمک رہتی ہیں اور بن سنور کر باہر نکلتی ہیں۔ انہیں اپنے حسن کی نمائش کرنے اور دوسروں کی عیب جوئی کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا اس طرح قوم کے بگاڑ کا سلسلہ جاری ہے۔ ؎

بے نصیب آمد ز اولادِ غیور
جاں بہ تن چوں مردۂ در خاکِ گور
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات
مُردہ زایند از بُطونِ امہات
دخترانِ اُو بزلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خوردہ گیر
ساختہ پرداختہ دل باختہ
ابروان مثلِ دو تیغ آختہ

قوم کی مائیں غیرت مند اولاد سے محروم ہو گئیں۔ ان کے بچّوں کے جسم میں ایسی جان ہوتی ہے جیسے قبر میں مردہ دفن ہو۔ بڑے بوڑھے حیا سے بیگانہ ہیں۔ نوجوان عورتوں کی طرح اپنا جسم سنوارنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کے دل میں صرف فانی تمنائیں ہوتی ہیں جیسے اپنی ماؤں کے شکموں سے مردہ جنے گئے ہوں۔ اس کی لڑکیاں اپنی زلف کی اسیر ہوتی ہیں، شوخ چشم، اپنی نمائش کرنے والی اور دوسروں کی عیب جوئی کرنے والی۔ آراستہ و پیراستہ اور دل باختہ ہوتی ہیں۔ ان کے ابرو دو سونتی ہوئی تلواروں کی طرح ہوتے ہیں۔

تہذیب و تمدّن، افکار اور نام نہاد آزادی کے تصوّر نے انہیں حیا سے عاری کر دیا ہے۔ ایسی عورتیں دراصل مغربی افکار سے متاثر ہیں۔ جس طرح کوّا ہنس کی چال چلنے لگے تو اپنی چال بھی بھول جاتا ہے اسی طرح عورتیں اپنے آپ کو ہر لحاظ سے مردوں کے برابر ثابت کرنے کے شوق میں زنانہ صفات سے بے بہرہ ہو کر نا عورت بن گئی ہیں۔ معاشرے کے بگاڑ کی ذمّہ داری بہت حد تک ایسی عورتوں پر ہے۔ یہی اخلاقی انحطاط اور بے راہ روی کا موجب ہیں۔ یہ ترقی نہیں بلکہ زوال ہے۔ ایسی عورتوں سے قوم کا دامن جتنی جلدی پاک ہو جائے اچھا ہے۔ کسی قوم کی عورتوں کا یہ حال اس کے روبہ زوال ہونے کی علامت ہوتا ہے۔

قوم کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ضروری ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ ایسی عورتوں کی بھی اصلاح کی جائے، اور انہیں اس آئین کا پابند بنایا جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا ہے۔

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن، باطنِ او نازن است!
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد یش
از حیا ناآشنا آزاد یش
ایں گُل از بستانِ ما نارُستہ بہ
داغش از دامانِ ملّت شُستہ بہ

اس کا فکر مغرب کی چمک سے روشن ہے۔ بظاہر وہ عورت ہے لیکن بباطن نا عورت ہے۔ اس شوخ چشم کی آزادی فتنہ پرور ہے اور حیا سے نا آشنا۔ ہمارے باغ میں ایسے پھول کا نہ اگنا ہی اچھا ہے اور قوم کے دامن سے اس کا داغ دھل جائے تو بہتر ہے۔

شرم و حیا کے جوہر سے عورت میں جرأت و ہمّت پیدا ہوتی ہے۔ حیا سے عاری عورت بزدل اور کمزور ہوتی ہے۔ وہ اپنی عزّت و عصمت کی حفاظت کرنے کی بجائے زمانے کی رَو کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے: اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَان۔ حیا ایمان کا حصّہ ہے۔ ابتدائی زمانے کی مسلمان عورتیں حیا کے زیور سے آراستہ ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ بہادر اور جرأت مند تھیں۔ اور ان کی گود میں پرورش پانے والے بچّے بھی باہمّت اور دلیر ہوتے تھے۔

جنگِ یرموک کے ایک محاذ کے قریب دشمن کے کچھ آدمیوں نے موقع پاکر خواتین کے خیموں پر حملہ کر دیا۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے بعض دوسری خواتین کے ساتھ خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر دشمن پہ وار کئے اور ان کا مقابلہ کرتی رہیں۔ اتنے میں حضرت خالد بن ولید ایک دستے کے ہمراہ پہنچ گئے اور دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

جنگِ خندق میں ایک یہودی خندق عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اسے ایک ہی ضرب سے جہنّم رسید کر دیا۔ عہدِ نبوّی میں بعض جنگوں میں خواتین نے حصّہ لیا۔ ان کی جماعت کھانا پکاتی، زخمیوں کو پانی پلاتی اور مرہم پٹی کرتی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی تھی۔ اس لئے بعض کام عورتوں کے سپرد کر دیئے جاتے۔ جنگِ احد میں حضرت عائشہ صدیقہ، اُمّ سلیم، اُمّ عمّارہ اور اُمّ حرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی۔ جنگِ حنین میں اُمّ سلیمؓ ہاتھ میں ایک خنجر لئے پھر رہی تھیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پوچھا یہ کس لئے ہے۔ کہنے لگیں کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ اب بھی جنگ کے دوران سخت ضرورت کے وقت بعض کام جو پردے کے ساتھ انجام دیئے جا سکتے ہیں عورتوں کے سپرد کئے جا سکتے ہیں لیکن عورت کی اصل ذمّہ داری گھر کی نگرانی اور بچّوں کی تعلیم و تربیت ہے۔

علامہ اقبال عورتوں کو کن خصوصیات کا حامل دیکھنا چاہتے تھے اس کا اندازہ ان کے بیان کردہ دو واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ چودہ سالہ عرب لڑکی ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس میں زخمی مجاہدوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی۔ علامہ اقبال کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے متعلق ایک یادگار نظم لکھی جس کا پہلا شعر ہے:

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے!
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اس نظم میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ فاطمہ کے غم میں ہماری آنکھیں نمناک ہیں لیکن اس غم میں خوشی کا ایک پہلو بھی ہے کہ ابھی ہماری قوم میں فاطمہ جیسی لڑکیاں موجود ہیں جو جذبہ جہاد سے سرشار ہیں۔

دوسرا واقعہ شرف النساء خانم کا ہے۔ یہ خاتون نماز فجر کے بعد اپنے محل میں چبوترے پر بیٹھ کر کلام مجید کی تلاوت کرتی تھیں اور ایک مرصع تلوار اپنے پاس رکھتی تھیں۔ تلاوت ختم کرنے کے بعد قرآن مجید بند کر کے اس کے پاس تلوار رکھ کر نیچے آجاتیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق یہ تلوار ان کی قبر پر رکھ دی گئی۔ علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان عورتیں اپنے اندر یہی سپرٹ پیدا کریں۔

ایک طرف حیا سے آراستہ حضرت خولہؓ، اُمِّ سلیم اور شرف النساء خانم ایسی غیرتمند خواتین کا یہ کردار ہے اور دوسری طرف غیرت سے عاری اور اپنے آپ کو مردوں کے بہلاوے کا سامان سمجھنے والی ناز و نعمت میں پلی ہوئی عورتوں کا کردار ملاحظہ کیجیے۔

غلام قادر روہیلہ نے تیموری خاندان کے ایک بادشاہ شاہ عالم ثانی پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اس کے گھر کی عورتوں کو رقص کرنے کا حکم دیا۔ وہ نازنین شہزادیاں جو چند قدم کا فاصلہ بھی، بیسیوں خادماؤں کے جلو میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ طے کرتی تھیں، جن کے ایک اشارۂ ابرو پر بادشاہ کے فیصلے تبدیل ہو جاتے تھے

اور جن کی پیشانی پر بل پڑتے تو سمندر کی لہروں کی طرح بادشاہ کے دل میں ارتعاش پیدا کر دیتے تھے، اس حکم کی تعمیل میں ان کے قدم بھی رقص کے لئے حرکت کرنے لگے۔ غلام قادر روہیلہ نے یہ منظر دیکھ کر اپنی کمر سے لٹکتا ہوا خنجر نکالا اور قریب رکھ کر ایک مسند پر یوں محوِ خواب ہوا گویا کئی دنوں کے رَت جگے کا شکار ہے۔ وہ پری پیکر اسی طرح رقص کرتی رہیں۔ غلام قادر روہیلہ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور ان خواتین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: میں ایک سپاہی ہوں اور وہ سپاہی ہی کیا جسے چند لمحوں کے لئے ہی غفلت گھیر لے۔ میں نے جان بوجھ کر اس لئے آنکھیں بند کی تھیں کہ تم میں سے کوئی غیرت مند خاتون اٹھے اور میرے خنجر سے میرا کام تمام کر دے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے اندر غیرت اور حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔ تیموری خاندان کے گھر سے غیرت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اسی لئے تمہیں آج یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔

رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے!
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں سے
نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے!
پھر اُٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شایانِ صف آرا نِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر!
حمیّت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ظہر کی نماز کے بعد صحابیات رضی اللہ عنہم کو وقت دیا کرتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی مسئلہ سمجھنا چاہتیں تو سمجھ لیتیں۔ اس موقع پر امہات المومنین میں سے بھی کوئی نہ کوئی موجود رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ حضرت اسماء بنتِ یزید انصاریہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یارسولؐ اللہ! کیا آپ عورتوں اور مردوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں! اسماء بنتِ یزید انصاریہؓ نے عرض کی، میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے عورتوں کی طرف سے آپ کی طرف نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ کچھ گذارشات کر سکوں۔ حضورؐ نے اجازت مرحمت فرمائی تو اسماء رضی اللہ عنہا نے عرض کی، یارسول اللہ عورتوں کو مردوں کے برابر ثواب کے مواقع حاصل نہیں۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! مردوں کے لئے جمعہ ہے۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت ہے۔ عیدین کی نمازیں ہیں۔ وہ مسلمان کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں تجہیز و تکفین کرتے ہیں۔ جبکہ ہم جنازے کو کندھا نہیں دے سکتیں۔ دفن میں شریک نہیں ہو سکتیں۔ عیادت کا حکم بھی مردوں کے لئے ہے۔ ہم اپنے طور پر چلی جائیں تو یہ اور بات ہے مرد حج پر تنہا چلے جاتے ہیں ہم محرم کے بغیر نہیں جا سکتیں۔ مرد جہاد میں شریک ہوتے ہیں ہم ہتھیار لے کر میدانِ جنگ میں نہیں جا سکتیں۔"

عورتوں کو باجماعت نماز کی لئے مسجد میں جانے کی اجازت تو ہے لیکن ان پر باجماعت فرض نہیں۔ حکم ہے کہ آخری صف میں کھڑی ہوں اور جماعت ہوتے ہی نکل جائیں۔ اسی طرح جمعہ کی نماز کے لئے جا سکتی ہیں لیکن فرض وہ بھی نہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں عیدین کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ بے شک عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہے لیکن ان کا نہ جانا ہی مناسب ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی باتیں غور سے سنتے رہے اور

مسکراتے رہے۔ گویا ثواب حاصل کرنے کے لئے انہیں حریص دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔
پھر جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا باجماعت نماز کا ثواب رکھتا ہے۔ گھر میں نماز پڑھنے سے انہیں جمعہ پڑھنے کا بھی ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے لئے عید کی نماز معاف ہے۔ اگر پڑھ لے تو اور بات ہے۔ جو عورت شوہر کی اطاعت گزار ہو، بچوں کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے اسے گھر بیٹھے حج اور جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ جو جہاد میں خود شریک نہ ہو سکے لیکن جہاد کا سامان مہیا کر دے، مجاہدوں کی مدد کرے یا ان کی غیر حاضری میں ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کرے اسے بھی جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ عورت اگر مجاہد کی ماں، بہن یا بیوی ہو تو وہ بھی ثواب کی حق دار ہوتی ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک اور موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: عورتوں کا جہاد حج ہے۔ عورتیں گھر کے ایک حصے میں اعتکاف بھی کر سکتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ عورتوں کو گھر بیٹھے مردوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔ عورتوں کے لئے پردہ ضروری ہے۔ اور ان کے لئے بوجھ اٹھانا بھی مشکل ہے۔ عورتوں کے لئے جذبات پر قابو رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے نہ صرف جنازے کو کندھا دینے کی اجازت نہیں بلکہ انہیں قبرستان جانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس تعلیم کا عملی نمونہ تھیں۔ آپ نے براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی۔ اس لئے آپ کی زندگی مکمل طور پر اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ عورتوں کے لئے ہر لحاظ سے کامل نمونہ ہیں۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول مادراں را اسوۂ کامل بتول

تسلیم و رضا کی کھیتی کا حاصل حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ ماؤں کیلئے کامل نمونہ ہیں۔
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کا کام کاج خود کرتی تھیں۔ برتن دھونا، کپڑے سینا، گھر کی

کی صفائی کرنا، چکی پیسنا، روٹی پکانا الغرض گھر کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو سیدۃ النسار خود نہ کرتی ہوں یہی حال امہات المؤمنین کا بھی تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود چکی پیستی تھیں جس سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ خود مشک بھر کر لاتی تھیں جس سے سینے پر رسی کے نشان پڑ گئے تھے۔ خود ہی جھاڑو دیتی تھیں جس سے کپڑے میلے رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لونڈی غلام آئے۔ میں نے حضرت فاطمہ سے کہا کہ تم اگر اپنے والد کی خدمت میں جاکر ایک خادم مانگ لاؤ تو اچھا ہے، کام کاج میں آسانی ہوگی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گئیں تو صحابہ کرام کی موجودگی کی وجہ سے شرم وحیا مانع ہوئی۔ اس لئے واپس چلی آئیں۔ دوسرے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائے اور فرمایا کل کس کام کو آئی تھیں۔ وہ چپ ہوگئیں۔ میں نے عرض کی حضورؐ! چکی سے ہاتھ میں نشان پڑ گئے تھے۔ مشکیزہ بھرنے کی وجہ سے سینہ پر بھی نشان پڑ گیا ہے۔ جھاڑو دینے کی وجہ سے کپڑے میلے ہوجاتے ہیں۔ کل آپؐ کے پاس لونڈی غلام آئے تھے اس لئے میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر ایک خادم مانگ لائیں تو ان مشقتوں سے سہولت ہوجائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہو اور جب سونے کے لئے لیٹو تو سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ خادم سے بہتر ہے۔ انہوں نے کہا میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے راضی ہوں۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کام کاج کرتے وقت بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ ایسا کرنے سے برکت ہوتی ہے بشرطیکہ رزق حلال طریقے سے کمایا گیا ہو۔ اس میں رشوت کے پیسے نہ ہوں، غبن نہ ہو۔ یا کمائی کا کوئی دوسرا ناجائز ذریعہ اختیار نہ کیا گیا ہو ؎

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

وہ صبر و رضا کی تربیت یافتہ چکّی پیستی تھیں اور لبوں پر قرآن جاری ہوتا تھا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دین کی حقیقت کو سمجھ لیا تھا اس لئے وہ گھر کے کام کاج بھی سرانجام دیتی تھیں۔ شوہر کی خدمت بھی کرتی تھیں ۔۔ بندوں کے حقوق بھی ادا کرتی اور اللہ تعالےٰ کے حقوق سے بھی غافل نہ تھیں۔ بحیثیت بیٹی، بحیثیت بیوی اور بحیثیت ماں کے ان کی زندگی میں مسلمان عورتوں کے لئے اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔ آپ اطاعت و فرمانبرداری، قربانی و ایثار، صبر و رضا صدق و صفا اور جود و سخا کا پیکر تھیں۔ کسی محتاج کو دیکھ کر آپ کا دل پگھل جاتا تھا اور آپ ہر طرح اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتیں۔ خود فاقہ برداشت کر لیتیں مگر کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتیں۔

ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو خاتونِ جنّت سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے منّت مانی کہ اگر ان کے بیٹے کو شفا ہوئی تو وہ شکرانے کے طور پر تین روزے رکھیں گی۔ وہ دین کی روح کو سمجھتی تھیں اس لئے انہوں نے کسی مزار کا رُخ نہیں کیا اور نہ ہی کسی اور کے نام کی کوئی منّت یا نذر مانی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایسا کرنا عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔

مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: ایک دفعہ ایک آدمی مکھّی کی وجہ سے جہنّم میں چلا گیا اور دوسرا ایک مکھّی کی وجہ سے جنّت میں چلا گیا۔ صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہؐ! مکھی کی وجہ سے جہنّم اور جنّت میں کیسے چلے گئے۔ آپ نے فرمایا دو آدمی ایک قبیلے کے بت کے پاس سے گزرے۔ قبیلے والوں کا دستور تھا کہ اس بُت پر چڑھاوا چڑھائے بغیر وہاں سے کسی کو گزرنے نہیں دیتے تھے۔ قبیلے والوں نے ایک شخص سے کہا کہ کوئی چیز اس بت کی نذر کرو۔ اس شخص نے کہا میرے پاس تو کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا ایک مکھّی پکڑ کر اس کی نذر کر دو۔ اس نے مکھّی پکڑی اور بت کی نذر کر دی۔ دوسرے شخص سے بھی انہوں نے کہا کہ کوئی چیز اس بُت کی نذر کرو۔ اس نے کہا میرے پاس تو کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا ایک مکھّی پکڑ کر اس کی نذر کر دو۔ اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے نام کی نذر نیاز کرنا شرک سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اسے شہید کر دیا۔ اس طرح پہلا شخص ایک مکھّی کی وجہ سے جہنّم میں چلا گیا اور دوسرا مکھّی

کی وجہ سے جنّت میں چلا گیا۔

قرونِ اُولیٰ میں مسلمان ایسی ہی منّتیں اور نذریں مانتے تھے جیسی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مانی تھی۔ اوّل تو وہ کسی کام سے مشروط کئے بغیر نذر مانتے تھے اور اگر کسی کام سے مشروط بھی کرتے تو ایسے کہتے کہ میرا فلاں کام ہوگیا تو اتنے روزے رکھوں گا، اتنے نفل پڑھوں گا، اتنے طواف کروں گا، عمرہ کروں گا، حج کروں گا، اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا۔ یا اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کروں گا۔ مسعود غزنوی جو محمود غزنوی کا بیٹا تھا بیمار ہوا تو اس نے منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے صحت دے گا تو وہ ہندوستان میں بت پرستوں کا ایک قلعہ فتح کرے گا۔ چنانچہ صحتیاب ہونے پر اس نے اس منّت کو پورا کیا۔ مجاہدوں کی منّتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی۔ بے قراری کے عالم میں ماں کے دل سے نکلی ہوئی دعا تو ویسے ہی مقبولِ بارگاہ ہوتی ہے۔ وہ تو پھر دو جہانوں کے سردار کی صاحب زادی تھیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ صحت یاب ہوگئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے منّت پوری کرنے کے لئے روزہ رکھا۔ افطار کے وقت سب کو کھلا کر خود کھانے بیٹھی تھیں کہ دروازے پر ایک بھوکا سائل آگیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی روٹی اٹھائی اور سائل کو دے دی۔ دوسرے دن پھر روزہ رکھا۔ افطار کا وقت آیا تو ایک یتیم آگیا جو کئی دنوں کا بھوکا تھا اور بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا۔ آپ نے اسے بلایا اور اپنے حصّہ کی روٹی کھلائی۔ جو تھوڑا بہت بچ رہا وہ کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ البتّہ اس سے ان کی بھوک نہ مٹی۔ تیسرے دن پھر روزہ رکھا۔ یہ ان کی منّت کا آخری روزہ تھا۔ شام کو افطار کرنے بیٹھیں تو پھر دروازے پر ایک سائل آگیا۔ یہ مسافر تھا اور امداد کا مستحق تھا۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اٹھیں اور تیسرے دن کی روٹی بھی مسافر کو دیدی۔ تین دن کے مسلسل روزوں اور بھوک کے مطابق کھانے کو نہ ملنے سے ان کی یہ حالت ہوگئی

تھی کہ دروازے سے واپس لوٹیں تو ٹھکرا کر گر پڑیں۔ آج ہمیں اللہ کی راہ میں ذرا سی تکلیف پہنچنے لگے تو ہمیں فوراً یہ آیت یاد آجاتی ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کی قوّتِ برداشت سے زیادہ کا مُکلّف نہیں ٹھہرایا۔ لیکن ہم نے کبھی یہ اندازہ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنی قوّتِ برداشت اور کتنی وسعت سے نوازا ہے۔

جدید تہذیب کے علمبردار کہتے ہیں کہ پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔ یہ محض عورتوں کو گھر سے نکال کر رونقِ محفل بنانے کا ایک بہانہ ہے۔ قدرت نے عورت کے ذمّے جو کام اس کی جسمانی ساخت اور قوّت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لگائے ہیں وہ پردے میں بھی سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ بے حجابی تو جدید دور کی پیداوار ہے۔ ورنہ پہلے زمانے میں عورتیں پردے میں رہتے ہوئے سارے کام سرانجام دیتی تھیں۔ موجودہ زمانے میں مادّی ترقی اور ظاہری چمک دمک کو کامیابی کی کلید سمجھ لیا گیا ہے ــــ حالانکہ اسلام میں کامیابی کا تصوّر اس سے مختلف ہے۔ اگر مادّی ترقی مسلمان کو اس کے اصل فرائض سے غافل کر کے اسلام کے ابدی اصولوں سے ہٹا دے تو یہ مسلمان کے لئے ترقی نہیں بلکہ زوال کی علامت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے وہ سب سے بڑی ہستی ہے اور حَیٌّ قَیُّوْمٌ اور لافانی ذات ہے۔ یہ جہان اس کے نور سے روشن ہے لیکن وہ ہزاروں جلووں کے باوجود پردے میں ہے۔ مسلمان عورتیں اس حقیقت پر غور کریں تو وہ بھی پردے میں رہتے ہوئے اپنے اصل فرائض سے عہدہ برآ ہو کر دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتی ہیں۔ اگر عورت اپنے بچوں کی اصلاح کر دے تو پوری قوم سدھر سکتی ہے اس کے لئے کسی بے حجابی کی ضرورت نہیں ؎

ضمیرِ عصر حاضر بے نقاب است
کشادش در نمودِ رنگ و آب است

جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز
کہ او باصد تجلّی در حجاب است

موجودہ زمانے کا راز ظاہر ہو گیا ہے۔ اس کی کامیابی ظاہری چمک دمک میں ہے۔ جہان کو روشن کرنے کا کام اللہ تعالیٰ سے سیکھ کہ وہ سینکڑوں جلوؤں کے ساتھ پردے میں ہے۔

عورت گھر میں بچے کی صحیح تربیت کر کے زندۂ جاوید ہو سکتی ہے۔ وہ ایک مجاہد مردِ مومن کی ماں ہونے پر فخر کر سکتی ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پردے میں رہ کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تربیت کی۔ چنانچہ وہ حق و صداقت کا علم بلند کرنے کے لئے تنہا نکل کھڑے ہوئے جب انہوں نے دیکھا کہ اسلامی روایات کو پامال کیا جا رہا ہے، نظام حکومت سے اسلامی روح نکلتی جا رہی ہے، اسلام صرف مسلمانوں کی نجی زندگی تک محدود ہوتا جا رہا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے آنے والے خطرات کو بھانپ لیا اور اس نظامِ باطل کو بدل کر صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ وہ غیرت مند اور دلیر تھے۔ انہوں نے راہِ خدا میں جان دینی منظور کر لی لیکن طاغوتی طاقتوں سے کسی قسم کی سودا بازی کر کے اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ آپ اپنی جان قربان کر کے ہمیں یہ سبق دے گئے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دستور کے علاوہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت میں ذلّت کی زندگی بسر کرنے سے باعزّت طریقے سے جان دے دینا بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام سے برگشتہ انسان کی اطاعت اختیار کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔ آج بھی دنیا میں یزیدیت موجود ہے۔ لیکن اس کو ختم کرنے کے لئے کوئی حسین موجود نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان عورتوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی اختیار نہیں کی اور ان کی گود میں پلنے والا کوئی بچّہ حسین نہیں بن سکا ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

آج بھی اگر مسلمان عورتیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنی

زندگی کی راہ متعیّن کریں، اپنے اندر بتولؓ والی صفات پیدا کریں تو وہ بھی کسی حُسین کی ماں بن کر حیاتِ جاودانی حاصل کر سکتی ہیں ؎

اگر پندے زدرویشے پذیری
ہزار اُمّت بمیرد تو نہ میری !
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبّیرے بگیری !

اگر تو اس درویش کی نصیحت قبول کرے تو کتنی ہی کوئی اُمّت کیوں نہ مرجائے تو نہیں مرے گی۔ بتول (فاطمہ رضی اللہ عنہا) بن اور زمانے سے پوشیدہ رہ تاکہ تیری گود میں کوئی شبّیر (حُسینؓ) پرورش پائے۔

دسواں باب

دین کے متعلق غلط تصوّرات

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ بہترین زمانہ میرا زمانہ اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ جو اس کے قریب ہوں گے اور پھر ان لوگوں کا زمانہ جو اس کے قریب ہوں گے۔ ایک اللہ والے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ روٹیاں فروخت کرتے تھے اور باسی روٹی تازہ روٹی کی نسبت مہنگی دیتے تھے۔ جب ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ باسی روٹی ایکدن پہلے کی ہونے کی وجہ سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کے قریب تر ہے اس لئے میری نظر میں یہ تازہ روٹی کی نسبت زیادہ قیمتی ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ان قریب ترین زمانوں میں دین اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر رہا اور اس کے متعلق کوئی غلط تصوّر رواج نہ پا سکا۔ اگر کوئی شخص خواہ ثواب ہی کی نیّت سے کسی نئے طریقے کو اختیار کرتا تو اس کی اسی وقت اصلاح کر دی جاتی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص نے چھینک کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہ کہا تو حضرت عمرؓ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا کیونکہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے چھینک کے بعد صرف الحمد للہ کہنا ہی ثابت تھا۔ آپ کا فرمان ہے کہ جو شخص دین میں کوئی ایسی راہ نکالے جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں سیاسی اور تمدّنی تبدیلیاں رونما

ہوئیں تو دین میں بھی غلط تصوّرات شامل ہونے لگے۔ اسلامی ریاست کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور دوسری اقوام کے ساتھ میل جول بڑھا تو ان تصوّرات اور رسوم و رواج میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ انہیں غلط تصورات اور رسوم و رواج کو مٹانے اور دین کو نکھار کر صحیح صورت میں پیش کرنے کے لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت میں مجدد اور اولیائے کرام پیدا ہوتے رہے۔ لیکن آپؐ کے زمانے سے بُعد کی وجہ سے ان بدعات کا مکمل طور پر خاتمہ نہ ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض اب بھی موجود ہیں۔ ان بدعات، رسوم و رواج اور حصولِ ثواب کے لئے خود ساختہ اعمال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ انہیں بڑے اہتمام اور جوش و جذبے کے ساتھ سرانجام دیا جاتا ہے، اور اپنی زندگی کی تمام تر توانائیاں ان میں صرف کرنے کو سعادت خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے اعمال، طریقوں اور دین کو غالب کرنے کی بات ہوتی ہے تو اس طرف ہماری طبیعتیں بہت کم مائل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح ادراک عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

علّامہ اقبال نے ان غلط تصوّرات، بدعات اور رسوم و عقائد کی نشاندہی کی ہے تاکہ امّتِ مسلمہ کا ہر فرد ان سے آگاہی حاصل کرکے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوسکے۔ ان تصوّرات کو مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش ۲۔ خانقاہی نظام ۳۔ مشرکانہ رسوم و عقائد ۴۔ دین و سیاست کی علیحدگی۔

تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش

"علمِ باطن جس کو اسلامی اصطلاح میں تصوّف کہتے ہیں ایک نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے غرائب

نے اقوام عالم کے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے آدمیوں کو اپنی طرف کھینچا ہے اور عوام کے تخیلات پر گہرا اثر ڈالا ہے[1]۔

اقوام عالم کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ تحریکِ تصوّف مسلمانوں کے لئے خاص نہیں بلکہ ہر مستعد قوم کے عملی انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی ہے۔ تاریخ یونان کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ باطنی تحریک فیثاغورث سے شروع ہوئی۔ افلاطون نے اسے ایک فلسفے کی شکل دی اور پلوٹائنس نے اس میں عیسائیت، ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے افکار شامل کر کے اسے ایک عملی نصب العین کی صورت دے کر لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ اس فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ نظامِ عالم ہستیِ مطلق کی ذات سے مستخرج ہے۔ جسمِ انسانی ایک قید خانہ ہے جس سے خلاصی پانا انسان کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ روحِ انسانی کا انتہائی کمال ذاتِ باری میں فنا ہو کر اپنے ذاتی احساس سے نجات پانا ہے۔ یہ نجات انسان کو اس دنیا میں اس عارضی حالت میں نصیب ہو جاتی ہے جسے وجد یا کیف کہتے ہیں۔

اگر ہم اہل روما کی بربادی پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ دیگر اسباب کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ روما کو اس فلسفے نے عملی جد و جہد سے کنارہ کشی کر کے محض غور و خوض اور بعض دوسرے طریقوں کے ذریعے اپنی باطنی اصلاح پر اکتفا کرنے کا درس دیا جو بعد میں ان کے روبہ زوال ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ہندوؤں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت اپنا زمانہ عروج گزار چکا تو ایک مردِ درویش نے بدھ مت کا فلسفہ پیش کیا جس نے ہندومت کو روبہ زوال کر دیا۔ کیونکہ بدھ مت کی تعلیم میں ترکِ دنیا، رہبانیت اور مجاہدے کے ذریعے اصلاحِ باطن کر کے نروان حاصل کرنے کا عنصر زیادہ تھا اس لئے اس کی اشاعت لوگوں کے قوائے ظاہری

---

[1] تاریخ تصوّف، علامہ اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

اور باطنی پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے منو کی شریعت پر عمل کر کے اپنے قومی تشخص کی حفاظت کی اگر وہ اس پر عمل جاری نہ رکھتے تو ان کا وجود ہی ناپید ہو جاتا۔ اپنی شریعت کی حفاظت ہی کی وجہ سے یہودی قوم زندہ ہے۔ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوّف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔

ایرانی قوم کا مذہب زردشتی تھا۔ یہ لوگ ثنویت یعنی دو خداؤں کے قائل تھے۔ یہ خالقِ خیر کو یزداں اور خالقِ شر کو اہرمن کہتے تھے۔ بعض لوگ توحید کے قائل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نور و ظلمت یا خیر و شر ایک ہی ذات کے دو پہلو ہیں۔ نور سے ظلمت یا خیر سے شر پیدا ہوا۔ گویا ذاتِ حق اپنے آپ سے خود برسرِ پیکار ہے۔

اس مذہب کا ایک فرقہ مہترا کے نام سے موسوم ہوا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ روحِ انسانی روحِ ربّانی کا ایک ذرّہ ہے اور انسان سخت مجاہدے اور دیگر قواعد کی پابندی سے جن کو اس مذہب کے لوگ عوام سے پوشیدہ رکھتے تھے، رفتہ رفتہ خالص آتش یا نور بن کر اپنے اصل سے وصال کر سکتا ہے۔

مصر اور شام میں افلاطونی فلسفے کے معلّموں کے علاوہ عیسائیوں کا ایک ایسا فرقہ بھی موجود تھا جو اپنے آپ کو ناسٹک یا فرقۂ عارفین کہتا تھا۔ یہ لوگ مافوق الادراک حقائق کے عرفان کا دعویٰ کرتے تھے اور ہمہ اوست کے قائل تھے۔ یہ لوگ قدرت کے قوائے ربوبیت کو مجموعی طور پر مسیح کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ان عارفین میں سے جو یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے نظامِ عالم کی تمام قوّتوں کا احاطہ کر لیا ہے "انا المسیح" کا دعویٰ کرتے تھے۔ بعد میں بعض مسلمان صوفیاء نے بھی "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔

یہ جاننے کے لئے کہ اس قسم کے فلسفے کسی قوم کے فکر و عمل کو کس طرح متاثر کرتے ہیں زمانہ حال کی اقوام میں جرمن قوم کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اٹھارہویں صدی

عیسوی میں اس قوم پر فلسفے اور تصوّف کا غلبہ تھا۔ چنانچہ جب نپولین کے سپاہی جینا کا بازار لوٹ رہے تھے تو اس قوم کا سب سے بڑا فلسفی ہیگل جس کا فلسفہ ہمہ اوست یا وحدت الوجود سے ملتا جلتا ہے اپنی تصنیف "علم الروح" کے مسوّدات جیب میں ڈالے پبلشر کی تلاش میں جا رہا تھا۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان اس قسم کے کسی فلسفے سے متاثر نہ تھے۔ وہ اصلاحِ نفس کے کسی ایسے طریقے سے واقف نہ تھے جو کتاب وسنّت میں موجود نہ ہو۔ امام قشیریؒ لکھتے ہیں" جان لو خدا تم پر رحم کرے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مسلمانوں کے لئے ان کے زمانے میں کوئی نام بڑی فضیلت والا سوائے صحبتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کوئی فضیلت نہیں۔ تب ان کو صحابہ کہا گیا۔ اور جب دوسرے زمانے والوں نے ان کو پایا تو جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت حاصل کی ان کا نام تابعین رکھا گیا اور ان کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی نام نہ تھا۔ پھر ان کے بعد آنے والوں کو تبع تابعین کہا گیا۔ پھر مختلف قسم کے لوگ پیدا ہو گئے اور ان کے مراتب میں فرق پڑ گیا۔ تب ان خواص لوگوں کو جنہیں دین کے کام میں زیادہ توجہ تھی زاہد عابد کہا گیا۔ پھر بدعت ظاہر ہو گئی اور فرقوں کے مدعی پیدا ہو گئے۔ ہر ایک فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم زاہد ہیں تب اہلِ سنّت کے خاص لوگوں نے جو خدا کے ساتھ اپنے نفسوں کی رعایت رکھنے والے اپنے دلوں کی غفلتوں کے آنے سے حفاظت کرنے والے تھے اس نام کو چھوڑ کر اپنا نام اہلِ تصوّف رکھا اور ان اکابر کا دو سو سن ہجری سے پہلے یہ نام مشہور ہو گیا۔[1]"

یہ بات مسلّمہ ہے کہ تصوّف کا لفظ قرآن پاک اور احادیث میں استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی کلامِ عرب میں آیا ہے بلکہ اسے بعد کے زمانے میں وضع کیا گیا۔

---

[1] تاریخ تصوّف۔ علّامہ اقبال مرتبہ صابر کلوروی

لفظ صوفی اور تصوّف کے متعلق علمائے حال اور مغربی مستشرقین نے بہت بحث کی ہے ان میں سے اکثر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لفظ صوفی صوف سے مشتق ہے جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے۔ چونکہ مسلم زہاد نے عیسائی راہبوں کی تقلید میں جو شام میں موجود تھے اس کپڑے کو ترکِ دنیا کی علامت کے طور پر اختیار کیا تھا اس واسطے صوفی کہلائے۔

البیرونی نے کتاب الہند میں لفظ صوفی کی اور توجیہہ پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ تصوف دراصل "س" سے تھا اور اس کا مادہ سوف تھا جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت اور دانائی کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا اور رفتہ رفتہ صوفی بن گیا۔

دوسری صدی ہجری میں ابو ہاشمؒ سب سے پہلے صوفی مشہور ہوئے۔ سفیان ثوریؒ کا مشہور قول ہے کہ ابو ہاشم صوفی کو دیکھنے سے پہلے میں نہیں جانتا تھا کہ صوفی کیا ہے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان ان اصطلاحات کے بارے میں سخت غیرت و حمیت رکھتے تھے چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک شخص کو جس نے طوافِ کعبہ کرتے ہوئے ایک نئی مذہبی اصطلاح استعمال کی تھی سخت تنبیہہ کی اور فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کبھی یہ اصطلاح استعمال نہ کرتے تھے باوجود ان باتوں کے مسلمانوں نے صوفی اور تصوّف کی نئی اصطلاحات کو گوارا کر لیا اور وجہ صرف یہ تھی کہ اس ابتدائی زمانے میں تصوّف کا مقصد اور مفہوم سوائے زہد و عبادت کے اور کچھ نہ تھا۔

جرمن مستشرق فان کریمر لکھتا ہے کہ اسلامی تصوف ہندی الاصل ہے۔ لیکن علامہ اقبال اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ "اسلامی تصوف ابتدائی مراحل میں ہندی خیالات سے بالکل متاثر نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ گیارہویں صدی میں اور اس کے بعد غیر اسلامی طریق ریاضت تصوّف میں جذب ہو گئے جس کو طریقِ محمدی پر استقامت کرنے والے بزرگوں نے کبھی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا"

تصوّفِ اسلامیہ کی پیدائش کے اسباب معلوم کرنے کے لئے کسی خارجی تحریک کی طرف جانے کی ضرورت نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے اندر وہ تمام اسباب موجود تھے جن کے مجموعی اثرات سے اس قسم کے نصب العین کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ گو یہ بات مسلّمہ ہے کہ اس کے ارتقا میں غیر اسلامی نظریات بھی اثر انداز ہوئے ہیں [1]

اسلام میں تصوّف کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کی کوئی حتمی تاریخ تو مقرر نہیں کی جا سکتی البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ایک فرقے معتزلہ کی سیاست سے علیحدگی، فرقہ باطنیہ کا ظہور اور بنی امیّہ کے امرا کا تعیّش اور اسلامی شعائر سے انحراف اس کے وجود میں آنے کا سبب بنا اور مسلمانوں کی مذہبی رواداری کے نتیجے میں غیر مسلم تحریکات کو کام کرنے کی جو سہولیات حاصل تھیں اس چشمۂ صافی کو مکدّر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

فرقہ معتزلہ کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتے تھے لیکن جب آپ بعض مصلحتوں کی بنا پر حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے تو یہ لوگ اس فیصلے پر بڑے بد دل ہوئے اور یہ کہکر انہوں نے اعتزال و علیحدگی اختیار کر لی کہ ہم سیاسیات سے دست بردار ہو کر صرف علم و عبادات تک ہی اپنا دائرہ محدود رکھیں گے۔ بعض روایات کے مطابق واصل بن عطا اور عمر بن عبید حضرت حسن بصریؒ سے گناہ کبیرہ کے متعلق ایک مسئلے میں اختلاف کی بنا پر الگ ہو گئے تھے اس لئے معتزلہ کہلائے۔ شروع شروع میں ان کے عقائد عام مسلمانوں سے مختلف نہ تھے لیکن بعد میں یہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے لگے اور انہوں نے عام مسلمانوں سے ہٹ کر اپنے کچھ الگ عقائد بنا لئے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔ ارادہ، سننا اور دیکھنا اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات نہیں۔ بہشت میں اللہ تعالےٰ کا دیدار نہیں ہوگا۔ عقل الہام سے فائق ہے۔ اس لئے ہر مسئلے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ ان کے ہر چیز

---

[1] تاریخ تصوّف علامہ محمد اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی۔

کو عقل کے ترازو میں تولنے کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض تو پرانی ایرانی ثنویت کی طرف چلے گئے اور بعض جو توحید پر قائم رہے ان کی توحید یا تو وحدت والوجود کا پیش خیمہ تھی یا اسلامی توحید کے تصوّر سے بہت دور جا پڑی تھی۔

آٹھویں صدی ہجری میں فرقہ باطنیہ کا ظہور ہوا۔ اس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک کے بانی حسن بن صباح اور دوسرے کے حمدان قرمطی ہیں۔ اس تحریک کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کے دو معنی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرے باطنی۔ ظاہری عوام کے لئے اور باطنی خواص کے لئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اسماعیلیہ اس کا نمائندہ فرقہ ہے۔

کہتے ہیں حسن بن صباح ایک مرتبہ جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ جہاز طوفان میں گھر گیا اور غرق ہونے لگا۔ ملّاح جہاز کو بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران حسن صباح ایک کمرے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مطالعے میں مصروف تھا۔ کسی نے آکر خبر دی کہ جہاز ڈوب رہا ہے اور آپ بڑے اطمینان سے مطالعہ میں مصروف ہیں حسن بن صباح نے جواب دیا: جاؤ لوگوں سے کہدو کہ جہاز غرق نہیں ہوگا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جہاز بچ گیا۔ لوگوں نے حسن بن صباح کو برگزیدہ سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا پھر اس نے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ایسا کاروبار چمکایا کہ اس کی ہوشیاری اور مکاری کے کارنامے تاریخ کا حصّہ بن گئے۔ بعد میں اس کے کسی دوست نے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ جہاز غرق نہیں ہوگا۔ اس نے جواب دیا: مجھے اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ میں نے محض اس لئے کہدیا تھا کہ اگر جہاز بچ گیا تو میری بات بن جائے گی اور غرق ہو گیا تو نہ میں رہوں گا نہ جہاز والے۔ لہٰذا مجھے اس بات پر جھوٹا کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

تصوّف کے وجود میں آنے کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ بنی امیّہ نے حکومت کے نظم و نسق میں ایک خالص دنیوی پالیسی اختیار کی، شعائرِ اسلامی سے بے اعتنائی برتی اور حکومت کے نشے میں سادہ صحرائی زندگی کو چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ان کو یہ عروج حاصل ہوا تھا۔

اعتزال نے مسلمانوں کے مذہبی جوش کی آگ کو فرو کیا اور دولت کی فراوانی نے تعیّش اور دنیا طلبی کی طرف مائل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے طرزِ بود و باش سے وہ پختگی، متانت اور سادگی مفقود ہو گئی جو صحابۂ کرامؓ کا خاصہ تھی۔ اس کے علاوہ سیاسی انقلاب، بنی امیّہ کی حکومت کا زوال، ایرانی کنڈالوں کی بغاوتیں، مامون اور امین کی خوفناک خانہ جنگی، مزدک بابک کی بغاوت اور آئے دن کے سیاسی خلفشار نے دین کو دنیا پر مقدّم رکھنے والے آدمیوں کو حکومت کے کاموں میں عمل دخل رکھنے سے متنفّر کر دیا اور وہ زہد و تقویٰ اور اصلاحِ نفس میں مشغول ہو گئے۔ آخر کار وہ تحریک جو عام مسلمانوں کی عیش پرستی تکلّف اور خانہ جنگیوں کے خلاف محض ایک احتجاج تھی علمی اور عملی نصب العین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ تصوّف بعد کے زمانے کی پیداوار نہیں بلکہ یہ سلسلہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دو طرح کے برتن یعنی دو طرح کے علم حاصل کئے ہیں۔ ایک علم کو تو میں نے پھیلا دیا اور دوسرے علم کو اگر میں پھیلاؤں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے گا۔ اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اس کو ابوہریرہؓ کے بعض دیگر اقوال کی روشنی میں دیکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ کا قول ہے کہ "میں پناہ مانگتا ہوں ۶۰ ہجری کے شروع اور لڑکوں کی حکومت سے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ ۶۰ ہجری کے آغاز کے فتنوں اور لڑائیوں سے واقف تھے۔ چنانچہ جس علم کو آپ نے چھپایا اس کا تعلق ہدایت و بیّنات سے نہ تھا بلکہ آپ نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کچھ پیش گوئیاں سن رکھی تھیں۔ چونکہ ابوہریرہؓ کو ان باتوں کے اعلان سے جان کا خدشہ تھا اس لئے وہ کبھی صریحاً ان باتوں کا ذکر نہ کرتے تھے۔ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری (شرح بخاری) میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

علّامہ نے دوسری دلیل یہ دی ہے کہ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رض

بہت حدیثیں روایت کرتا ہے۔ اگر کتاب اللہ میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو کبھی کوئی حدیث روایت نہ کرتا۔ پھر آپ یہ آیت پڑھتے : اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنَاتِ وَالْھُدٰی ..... الخ چونکہ ان آیات میں احکامِ الٰہی چھپانے والوں کے لئے سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، اس لئے ابوہریرہؓ علومِ رسالت کو جو ان کے دماغ میں محفوظ تھے شائع کرنا آیاتِ مذکورہ کی تعمیل میں اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس لئے بیّنات وہدایت سے متعلق تمام احادیث بیان کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر علومِ باطن کا تعلق ہدایت سے ہے اور بقول حضرات صوفیا وجودیہ ہونا چاہیئے تو حضرت ابوہریرہؓ انہیں چھپا نہیں سکتے تھے۔ پس ان کا تعلق امورِ اسلام سے نہ تھا۔ اور اگر علمِ باطن کا تعلق بیّنات اور ہدایت سے ہے تو معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گروہِ صوفیا کے عقیدے کے مطابق آیتِ مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے کے مرتکب ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رشد وہدایت کے متعلق امت سے کوئی چیز نہیں چھپائی۔ کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "جو شخص یہ کہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے متعلق امت سے کچھ چھپایا ہے وہ جھوٹا ہے"۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "شریعت کے تین جزو ہیں ــ علم، عمل اور اخلاص۔ جب یہ تینوں جزو نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں ہو پاتی۔ طریقت و حقیقت جس کے ساتھ صوفیا ممتاز ہیں دونوں شریعت کی خادم ہیں۔ ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے۔

"کل قیامت کو شریعت کے بارے میں سوال ہوگا تصوّف کے متعلق نہیں پوچھیں گے جنّت میں داخلہ اور دوزخ سے بچنا شریعت پر عمل کرنے سے ہوگا۔ لہٰذا اعلیٰ ترین نیکی یہ ہے کہ شریعت کی ترویج میں سعی اور کوشش کی جائے اور احکامِ شرع میں ایک حکم کو جاری اور زندہ کرنا خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ اسلامی شعائر مٹائے جا رہے ہوں کروڑہا روپیہ خرچ کرنے سے بہتر ہے"۔

"تصوّف شعارِ حقّہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسلامی اقوام کی تاریخ میں ایسے بزرگ ہزاروں اور لاکھوں پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے جن کی زندگی کا نصب العین یہی خلوص رہا ہے۔ ان کی زندگیاں عام مسلمانوں کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا۔ یہ بزرگ حقیقی معنوں میں جانشینانِ پیغمبر ہیں۔" [1]

حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے تصوّف کی جو تعریف کی ہے اور صوفیا کی جو خوبیاں بیان کی ہیں ابتدائی دور کے صوفی اسی تصوّف کے علمبردار تھے۔ ان صوفیاء میں حضرت حسن بصریؒ، معروف کرخیؒ، حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت شقیق بلخیؒ اور ابراہیم ادھمؒ ایسے بزرگ قابلِ ذکر ہیں۔ اِس دور میں زہد و تقویٰ صرف مَردوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس زمرہ کی کئی عورتوں کے نام بھی نظر آتے ہیں جن میں رابعہ بصری، مریم بصریہ، معاذہ عدویہ، شعوانہ، امّ حسّان اور فاطمہ نیشاپوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعد کے ادوار میں بایزید بسطامی، حضرت فریدالدین عطّار، حضرت جنید بغدادیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ اور بعض دیگر صوفیا نے تصوّف کی اعلیٰ ارفع روایات کو قائم رکھا اور تبلیغِ دین اور رشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

مسلمانوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہر قسم کی غیر اسلامی تحریکیں نشوونما پاتی تھیں۔ اسلامی فرقوں کے مباحث کے علاوہ عیسائی رہبانیت، مانویت اور بدھ مت کے پیروکاروں کی علمی مجالس بغداد اور بصرہ میں عام منعقد ہوتی تھیں جو مسلمانوں کے فکر و عمل کو متاثر کرتی رہیں۔ مامون الرشید کے عہد میں

---

[1] مکتوبات بحوالہ تاریخ تصوّف علّامہ محمد اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

یونانی فلسفے اور دیگر مذاہب کی کتب کے عربی تراجم نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور مسلمانوں میں غیر اسلامی افکار کا عام چرچا ہونے لگا۔ اس کے علاوہ قرون اولیٰ میں مدینے کے منافقین کی طرح اسلامی فتوحات سے متاثر ہو کر ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں شامل ہو گئے جو بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں ثنویت یا کسی اور غیر اسلامی مسلک کے قائل تھے اور اپنے نظریات کو اسلام سے آہنگ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ النّدیم نے اپنی تصنیف "الفہرست" میں ان مسلمان زندیقوں کی فہرست دی ہے۔ ان تحریکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تصوّف جس کی ابتدا مخصوص تمدّنی اور سیاسی حالات میں محض زہد و تقویٰ کے اصول سے ہوئی تھی، میں غیر اسلامی نظریات شامل ہونا شروع ہو گئے اور شریعت کے تابع اس سادہ تصوّف کو فلسفے کی پیچیدگیوں میں الجھا دیا گیا۔ اور اس کے متعلق یہ کہا گیا یہ توحید کے اسرار کا علم ہے۔ اس کا انتہائی نکتہ یہ ہے کہ عارف اور معروف ایک شے ہے۔ علم شریعت کے علاوہ کچھ باطنی طریقے بھی عرفان حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق طرح طرح کی موشگافیاں کرنے، جن سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے منع فرمایا تھا کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا فلسفہ جسے کسی وقت یونانی حکماء نے پیش کیا تھا تصوّف کا حصّہ بن گیا۔ اس فلسفے کو پیش کرنے والا پہلا شخص بقول مولانا جامی ذوالنون مصری تھا جو ۲۴۵ھ میں فوت ہوا۔ اس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو محبّت کی جاتی ہے وہ انجام کار اس سے متّحد کر دیتی ہے۔ انسان ذاتِ خداوندی میں اس طرح غرق ہو جاتا ہے کہ اس کی ذات اپنی ذات نہیں رہتی بلکہ ذاتِ خداوندی کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔ اس وقت کے علمائے حق نے اس نظریے کی مخالفت کی چنانچہ وہ جب تک زندہ رہے اہلِ مصر انہیں زندیق کہتے رہے۔

اس نظریے کو "وحدت الوجود" کا نام دینے اور اس کی تشریح و توضیح پیش کرنیوالا پہلا شخص محی الدین ابن عربی (متوفی ۵۶۰ھ) ہے۔ بعد میں یہ نظریہ انہیں کی طرف منسوب ہو گیا

علاؤ الدولہ سمنانی نے اس نظریے کا رد پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسالکِ طریقت کی انتہائی منزل توحید یعنی فنا فی اللہ ہونا نہیں بلکہ عبودیت ہے۔ بعد میں شیخ مجدد الف ثانیؒ نے اس نظریئے کی توضیح و تشریح کی اور اسے وحدت الشہود یا ہمہ از وست کا نام دیا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں "ابتدائی زمانے میں تصوّف کا مقصد اور مفہوم سوائے زہد و عبادت کے کچھ نہ تھا لیکن جب تصوّف نے حقائق فلسفہ کی طرف قدم بڑھایا اور ان کو معلوم کرنے کا فوق الادراک طریقہ نکالا تو علمائے وقت نے بجا طور پر مخالفت کی اور اگر علمائے اسلام ایسا نہ کرتے تو یقیناً ایک بڑے فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتے۔ یہ انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج تھوڑا بہت اسلامی شعار اور اسلامی علوم باقی ہیں ورنہ اگر تمام مسلمان اس عقیدے کے پابند ہو جاتے کہ عارف و معروف ایک ہی شے ہے تو وہ اسلام جس پر ابوبکر صدیقؓ ایمان لائے اور جس نے ہر ایسے تخیّل سے منع کر دیا تھا جو انسان کے قوائے عملیہ کو کمزور کر دینے والا ہو کب کا رخصت ہو چکا ہوتا اور بجائے اس کے بیابانوں کی خاموشیوں اور پہاڑوں کی عزلتوں میں بیٹھنے والی رہبانیت رہ جاتی۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور نیک بندوں پر کسی غیر معمولی طریق پر 'سکینۃ' نازل کرتا ہے جس سے ان کی استقامت میں ترقی ہوتی ہے، جو ان کی صحبت میں بیٹھنے والوں پر ایک عجیب و غریب اور فوق الادراک دینی اثر ڈالتی ہے جس سے ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں مقبول ہوتی ہیں اور ان کو کرامت اور خرقِ عادت کی توفیق ملتی ہے مگر ہم یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں کہ کتاب اللہ کی تعلیم کے خلاف ذاتِ باری، روحِ انسانی اور نظامِ عالم و معارف معلوم کرنے کا کوئی اور فوق الادراک ذریعہ تمام یا بعض انسانوں کی فطرت میں مخفی ہے یا کسی طریق سے پیدا ہو سکتا ہے جس سے عارف و معروف کا حقیقی اتحاد یا خلقِ عالم کا راز معلوم ہو۔"[1]

---

[1] تاریخ تصوف۔ علامہ اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

حقیقت یہ ہے کہ معرفت حاصل کرنے کا کوئی فوق الادراک یا باطنی طریقہ نہیں بلکہ اس کا ذریعہ علم ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم معرفت سے بلند تر، کامل تر اور جامع تر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ علم منسوب کیا جاتا ہے نہ معرفت اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہیں علم عطا کیا گیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے گا۔ پھر جب اللہ تعالےٰ نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کیا تو فرمایا کہ "جان لے" کہ خدا کوئی نہیں سوائے اللہ تعالےٰ کے اور یہ نہ فرمایا کہ "پہچان لے" کیونکہ انسان کسی شے کی معرفت رکھ سکتا ہے حالانکہ از روئے علم اس کا احاطہ نہ کیا گیا ہو اور جب انسان کسی شے کا از روئے علم احاطہ کر لیتا ہے تو یہی اس شے کی معرفت ہے۔

علّامہ اقبال فرماتے ہیں: معرفت کی علم پر ترجیح ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے نتائج دور رس ہیں یہ امتیاز ہر قسم کی رہبانیت کی جڑ ہے۔ اور ان تمام علوم حسّیہ عقلیہ کا ناسخ ہے جن کی وساطت سے انسان نظامِ عالم کے قوائے کو مسخّر کر کے زمان و مکان کی دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔

تصوّف میں جو اصطلاحات احوال و مقامات، عارف و معروف، حقیقت و معرفت، فنا فی اللہ، وحدت الوجود، علمِ باطن، وجد و کیف، مجاہدہ و مراقبہ اور تصوّرِ شیخ وغیرہ استعمال ہوتی ہیں، ان کے مترادفات غیر اسلامی فلسفوں میں اسلام سے پہلے سے موجود چلے آتے ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں یونانی، ایرانی اور بدھ مت کے فلسفوں کے تحت ان میں سے بعض کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام قشیری پہلے شخص ہیں جنہوں نے پانچویں صدی ہجری میں تصوّف کی اصطلاحات کو مرتب کیا اور بعد کے ادوار میں صوفیاء نے انہیں اختیار کر لیا۔ اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تصوّف میں جو چیز کتاب و سنّت کے خلاف ہے وہ باہر سے آئی ہے اور اسلام سے اس کا قطعاً کوئی تعلق نہیں۔

"وحدت الوجود، فوق الادراک طریقِ معرفت اور دیگر غیر اسلامی نظریات کے حامل

تصوّف کے علمبرداروں کے ساتھ ساتھ صوفیاء کا ایک ایسا گروہ بھی پایا جاتا ہے جو شریعتِ محمدیہ پر قائم ہے اور اسی پر مخلصانہ استقامت کرنے کو انتہائے کمالِ انسانی تصور کرتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے قرآن شریف کا مفہوم وہی سمجھا جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا، جس نے اس راہ پر کوئی اضافہ نہیں کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سکھائی تھی، جس کی زندگی صحابۂ کرام کی زندگی کا نمونہ ہے، جو سونے کے وقت سوتا ہے، جاگنے کے وقت جاگتا ہے، جنگ کے وقت میدانِ جنگ میں جاتا ہے، کام کے وقت کام کرتا ہے، آرام کے وقت آرام کرتا ہے۔ غرض یہ کہ اپنے اعمال و افعال میں اس عظیم الشان انسان اور سادہ زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جو نوعِ انسانی کی نجات کا باعث ہوئی۔ اس گروہ کے دم قدم کی بدولت اسلام زندہ رہا، زندہ رہے گا۔ یہی گروہ اصل میں صوفی کہلانے کا مستحق ہے۔"

"صوفیا کے اس گروہ کے ساتھ ایک ایسا گروہ بھی پایا جاتا ہے جو شریعتِ محمدیہ کو خواہ اس پر قائم بھی ہو محض ایک علمِ ظاہری تصوّر کرتا ہے۔ ایک طریقِ تحقیق کو جسے وہ اپنی اصطلاح میں "عرفان" کہتا ہے علم پر ترجیح دیتا ہے۔ اور اس عرفان کی وساطت سے مسلمانوں میں وحدت الوجودی فلسفے اور ایک ایسے عملی نصب العین کی بنیاد ڈالتا ہے جس کا ہمارے نزدیک اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس گروہ میں بھی مختلف خیال لوگ ہیں۔ مگر ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔"[1]

صوفیا کے اس دوسرے گروہ کے فلسفۂ وحدت الوجود اور شریعت پر عمل کے بغیر باطنی طریقوں سے معرفت حاصل کرنے کے فلسفے کی آڑ میں صوفیا کا ایک ایسا گروہ بھی ہمیشہ موجود رہا ہے جو عجیب و غریب چالاکیوں سے سادہ لوح مسلمانوں کو پھانستا ہے

---

[1] تاریخ تصوّف علامہ محمد اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

اور اپنی شعبدہ بازیوں کے ذریعے انہیں اپنا گرویدہ بنا کر اپنی دکانیں سجاتا ہے۔ اس گروہ کی چالاکیاں اور کارنامے حیرت انگیز ہیں اور بجائے خود تمدن و تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہیں۔ مگر چونکہ یہ گروہ سب کے نزدیک مردود ہے اس لئے علامہ اقبال نے اس کا تفصیلاً ذکر نہیں کیا۔

راقم الحروف کو تصوّف کے ایک ایسے علمبردار کی محفل میں شرکت کا موقع ملا ہے جس کا دعویٰ تھا کہ اسے باطن میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محفلِ پاک میں شرکت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ حضرت اسلامی شعائر کے پابند نہ تھے۔ نماز روزے کے تارک تھے۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے نگینوں والی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ جب ان سے ترکِ شریعت کے متعلق سوال کیا جاتا تو کہتے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر ہوا ہے کہ تمہاری عبادت قبول ہو گئی ہے۔ اب شریعت ترک کر دو۔ اپنی بات کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے کسی صوفی شاعر کا یہ شعر پڑھتے:

نمازِ زاہداں سجدہ سجود است
نمازِ عاشقاں کُلّی وجود است

اپنے نماز پڑھنے کے عادی مریدوں کو اپنا تصوّر سامنے رکھ کر نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ قرآن پاک میں درمیانی نماز (نمازِ عصر) کی حفاظت کا جو حکم ہے اس سے دل کی نماز مراد لیتے تھے۔ اب ان کے مزار پر باقاعدہ عرس ہوتا ہے اور لوگ نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔

مجدّدِ الف ثانیؒ لکھتے ہیں "اس فقیر نے اپنے والد بزرگوار قدس سرّہٗ سے سنا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ۷۲ گروہوں میں سے اکثر جو گمراہ ہیں اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں ان کا باعث طریق صوفیا میں داخل ہونا ہے کہ انہوں نے کام کو انجام نہ پہنچا کر غلط راہ اختیار کی اور گمراہ ہو گئے۔

علامہ اقبال حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی طرح ہمہ اوست (سب کچھ وہ ہے یا ہر چیز

میں ذاتِ باری تعالیٰ جاری وساری ہے) کی بجائے ہمہ از اوست (سب کچھ اس سے ہے یا سب کچھ اس کا پیدا کردہ ہے) اور وحدت الوجود (سب کچھ ایک ذات ہے) کی بجائے وحدت الشہود (یعنی سب کچھ ایک ذات کا ظہور ہے) کے قائل تھے۔ آپ فرماتے ہیں "اسلام کی تعلیم نہایت صاف اور روشن ہے یعنی عبادت کے لائق صرف ایک ذات ہے اور باقی جو کچھ کثرت نظامِ عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے"۔ اس لئے انہوں نے وحدت الوجودی فلسفے کے اخذ کردہ نتائج پر تنقید کی ہے اور اسلام اور تصوّف کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ شریعت کے صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر ہدایت کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے سے انسان کیسی کیسی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

	اسلام	تصوّف
۱	اسمٰعیل مذبوح تھا نہ اسحٰق۔ (قرآن پاک)	اسحٰق مذبوح تھا نہ اسمٰعیل۔ (محی الدین ابن عربی)
۲	خدا کی عبادت فضیلت کے اعتبار سے افضل ہے۔ (اسلام)	مخلوق کی خدمت عبادتِ الٰہی سے بہتر ہے۔ (محی الدین ابن عربی)
۳	نبی سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ (اسلام)	ولی نبی سے بہتر ہے۔ (محی الدین ابن عربی)
۴	فرعون کافر تھا (اسلام)	فرعون نیک آدمی تھا۔ (محی الدین ابن عربی)
۵	شیطان مردود تھا۔ (اسلام)	شیطان نیک و معصوم فرشتہ و سردارِ عاشقاں تھا۔ (حلاّج منصور)

۶	شہوانی خیالات کو مغلوب کرو۔ (اسلام)	شہوانی خواہش بالکل فنا کر دو۔ (تصوّف)
۷	رویتِ باری تعالیٰ (اللہ تعالیٰ کا دیدار) قیامت میں ہوگا۔ (اسلام)	رویت یہاں پر ہوگی (تصوّف)[1]

کسی شخص کے مقرب الی اللہ اور ولی اللہ ہونے کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس سب سے بڑی کسوٹی شریعت ہے۔ جتنا کوئی شخص خلوص کے ساتھ شریعت پر عمل پیرا ہوگا اور اتباعِ سنّت میں استقامت دکھائے گا اتنا ہی وہ مقرّب الی اللہ ہوگا۔ جن لوگوں نے شریعت کے علاوہ کسی اور باطنی طریقے کو معرفت کی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کو صوفیا کی صف میں کھڑا کر دیا جن کی شاعری اور خیالات اسلامی تعلیمات کے خیالات اور امّتِ مسلمہ کے لئے زہرِ قاتل ہیں۔ دلدادگانِ تصوّف ان کے ہر شعر کو کھینچ تان کر عارفانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان شعرا کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کہنے والے ولی نہیں تھے اور اگر ولی تھے تو یہ ان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ بہر حال جو لوگ اس عقیدے میں راسخ ہیں وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ معرفت کی باتیں ہیں اس لئے ہر شخص ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔

علاّمہ اقبال لکھتے ہیں "حقیقی شاعری کا مقصد سوائے اس کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے کہ قوم ہی کو نہیں عالمِ انسانیت کو صحیح راستے کی دعوت دے، غلط روی سے روکے، انحراف سے باز رکھے، ٹھوکروں سے بچائے، دوسروں کے گمراہ کن طریقوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر دے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہوسکتا کہ محض تخیّل کی رنگینیوں سے دلربا تصویریں

---

[1] تاریخ تصوف : علاّمہ اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

کی صفیں آراستہ کرتا جائے جو ہر آئند و رو مند کی نظریں بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیں لیکن نہ کسی میں عزم و ہمت کے چراغ روشن کر سکیں نہ کسی کے فہم و بصیرت کو جلا دے سکیں، نہ خواب کے ماتوں کو جگا دیں نہ احساسِ زیاں سے بہرہ مندی بخش سکیں اور نہ کسی کو مطلوب منزل تک پہنچائیں۔

علامہ اقبال نے بعض صوفی شعرا کا ایسا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کو کمزوری، بزدلی، کم ہمتی، اسلامی شعائر سے انحراف بے راہ روی اور خودی کی نفی کا درس دیا گیا ہے۔ حافظ شیرازی کو بعض لوگ "لسان الغیب" کا لقب دیتے ہیں، ان کے ہر شعر کو معرفت کا شعر سمجھتے ہیں اور ان کے دیوان کو اس قدر مقدس سمجھتے ہیں کہ اس سے فال نکالتے ہیں۔ حالانکہ اورنگ زیب عالم گیر نے یہی دیوان پڑھنے پر اپنے گھر میں پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پیالہ بر کفنم بند تا سحر گہِ حشر
بمئی ز دل ببرم ہول روزِ رستاخیز

"میرے کفن میں شراب سے بھرا ہوا پیالہ رکھ دینا تاکہ حشر کے روز ہنگامہ رستاخیز کے باعث دلوں پر جو خوف و دہشت طاری ہو گی اسے دور کرنے میں اس سے مدد لوں (قیامت کی ہولناکیوں کی تخفیف کی ہے اور حرمتِ شراب کے حکم کا مذاق اڑایا ہے) ؎

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کم تر جو
کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمّا را

گانے بجانے والے اور شراب کی بات کر، دنیا کا راز نہ ڈھونڈ کیونکہ کسی نے حکمت سے آج تک اس معمّے کو حل کیا ہے نہ کر سکتا ہے۔

(کائنات میں غور و خوض کرنے کی بجائے عیش و عشرت کی تلقین کی ہے)۔

من ہمہ دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

میں نے جس وقت چشمۂ عشق سے وضو کیا جو کچھ بھی (موجود) ہے اس کا جنازہ پڑھ لیا یعنی ان کے عدم وجود کا اعلان کر دیا۔

(ہر شعار سے بے پروائی اور آزادی کا اظہار کیا ہے۔)

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

کسی کو تکلیف دینے میں نہ لگ جا اس کے علاوہ جو چاہے کر کیونکہ ہمارے طریق میں اس کے سوا کوئی گناہ نہیں۔

(تکلیف دینے کے علاوہ ہر گناہ کو جائز قرار دیا ہے)

گویند کہ بہشتِ بریں خواہد بود
فردا مئے ناب و حورِ عین خواہد بود
گر ما مئے معشوق گزیدیم چہ باک
گر عاقبت کار چنیں خواہد بود!

کہتے ہیں کہ بہشت بریں ہے اور قیامت کو خالص شراب اور سیاہ چشم حوریں ہوں گی۔ اگر کل یہی ہونا ہے تو ہم نے شراب اور محبوب کا انتخاب کیا ہے تو کیا ڈر ہے؟

(بہشت کی نعمتوں اور شراب کے متعلق حکمِ الٰہی کا مذاق اڑایا ہے):

در کوئے نیکنامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تقدیر نے ہمیں شہرت کی گلی میں جانے نہ دیا۔ تجھے یہ ناپسند ہو تو تقدیر بدل دے۔

(تقدیر کا بہانہ بنا کر برے کاموں کا جواز پیدا کیا ہے)

علامہ نے یہ بتانے کے لئے کہ اشعار بعض طبائع پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں ، محمد الدین فوق کی تصنیف "وجدانی نشتر" کے حوالے سے اس شعر کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں " اورنگ زیب عالمگیر نے جو بڑا متشرع بادشاہ تھا ایک مرتبہ حکم دیا کہ اتنی میعاد کے اندر جتنی طوائفیں ہیں نکاح کر لیں ورنہ کشتی میں بھر کر سب کو دریا برد کر دیا جائے گا۔ سینکڑوں نکاح ہو گئے مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ چنانچہ ان کے ڈبونے کے لئے کشتیاں تیار ہوئیں۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا۔ ایک حسین نوجوان طوائف روزمرہ آپ کے سلام کو آیا کرتی۔ جب آپ درود و وظائف سے فارغ ہوتے وہ طوائف دست بستہ سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔ جب آپ نظر اٹھاتے وہ سلام کر کے چلی جاتی۔ آج جو وہ آئی تو بعد سلام عرض رساں ہوئی کہ آج خادمہ کا آخری سلام بھی قبول ہو۔ آپ نے حقیقتِ حال دریافت فرمائی۔ جب تمام کیفیت بیان کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیرازی کا یہ شعر:

در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

تم سب یاد کر لو اور کل جب تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بآواز بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ ان سب طوائفوں نے اس شعر کو یاد کر لیا۔ جب روانہ ہوئیں تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا شروع کیا۔ جس جس نے یہ شعر سنا دل تھام کر رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا۔ ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوئی۔ حکم دیا کہ سب کو چھوڑ دو"۔

علامہ اقبال اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ " مسئلہ تقدیر کی دلآویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زنانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ

سے پاک کرنے میں کوشاں تھا قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانینِ اسلامیہ کی تعمیل کرنے کی ہمّت نہ رہی ۔"

مکن ذخیرہ چو در رفتن است عمرِ عزیز
بخور کہ روزہ گرفتن حرام در سفر است

(شفیع اثر)

عمرِ عزیز تو گذر رہی ہے۔ لہٰذا مال جمع نہ کیا کر بلکہ کھایا پیا کر کیونکہ مسافر کے لئے سفر میں روزہ رکھنا حرام ہے ۔

(سفر میں روزے کے متعلق احکام کی تضحیک کی ہے)

قسم بحرمتِ بیتِ حرام کز خُمِ مے
حریمِ کدہ ہم چاہِ زمزمے دارد

(خواجہ صفی)

بیتِ حرام کی عزت کی قسم شراب کے مٹکے کی وجہ سے شراب خانے کا حرم بھی چاہِ زمزم رکھتا ہے ۔

(میکدے کو حرم اور شراب کو آبِ زمزم قرار دے کر اصطلاحاتِ مقدّسہ شرعیہ کے سلسلے میں بے باکی سے کام لیا ہے)

بہ کعبہ و دیر رفتم گاہ آنجا گاہ ایں جا!
کہ مطلب جستجوئے اوست خواہ آنجا خواہ اینجا

(ملّا سعید اشرف)

میں کبھی کعبہ گیا کبھی بت خانے ۔ مقصد خدا کی تلاش ہے۔ یہاں ہو یا وہاں ۔

(کعبہ اور بتخانے کو یکساں اہمیت دی ہے)

چوں روزہ خوری جانبِ میخانہ رواں شو
بہتر از شعر و بادہ برائے رمضاں نیست

(ابو طالب کلیم)

جب روزہ کھانا ہو تو شراب خانے کی طرف رواں ہو کیونکہ رمضان کے لئے شعر اور شراب سے بہتر کوئی شے نہیں۔

(ماہِ رمضان کا تمسخر اڑایا گیا ہے)

گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا بیابی مقصود

(خواجہ نظامی)

اگر چاہے کہ ان کی محفل سے مستفید ہو تو سب کی خاک پا بن کر رہ تاکہ مقصود پا سکے۔

(خودی کی نفی کر کے انتہائی انکساری، عاجزی اور بے چارگی کا درس دیا ہے)

اگر دشمن نہ سازد با تو اے دوست — ترا باید کہ با دشمن بسازی
دگر رنجے دہد مخروش مخراش — توکّل کن زلطفِ بے نیازی
دگر نہ چند روزے صبر فرما ! — نہ او ماند ، نہ تو نے فخرِ رازی

(امام فخر رازی)

اے دوست اگر دشمن تیرے ساتھ نباہ نہ کرے تو تُو اس کے ساتھ نباہ کر۔ اگر وہ تجھے تکلیف دے تو تُو نہ اسے تکلیف دے نہ آہ و فریاد کر۔ خدائے بے نیاز کی مہربانی سے توکّل اختیار کر ورنہ چند روز صبر کر۔ نہ وہ رہے گا نہ تو نہ فخر رازی۔

(صبر اور توکّل کے پردے میں ظلم سہتے رہنے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھانے کی تعلیم دے کر بزدلی، کمزوری، دُرلم ہمتی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے)

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر از دوست
در روزِ قیامت با او کے ماند !!
ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

غازی شہادت کے لئے تگ و دو میں مصروف ہے۔ اسے خبر نہیں کہ عشق کا شہید اس سے برتر ہے۔ قیامت کے دن وہ اس کے برابر کیسے ہوگا۔ وہ دشمن کا مقتول ہے اور یہ دوست کا۔

ان اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے سراج الدین پال کے نام ایک خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں :

"ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصوّر کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔

"یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کس نے زہر دیا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں"

بعض صوفیا کا اس قسم کا کلام دراصل ان کے غیر مسلم متصوّفین کے ساتھ اختلاط اور ان کی تخلیقات کے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ داراشکوہ مصنف سفینۃ الاولیاء کا جہاں حضرت میانیر

رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق تھا۔ وہاں اس کا ہندو جوگیوں کے پاس بھی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک طرف تو سفینۃ الاولیاء ایسی کتاب لکھی اور دوسری طرف ویدوں کی شرح اپنشد کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی ترجمے سے بعد میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں تراجم ہوئے ۔ اور یوں مغرب ویدانتی فلسفے سے آشنا ہوا۔ داراشکوہ کا یہ ہندومت پر بہت بڑا احسان ہے۔

○

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے : لِیْ خَرْقتان اَلْفَقْرُ والجهاد میرے لئے زہد و تقویٰ کے دو لباس ہیں فقر اور جہاد۔ بظاہر یہ دو الفاظ ہیں لیکن حقیقت میں یہ اپنے اندر معنوں کے سمندر لئے ہوئے ہیں۔ اگر اسلامی تصوّف کوئی چیز ہے تو اس کا انحصار بس ان دو چیزوں پر ہے۔ آپؐ کی ساری زندگی ان دو چیزوں کا مرقع رہی۔ آپ نے دونوں جہانوں کے بادشاہ ہوتے ہوئے مال و دولت کو جمع نہ کیا ۔ جو کچھ آتا غریبوں مسکینوں میں تقسیم کر دیتے۔ اپنے آرام و آسائش کے لئے کسی قسم کا سامان نہ بنایا۔ جس مکان میں آپؐ کی رہائش تھی اس کی چھت تک ہاتھ آسانی سے پہنچ جاتا تھا۔ جس بستر پر آپؐ استراحت فرماتے تھے ایک رات اس کی دو تہیں کر کے بچھا دیا گیا تاکہ آپ زیادہ آرام محسوس کریں تو اگلے دن ہی آپؐ نے اس سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ اسے پہلے کی طرح رہنے دیا جائے۔ اس لئے کہ اس طرح کی بالکل معمولی آرام طلبی میں بھی غفلت کا اندیشہ تھا۔ فقر کی حالت میں بھی ایمانی جذبے میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کا کام ہمیشہ جاری رہا۔ بدر و حنین اور احد و احزاب کے معرکے اس کے گواہ ہیں۔ جنگِ اُحد میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا گیا کہ جنگ مدینے کے اندر رہ کر لڑی جائے یا باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ کچھ لوگ اس حق میں تھے کہ جنگ مدینے کے اندر رہ کر لڑی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی رائے بھی یہی تھی لیکن بعض نوجوان صحابہ کی رائے تھی کہ مدینے سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے

بحث وتمحیص کے بعد اس بات پر فیصلہ ہوا کہ مدینے سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے ۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم زرہ پہن کر ہتھیار بند ہو گئے تو بعض بزرگ صحابہؓ نے نوجوانوں
سے کہا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رائے مدینے کے اندر رہ کر جنگ لڑنے کی تھی۔ لیکن
آپ نے اس کے خلاف رائے دے کر انہیں تکلیف دی۔ وہ نوجوان صحابہ اس پر
متاسّف ہوئے اور حضورؐ کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ اگر مدینے
کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا نبی جب
ایک بار زرہ پہن لیتا ہے تو پھر نہیں اتارتا۔ یہ جنگ اب مدینے سے باہر ہی لڑی جائے گی۔
چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ جنگ مدینے سے باہر اُحد کے مقام پر لڑی گئی۔ یہی جنگ تھی جس
میں مسلمانوں کے ایک دستے کے بعض مجاہدوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متعیّن کردہ
جگہ کو چھوڑ دیا اور مالِ غنیمت اکٹھا کرنے لگے تو وقتی طور پر مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔
کیونکہ خالد بن ولید نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مسلمانوں پر اس طرف سے
حملہ کر دیا جس طرف حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پچاس صحابہ کو متعیّن کیا تھا اور ان میں سے بعض
نے فتح ہو جانے کے خیال سے آپؐ کی اجازت کے بغیر اس جگہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اس اچانک
اور غیر متوقّع حملے سے مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی اور بعض صحابہؓ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ لیکن
اس حالت میں بھی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ اسی جنگ میں
آپؐ کا نچلا ایک دانت بھی شہید ہوا۔ اور آپ کو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ آپؐ نے صحابہ
کرامؓ کو آواز دے کر اکٹھا کیا۔ مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر دوبارہ حملہ کیا تو کفّار شکست کھا گئے۔

زندگی کا یہی وہ نقشہ تھا جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی
اطاعت کرتے ہوئے باطل کے خلاف جہاد جاری رکھیں۔ حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند
ہو جائے، دین غالب ہو جائے اور کفر کی جڑ کٹ جائے۔ مسلمانوں نے جب تک فقر کو اپنا
اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، جب تک ان کی راتیں مصلّوں پر اور دن گھوڑوں کی پشتوں

پر لبسر ہوتے رہے۔ وہ دنیا میں غالب رہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مسلمانوں کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہارون الرشید نے ایک بار ہوا میں اڑتے ہوئے بادلوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا "جہاں چاہو برسو، خراج تو مجھے ہی آئے گا"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے ایک واقعے سے اسی قسم کے تصوف کی تصدیق ہوتی ہے۔ جنگِ یرموک کے زمانے میں جب ہرقل نے مسلمانوں پر فوج کشی کرنے کی تدابیر اختیار کیں اور فاروقِ اعظمؓ اس کے مقابلے کے لئے ایک اسلامی لشکر تیار کر رہے تھے تو انہوں نے مسجد نبوی میں ایک مسلمان کو مراقبے میں مستغرق دیکھ کر لاٹھی سے اس کی خبر لی اور کہا "اے کم بخت! مسلمانوں کی تباہی کے سامان کئے جا رہے ہیں اور تو اپنے نفس کی خاطر مراقبے میں ڈوبا ہوا ہے"۔

مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ہی جہاد تھا۔ انہوں نے ایمان و عمل کی حرارت اور عشقِ حقیقی کے جذبے سے سرشار ہو کر دوسری اقوام سے اپنی قوت و طاقت اور شان و شوکت کا لوہا منوایا۔ وہ جہاں بھی گئے باطل کے خس و خاشاک کے لئے آگ کا طوفان ثابت ہوئے۔ انہیں ہر جگہ غلبہ اور اقتدار نصیب ہوا۔ مغلوب قوموں نے اپنے سارے وسائل ان کے آگے لا کھڑے کئے، طاغوتی طاقتیں ملّتِ واحد کی طرح مجتمع ہو کر ہر طرح کے اسلحے سے لیس، مقابلے میں آئیں لیکن مسلمان جاں نثاروں کے سامنے نہ ان کی جمعیتیں ٹھہر سکیں، نہ عسکری برتری اور دوسرے مادی مسائل ان کے کام آئے۔ حق میں بڑی قوت ہوتی ہے اس کے سامنے باطل کے تمام حربے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔

مغلوب قومیں اپنی ساری قوت استعمال کر کے بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ تو انہوں نے عقل کے گھوڑے دوڑائے اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے طریقے سوچنے لگیں۔ غلامی سے نجات پانے کے لئے غلام آدمی کی قوتِ تدبیر بڑا کام کرتی ہے بشرطیکہ وہ اسے سلیقے کے ساتھ استعمال کرے۔

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ زاہد ہے نہ ملّا نہ حکیم

جب سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہو تو غلام کی عقل بھی بڑے بڑے کرشمے دکھا جاتی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو ہم بزورِ بازو تسخیر نہیں کر سکتے۔ شیرِ نر کو بھیڑ بنانا مشکل ہے۔ البتہ اِسے اپنے آپ سے غافل کر دینا آسان ہے۔ شیطان نے انہیں یہ ترکیب سجھائی کہ مسلمان کے بدن سے جہاد کی روح نکال کر ان پر موت کا خوف طاری کر دو۔ ان کے جرأت مندانہ اسلامی نظریات میں بزدلانہ غیر اسلامی نظریات کی آمیزش کر دو۔ اس طرح تم انہیں دنیا کے مختلف ملکوں سے نکال کر ان کا غلبہ ختم کر سکتے ہو ؎

وہ فاقہ کش موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیّلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

مغلوب اقوام نے اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا جو بڑا کارگر ثابت ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کے اندر تصوّف کے راستے نفوذ کیا اور ان میں ایسے عقائد کا چرچا کیا جن کا دینِ اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے سکون اور روحانیت کے متلاشی مسلمانوں کو تعلیم دی کہ سختی اور زور آوری بدبختی کی علامات ہیں۔ زندگی کو استحکام خودی کی نفی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسروں کو مارنے کی بجائے اپنے آپ کو مارنا عقلمندی ہے۔ قوّت اور طاقت سے کمزوری بہتر ہے عظمت و سطوت شر ہے۔ امیری سے تنگدستی بہتر ہے۔ جبر و قہر، انتقام اور اقتدار زندگی کو ناپائیدار کرتے ہیں۔ انتہائی انکسار سے زندگی پائیدار ہوتی ہے کیونکہ سبزہ پامال ہو کر ہی بار بار اگتا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبری روحانی ارتقا کا باعث ہے۔ اپنے

آپ سے غافل ہوجانا عین دانشمندی ہے۔ اللہ تعالیٰ قوت اور اقتدار سے خوش نہیں ہوتا۔ جنّت صرف ضعیفوں اور کمزوروں کے لئے ہے۔ رہبانیت کے اس نظریئے نے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ کمزوری اور نقاہت پیدا کردی۔ اس طرح بھیڑوں کو شکار کرنے والے خود بھیڑیں بن گئے۔ ان پر موت کا خوف طاری ہوگیا اور طاغوتی طاقتوں کو زیر کرنے کا جذبہ سرد پڑ گیا ؎

جنّت از بہر ضعیفاں است و بس !
قوّت از اسبابِ خسراں است و بس
جستجوئے عظمت و سطوت شر است
تنگ دستی از امارت خوشتر است
ذرّہ شو صحرا مشو گر عاقلی
تا ز نورِ آفتابے بہرہ ئی
غافل از خود شو اگر فرزانہ ئی
گر ز خود غافل نئی دیوانہ ئی —!
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

جنّت صرف کمزوروں کے لئے ہے۔ طاقت خسارے کے اسباب میں سے ہے۔ شان و شوکت کی جستجو شر ہے۔ تنگ دستی سے امیری بہتر ہے۔ اگر تو عقلمند ہے تو ذرّہ بن صحرا نہ بن تاکہ تو آفتاب کے نور سے فیض حاصل کرے۔ اگر تو عقلمند ہے تو اپنے آپ سے غافل ہو جا۔ اگر تو اپنے آپ سے غافل نہیں ہوتا تو دیوانہ ہے۔ آنکھیں، کان اور لب بند کرلے تاکہ تیرا دھیان بلند آسمان پر پہنچ سکے۔

مغلوب اقوام کا یہ نسخہ تیر بہدف ثابت ہوا۔ اس تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں میں بے ہمتی

کوتہ دستی اور بے دلی راہ پا گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پاس اقتدار باقی نہ رہا اور وہ غیروں کے محکوم ہو گئے۔ غلامی اور محکومی کی زندگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اور مسلمانوں نے اپنے دین کو تسبیح و مناجات اور نماز روزے تک محدود کر لیا۔ انہوں نے انتہائی درجے کی انکساری اختیار کر کے باطل کے سامنے سر کر رہنا سیکھ لیا اور اسی زندگی پر قانع ہو گئے۔ اسلام کی سربلندی کی خاطر رواں رہنے والا گرم خون ثالوں کی طرح سرد ہو گیا۔ مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی بسر کرنے کی بجائے انہوں نے غاروں میں سکون کی دولت تلاش کرنا شروع کر دی اس طرح اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے آئین کے ذریعے دنیا پر حکمرانی کے ارمان دلوں میں دفن ہو کر رہ گئے ؎

آنکہ کر دے گوسفنداں را شکار
کرد دین گوسفندی اختیار
دل بتدریج از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند
آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت
اعتبارِ عزّت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد
مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
زورِ تن کاہید و خوفِ جاں فزود
خوفِ جاں سرمایۂ ہمّت ربود
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی!
کوتہ دستی، بیدلی، دوں فطرتی!

جو بھیڑوں کو شکار کرتے تھے، انہوں نے خود بھیڑوں کا طریقہ اختیار کر لیا۔ آہستہ آہستہ ان کے دل سینوں سے نکل گئے۔ شیشے کا جوہر شیشے سے محو ہو گیا۔ دین کے لئے ہمہ گیر جد وجہد کا شوق مفقود ہو گیا اور دل میں عمل کا تقاضا باقی نہ رہا۔ فولادی پنجے بے زور ہو گئے۔ دل مردہ ہو گئے اور جسم قبریں بن گئے۔ جسمانی قوت کم ہو گئی اور جان کا خوف بڑھ گیا۔ جان کا خوف جرأت و ہمت کی دولت لے گیا۔ بے ہمتی سے کوتہ دستی، بے دلی اور کمینگی جیسے سینکڑوں امراض پیدا ہوتے ہیں۔

یہ محض فرضی باتیں نہیں بلکہ اس صورتِ حال کی عملی مثالیں موجود ہیں۔ ایک مسلمان پٹھان وحید خان پنجابی کے شاعر تھے۔ وہ ایک ہندو جوگی رگناتھ کے مرید ہو کر ویدانتی فلسفے کے قائل ہو گئے۔ اس تبدیلیٔ خیال و عقیدہ نے ان کی زندگی پر جو اثر کیا اسے وہ خود بیان کرتے ہیں ؎

تھی ہم پوت پٹھان دل کے دل دیں موڑ
چرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ!

یعنی ہم پٹھان کے بیٹے تھے اور جماعتوں کی جماعتوں کے منہ موڑ دیتے تھے لیکن جب رگناتھ کے قدموں میں پڑے تو ایک تنکا توڑنے کے قابل نہ رہے۔

اسلام کی اصل غایت یہ ہے کہ اسے دنیا میں غالب کیا جائے اور اس کے ذریعے دنیا کا نظام چلایا جائے۔ ہمارے دین کی مصلحت جنگ و شکوہ ہے جبکہ عیسائیت میں نجات کی راہ رہبانیت ہے۔ مسلمانوں کی شان و شوکت کا انحصار اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہونے سے ہوتا ہے۔ اگر اسلامی آئین کی بجائے ملک میں غیر اللہ کا قانون نافذ ہو تو مسلمان کے لئے عید کے جشن بھی بے کیف ہوتے ہیں ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

آزاد لوگوں کی عید سے ملک اور دین کی شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے لیکن محکوموں کی

عید سوائے مومنوں کے ہجوم کے کچھ نہیں ہوتی ۔

عیسائی نجات کی خاطر دنیا کو چھوڑ کر غار و کوہ کو اپنا مسکن بناتے اور زندگی کے جھگڑوں اور جھمیلوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمان شان و شوکت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور باطل قوتوں سے جنگ کر کے انہیں زیر کرتا ہے۔ وہ ساری زندگی طاغوتی طاقتوں سے برسرِ پیکار رہتا ہے ۔ وہ زندگی سے فرار نہیں چاہتا ۔ بلکہ زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور جہاں خرابی دیکھتا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بادشاہوں کی طرح دنیا کا نظام چلانا اور اللہ تعالےٰ کے بھیجے ہوئے آئین کو نافذ کرنا عین دین ہے اور یہی مومن کی شان ہے ؎

کار و بارِ خسروی یا راہبی ؟
کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبی ؟
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ !
مصلحت در دینِ عیسٰی غار و کوہ !

دینِ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقصد کیا ہے ؟ بادشاہی یا رہبانیت ؟ ہمارے دین کی مصلحت جنگ و شکوہ میں ہے اور عیسٰی علیہ السّلام کے دین کی مصلحت غار و کوہ یعنی رہبانیت ہے ۔

مغلوب اقوام کی سحر انگیزی سے مسلمان دین کی اصل غایت سے آنکھیں بند کر کے غفلت کی نیند سو گئے ۔ انہوں نے جہاد ترک کر کے چند رسمی عبادات اور تسبیح و مناجات کو مکمل دین سمجھ لیا۔ اس طرح ان کے دلوں میں حبِّ مال اور آرام طلبی نے گھر کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے بھی اس آسان دین کو اپنا کر اس کی تبلیغ شروع کر دی ۔ حالانکہ اگر تسبیح و مناجات اور حجروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا ہی دین ہوتا تو نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی زندگی جہاد میں نہ گزارتے اور شاید اس رویّے سے انہیں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا۔ قرآنِ پاک میں

ہے : یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ۔ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں ۔ گویا جمادات و نباتات بھی تسبیح کرتے ہیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس کی طرف پیغمبر کیوں بھیجے ؟ محض زبان سے اپنی حمد و ثنا کرانی مقصود ہوتی تو وہ پہلے بھی ہو رہی تھی ۔ فرشتے بھی اسی کام میں لگے ہوئے تھے ۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا تھا کہ وہ دنیا میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا ۔ ہم تیری تسبیح و تحمید اور تقدیس بیان کرتے رہتے ہیں تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ۔ ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق اس سے کسی بلند تر مقصد کے لئے تھی اور وہ مقصد یہی تھا کہ انسان دنیا میں اللہ تعالےٰ کی حاکمیت قائم کرے اور اس کے احکام کے مطابق دنیا میں نظامِ حکومت چلائے ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنے والا مسلمان ہوتا ہے اس لئے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ دنیا میں اللہ تعالےٰ کے کلمے کو بلند کرے ، اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق نظامِ حکومت چلائے اور جہاں اس قسم کا نظام موجود نہ ہو اسے بدل کر خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے ۔ اور دنیا میں ہر اس نظام کا مقابلہ کرے جو اس سے متصادم ہو ۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے کہ تم میری مدد کرو میں تمہاری مدد کروں گا ۔ یہ مدد کس لئے ؟ کیا صرف نماز روزے کی پابندی اور تسبیح و مناجات اللہ تعالیٰ کی مدد ہے ؟ ہرگز نہیں ! اللہ تعالیٰ کی مدد یہ ہے کہ اس کی راہ میں جہاد کیا جائے ۔ دنیا میں اس کی حاکمیت قائم کی جائے ۔ اس کے بھیجے ہوئے آئین کے ذریعے دنیا کا نظام چلایا جائے ۔ اللہ تعالیٰ خود سامنے نہیں آتا بلکہ یہ کام وہ اپنے بندوں سے لینا چاہتا ہے تاکہ اس کے جو بندے یہ کام کریں ان کے وہ درجات بلند کرے اور انہیں اپنی رضا اور خوشنودی کی نعمت سے سرفراز کرے ۔ یہی اللہ تعالیٰ کے ماننے والے بہادر بندوں کا دین ہے جس کے لئے اس نے پیغمبر بھیجے اور آخر میں سرورِ کونینؐ کو بھیج کر نبوت کا دروازہ بند کر دیا ۔ اب یہ امتِ مسلمہ کا کام ہے کہ وہ پہلے اپنے ملک میں اور پھر پوری دنیا میں

اللہ تعالےٰ کے کلمے کو بلند کرے ؎

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل —!
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

جہاں اللہ تعالےٰ سے برگشتہ انسان حکمران ہوں، زندگی کے ہر شعبے میں غیر اللہ کے قوانین جاری ہوں، مسلمان اس نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے زندگی گزار رہے ہوں، علامہ اقبال اس رویّے کو خوئے غلامی اور اس نظام کو ابلیسی نظام سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسی نماز کو جو مسلمان کو باطل کے سامنے صف بستہ کھڑے ہو کر لڑنے کے لئے تیار نہ کرے، نمازِ بے قیام کا نام دیتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی میں دل جذبات سے عاری ہو کر مردہ ہو جاتے ہیں، صوفی و ملّا بھی غیر اسلامی نظامِ حکومت سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کو جہاد کا درس دینے کی بجائے غلامی پر قناعت کرنا سکھاتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس حالت کو بدلنے کی کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتے۔

مسلمان اگر وقتی طور پر مغلوب ہو جائے یا کسی طرح اس پر غیر اسلامی نظام مسلّط کر دیا جائے تو وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم نہ کر دے۔ ابلیس چاہتا ہے کہ مسلمان کے دل میں اس نظام کو بدلنے کا خیال بھی نہ آئے۔ اس لئے وہ جب بھی اس نظام کو بدلنے کے لئے میدان میں آنے کے متعلق سوچتا ہے تو ابلیس اسے پیش آنے والے طرح طرح کے خطرات کے وساوس اس کے دل میں ڈال کر اس کی آرزوؤں کو دل ہی میں ختم کر دیتا ہے اور اس کے روبہ عمل آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدّر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں،
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

مسلمان کبھی نظامِ باطل میں خوش و خرم زندگی بسر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے بدلنے کی مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔ وہ نظام تبدیل ہو یا قائم رہے، اسلامی انقلاب آئے یا نہ آئے، مسلمان اگر کوشش کرتے کرتے اپنی جان دے دے تو کامیاب ہوگیا۔ خواہ بظاہر وہ اسلامی نظام برپا کرنے میں ناکام ہی ہوا ہو۔ لیکن اگر اس کے دل میں نہ تو کبھی اس نظام کو بدلنے کا خیال ہی آیا ہو نہ اس نے اس کے لئے جدوجہد کی ہو تو قیامت کے دن یقیناً اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ کیونکہ مسلمان کی زندگی کا تو مقصد ہی اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔

اگر ملک میں اسلامی نظام قائم نہ ہو تو مسلمانوں کے دانشوروں، شاعروں اور علما پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قوم کو خوابِ غفلت سے جگائیں اور ان کے دلوں میں جذبۂ جہاد پیدا کریں لیکن عام طور پر نظامِ باطل میں قوم کے کچھ دانش ور، شاعر اور عالم بھی اس نظام سے راضی ہو جاتے ہیں اور قوم کو بھی اس نظام کو برضا و رغبت قبول کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اس طرح وہ شیروں کو ہرن کی طرح دوڑنا سکھا کر شیروں کی شیری کا فسانہ ہی ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور مسائل کی بڑی دلآویز تاویل کر کے اپنی کمزوری کے حق میں دلائل فراہم کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر حکمران کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ کبھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس نظام کو بدلنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔

اسلامی آئین جاری کرنا حکمرانوں کی ذمّہ داری ہے ۔ اگر وہ اس ذمّہ داری سے غفلت برت رہے ہیں تو قیامت کے دن وہی جواب دہ ہوں گے ۔ اس قسم کی تاویلات سے وہ مسلمانوں کے دلوں میں نظامِ باطل کی جگہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کی تمناؤں پہ پانی پھیر دیتے ہیں ۔

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رَمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ !

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مختلف طریقوں سے اپنے غلط اقدام کو درست ثابت کر دیا جائے یا اس کی ذمّہ داری دوسروں پہ ڈال دی جائے ۔ غلطی کو تسلیم کر لینا بڑی جرأت کا کام ہوتا ہے ۔ اپنی غلطیوں کو چھپانے کے لئے انسان طرح طرح کے بہانے تراشتا ہے مختلف احکام کی مختلف تاویلات کر کے اپنے آپ کو بری الذّمہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے ، اور کسی صورت تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ہوتا ۔

پہلے زمانے میں صوفیا بڑی سرگرم اور مجاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ بادشاہوں کے درباروں میں تو کیا تختۂ دار پر بھی کلمۂ حق کہتے رہے اور دل و جان سے حق پرستی کا حق ادا کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ تصوّف میں عجمی خیالات کی آمیزش ہوئی تو روحانیت

اور تصوّف کے نام پر زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کر لی گئیں۔ فنافی اللہ اور وحدت والوجود کو غلط معنی پہنا کر مسلمانوں کے فکر وسوچ کے دھارے بدلنے کی کوشش کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر بے عملی اور جمود کی کیفیت طاری ہوگئی۔ شریعت کے معرکے تو بڑے سخت تھے۔ جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ زندگی کے ہر میدان میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا اس لئے شریعت کی اصل روح سے دور ہٹ کر رہبانیت کو دین کا حاصل سمجھ لیا گیا، اور محض درود و وظائف اور مراقبوں سے سلوک کی تمام منزلیں طے ہونے لگیں۔ دین کی روح کو سمجھنے والے عالموں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بے عملی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اب اگر ان لوگوں کی توجّہ دین کی اصل روح کی طرف دلائی جائے تو مختلف تاویلات اور بہانوں کے ذریعے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے زندگی سے شکست نہیں کھائی بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل زندگی ہے ہی یہی جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

مجاہدانہ حرارت نہ رہی صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ اَلَست
فقیہہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مَردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست ؟

ملّت کے اتحاد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے افراد کی سوچ اور فکر میں یکسانیت ہو۔ ذہنی ہم آہنگی سے افکار و خیالات میں یگانگت پیدا ہوتی ہے، اس طرح وحدتِ افکار سے قومی اتحاد وجود میں آتا ہے اور قوم مضبوط ہوتی ہے۔ مسلمان کے نظریات و افکار کا سرچشمہ کتاب و سنت ہوتے ہیں اس لئے تمام ملّت کی سوچ ایک ہوتی ہے۔ ان کا خدا ایک،

قرآن ایک، رسول ایک اور قبلہ ایک ہوتا ہے۔ اسلام کسی پر اپنے نظریات زبردستی مسلط نہیں کرتا۔ بلکہ وہ غیر مسلموں کے سامنے اپنے عقائد و نظریات کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے اور انہیں خوب سوچ سمجھ کر قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ایک بار جو شخص برضا و رغبت اسلام قبول کر لے، پھر دین حق یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی ان اعلیٰ اصولوں کو چھوڑ کر گھٹیا اصولوں کو اپنائے اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کر لے یا ایسے افکار و نظریات کی تشہیر کرے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہوں۔ اسلام اسے اپنی توہین سمجھتا ہے، اور یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی شخص کفر کا راستہ اختیار کرے وہ کسی کو یہ آزادی نہیں دیتا کہ کوئی اسے سوچ سمجھ کر قبول کرنے کے بعد اسے چھوڑ دے اور دوسروں کے لئے مفاد پرستی کی خاطر دین کو کھلونا بنانے کی مثال قائم کرے۔ اسی لئے اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ جس چیز سے ملّت کے اتحاد پر زد پڑتی ہو، اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے خواہ ایسے نظریات پیش کرنیوالا کوئی بھی ہو بلکہ ایسے شخص کا الہام بھی الحاد تصوّر کیا جائے گا۔ اسلام کا یہ اصول ملّت کے استحکام کے لئے بہترین حربہ ہے۔ اس کے ذریعے لسانی، علاقائی، نسلی، خاندانی اور دیگر تعصبات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی ایسے فتنہ کو ہوا دے کر اپنا مفاد حاصل کرے اور ملّت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرے تو اسلام اس کا سختی سے محاسبہ کرتا ہے۔ اسلامی حکومت کا یہ اوّلین فرض ہوتا ہے کہ وہ ملّت کی وحدت کو برقرار رکھے اور ملک میں کسی ایسے فتنے کو سر نہ اٹھانے دے جو ملّی اتحاد میں انتشار کا باعث ہو۔ ہم اپنے ملک میں اسلام کی اس تعلیم کی خلاف ورزی کر کے ایک بہت بڑے المیے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث وحدتِ افکار کا فقدان تھا۔ شروع میں اگر حکومت اس فتنے کی طرف توجّہ دیتی اور لسانی اور صوبائی تعصبات کو ہوا دے کر اپنا الّو سیدھا کرنے والوں کا سختی سے نوٹس لیتی تو یہ قوّتیں اتنی مضبوط

نہ ہوتیں کہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی کسی سازش کے لئے تقویت کا باعث بنتیں۔
ایک اسلامی ملک میں غیر مسلموں کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں، ان کے تحت وہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن مسلمان ہو کر غیر اسلامی نظریات کا حامل اور پرچارک ہونا بڑا بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس لئے اسلام قوت اور سختی کے ساتھ اس فتنے کو دبانے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل دین ہے اس لئے اس میں غیر اسلامی اور لادینی نظریات کا پیوند لگانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان ہوتے ہوئے اسلام میں سوشلزم کمیونزم یا کسی اور ازم کی گنجائش نکالنا اسلام سے انحراف کے مترادف ہے

جب کسی قوم کی سوچ اور فکر میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے اصل مقصد کو چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اس کے پاس زندگی کے جو اعلیٰ اصول موجود ہوتے ہیں، وہ اسے بیکار نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس میں کھوٹے کھرے کی پہچان باقی نہیں رہتی اس کی راست بین نگاہ کج بین ہو جاتی ہے اور اس طرح قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے:

چوں شود اندیشۂ قومے خراب
ناسرہ گردد بدستش سیمِ ناب
میرد اندر سینہ اَش قلبِ سلیم
در نگاہِ او کج آید مستقیم

جب کسی قوم کی سوچ میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس کے ہاتھ میں خالص چاندی بھی کھوٹی بن جاتی ہے۔ اس کے سینہ میں قلبِ سلیم مردہ ہو جاتا ہے، اور اسے غلط چیزیں بھی درست نظر آنے لگتی ہیں۔

قوم کی فکری وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے قوت و طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور قوت و طاقت کا سرچشمہ اقتدار اور حکومت ہے۔ جس معاشرے میں اسلامی قوانین کو بالادستی حاصل نہ ہو وہاں مسلمان حکمرانوں کے ہوتے ہوئے بھی اسلام بے بسی

کے عالم میں ہوتا ہے اس لئے جو شخص بھی چاہتا ہے ملّتِ اسلامیہ میں ذہنی انتشار پیدا کر کے اس کے قصرِ وحدت میں نقب لگا دیتا ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں ایسے ہی ملکوں میں اپنے نظریات کا پرچار کرتی ہیں۔ اسلام کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے نت نئے شگوفے چھوڑتی ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے ایسے نام نہاد مجتہد پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو کبھی سود کو حلال کر دیتے ہیں، کبھی قربانی کے متعلق کوئی نیا فلسفہ گھڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔ کوئی مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیتا ہے اور کوئی مساوات کے نام پر اسلام کو سوشلزم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے اپنے ملحدانہ نظریات کے لئے اسلام کو تختۂ مشق بنا لیتا ہے مسلمان اپنے طور پر ان شر انگیزیوں کو رد کرنے کے لئے جتنی کوششیں بھی کریں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کارگر ہو جائیں تو طاغوتی طاقتیں کسی دوسرے محاذ سے اسلام پر یلغار کر دیتی ہیں۔ اس طرح امّتِ مسلمہ کے لئے نت نئے فتنے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان فتنوں کو روکنے کے لئے عقل و دانش کے تمام منصوبے بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص بھی امّت کے مجتمع ہونے کے بعد اس میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے اس کی گردن اڑا دینا۔ حکومت کی طاقت اور قوّت حاصل نہ ہو تو کسی فتنے کو دبایا نہیں جا سکتا۔ ذرا غور کیجیے ایک شخص نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو اپنا پیروکار بھی بنا لیتا ہے۔ اس فتنے کو دبانے کی بجائے حکومت اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ کیا کوئی شخص اس کے سوا اس کا کوئی اور حل پیش کر سکتا ہے کہ ایسے فتنے کا قلع قمع کرنا حکومت کا کام ہے، اور حکومت ایسے فتنوں کی روک تھام اس وقت کر سکتی ہے جب ملک میں اسلامی آئین نافذ ہو۔

اللہ کے دستور کی خلاف ورزی کر کے مسلمان کبھی غالب قوم کی حیثیت سے دنیا

میں نہیں ابھر سکتے۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی قوانین نافذ ہوں لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کو غالب کرنے کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔ وہ سمجھتے ہیں ہمیں نجی طور پر نماز پڑھنے سے کوئی نہیں روکتا اس لئے اسلام آزاد ہے۔ حکمران طبقہ بڑی شان سے غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین مسلّط کرتا ہے اور مسلمان بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں محکومی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں اس نظام کو بدلنے کی کوئی آرزو اور تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ دنیا کی ہماہمی سے الگ ہو کر مسکینی اور ناامیدی کے عالم میں زندگی بسر کرنے کا نام تصوّف رکھ لیا گیا ہے ؎

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوّت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محرومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کرا یاد
ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

مسلمان اسلام پر عمل پیرا ہونے کا دعوٰی کرتا ہے وہ زبان سے اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کا اقرار اور بت پرستی سے نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کی زبان پر بھی اللہ کا نام رہتا ہے لیکن اس کا دل غیر اسلامی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جب دل ہی صحیح معنوں میں مسلمان نہ ہو تو اعمال میں اسلامی رنگ کیسے نظر آسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدّن، معاشرت،

تصوّف، شریعت، فلسفہ غرضیکہ ہر چیز میں غیر اسلامی نظریات شامل ہو گئے ہیں۔ بعض بیہودہ قسم کی غیر اسلامی رسمیں اور روایتیں دین کا حصّہ بن گئی ہیں۔ چونکہ اصل دین کا ان خرافات اور روایات سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے امّت ان روایات میں کھو کر اپنے اصل مقصد کو بھول گئی ہے، اور اس نے روایات اور رسوم و رواج کو دین سمجھ لیا ہے۔

صوفیا نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ دنیا میں اسلام کو جو وسعت اور ترقی نصیب ہوئی اس کا بیشتر حصّہ اولیاء اللہ اور صوفیا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان اولیا کا کردار بے داغ ہوتا تھا۔ یہ خلق خدا سے محبّت و شفقت میں بے مثال تھے۔ ان کی شخصیتوں میں بڑی جاذبیت اور کشش تھی۔ لوگ خود بخود ان کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ یہ اولیاء اللہ شریعت کے متّبع اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے پابند تھے ان کی زندگیاں ان اخلاق حسنہ کا مرقّع تھیں جن کی تعلیم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دی تھی۔ انہوں نے مردانہ وار حق کی آواز اٹھائی، جابر سلطانوں کے سامنے کلمۂ حق کہا اور اسلام میں نئے نئے داخل ہونے والوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ اسلام کے مجاہد ثابت ہوئے۔ یہ اولیاء اللہ بڑے غیور و جسور تھے۔ انہیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔ انہوں نے ہمیشہ بادشاہوں کو راہ راست پر رکھنے کی کوشش کی بعض اوقات بیرونی مجاہد مسلمان بادشاہوں کو طاغوتی طاقتوں کی گوشمالی کے لئے دعوت بھی دی لیکن آہستہ آہستہ تصوّف میں گوشہ نشینی اور دنیا کے معاملات میں عدم مداخلت جیسے غیر اسلامی نظریات شامل ہو گئے جس سے دلوں میں دین کی اقامت کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ عام مسلمانوں کی طرح تصوّف کے علمبرداروں پر بھی جمود کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ دنیا سے الگ تھلگ تسبیح و مناجات میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے راستے کے مقامات کو منزل سمجھ کر ان پر قناعت کر لی۔ حالانکہ مردِ مومن کی بلندیٔ منزل کا کوئی ٹھکانہ نہیں دنیا میں جب تک کسی ایک جگہ بھی کفر کا غلبہ موجود ہو مومن اس کی جگہ حق کا غلبہ قائم کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہیں زنّار پوش
تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی!
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی!
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

جس قوم میں فکری ہم آہنگی کا فقدان ہو، اس کے صوفی، شاعر اور عالم اپنے لئے الگ الگ راستے متعیّن کر لیتے ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے خیالات میں مگن ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام مسلمان کے لئے زندگی کے جس راستے کا تعیّن کرتا ہے وہ صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کی اتّباع کی جائے اور اس کام کو جاری رکھا جائے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ یعنی دینِ حق کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے سلسلے میں جد و جہد کی جائے۔ جب اس راستے کو مسلمان نے چھوڑ دیا تو اس کے صوفی اپنے حال میں مست رہنے لگے۔ انہوں نے زندگی کے مسائل سے آنکھیں پھیر لیں۔ تنگ نظر ملّا زبان کے غازی بن گئے، اور عوام کو جہاد کی تدبیریں بتانے کی بجائے اپنے اپنے مسلک کے فروعی اختلافات کو ہوا دے کر اپنی برتری جتانے کی فکر میں لگ گئے اور فکر و تدبیر اور جہاد کا راستہ کفّار نے اختیار کر لیا۔

قوم کے شاعر بھی قوم کی مردہ رگوں میں زندگی پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی تخیّلات کی دنیا میں گم ہو کر قوم کی افسردگی میں اضافے کا سبب بن گئے۔ اس طرح وہ مردِ مجاہد ناپید ہونا شروع ہو گئے جن کی تیغِ بے نیام باطل کے لئے موت کا پیغام بنتی ہے۔ قوم میں تازہ روح پھونکنے والے یہ طبقے اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر مردِ مومن کے کردار سے تہیدست ہو گئے تو پوری قوم پر غفلت کی نیند طاری ہو گئی ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو!
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

جب تصوّف سے جہاد کی روح نکل گئی، بلندیٔ اخلاق و کردار کا معیار کم ہو گیا، خلقِ خدا کی رہنمائی سے غفلت برتی گئی، فقر و استغنا، کی جگہ حرص و ہوس نے لے لی تو خود فریبی میں مبتلا کچھ لوگوں نے اسے ایک پیشہ بنا لیا۔ کسی زمانے میں قرآنِ پاک پر عمل کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے صوفی ہوتے تھے۔ لیکن اب دنیا و مافیہا سے بے خبر حرص و ہوس کے پجاری صوفی بن گئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ دو بھیڑیے اگر بھیڑوں کے گلّے میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا مال و جاہ کی ہوس دین کا نقصان کرتی ہے۔ صوفیوں، مذہبی پیشواؤں اور واعظوں نے اسلام کی شان و شوکت بڑھانے کی بجائے مال و جاہ کے حصول کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اسلام میں غیر اسلامی رسم و رواج داخل ہونے شروع ہو گئے، اور ان لوگوں کی خاموشی نے ان کے برحق ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تو غیر مسلموں کو مسلمانوں پر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ جہلا کے لئے تصوّف کا معیار

یہاں تک گرا کہ جس نے بھی بال بڑھا لئے وہ صوفی بن گیا اور لوگوں کو مرید بنا کر اپنا حلقۂ ارادات وسیع کرنے لگا۔ دین و دنیا سے بے خبر لوگ درویش کہلانے لگے۔ پیری مریدی ایک کاروبار بن گیا۔ جتنا کسی شخص نے عوام کی نفسیات سے آگاہ ہو کر کاروبار چلانے کا سلیقہ سیکھ لیا جہلا کے لئے اتنا ہی کامل بن گیا۔ سادہ لوح مریدوں نے بھی دین و دنیا میں کامیابی کا آسان نسخہ دریافت کر لیا کہ بیعت کی اور بغیر عمل کے بیڑا پار ہو گیا دنیا میں بھی کامیابی کے لئے پیر صاحب کی دعائیں شاملِ حال ہو گئیں اور آخرت کے لئے بھی وسیلہ بن گئے۔ اصلی اور کامل صوفی ایک نگاہ سے دلوں کی کایا پلٹ دیتے تھے۔ مریدوں کی باعمل زندگی کو دیکھ کر پیر کے کامل ہونے کا پتہ چلتا تھا لیکن اب پیروں کو صرف اس بات کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کے مریدوں میں اضافہ ہو تاکہ ان کی شان و شوکت بڑھے۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ بیعت کے بعد مرید کی زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ پیر صاحب کو نذرانے وصول کرنے اور اپنی عزّت و توقیر میں اضافہ سے غرض ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ مرید کی آمدنی حلال ہے یا حرام، اس نے بددیانتی جھوٹ اور فریب کو چھوڑ دیا ہے یا نہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں، رشوت خور افسر نے رشوت لینی چھوڑ دی ہے یا نہیں۔ کامل صوفی اور ولی اللہ کسی کے حق میں دعا کرنے سے پہلے تحقیق کرتے تھے کہ دعا کرانے والا حق پر ہے یا نہیں اگر حق پر ہوتا تو دعا فرما دیتے ورنہ اس کی عرض رد کر دیتے۔ بیعت ہونے کے بعد بھی مرید اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی نہ لاتا تو اس سے قطع تعلق کر لیتے۔ لیکن یہاں معاملہ ہی اور ہے۔ قاتلوں تک کی رہائی کے لئے دعا کر دی جاتی ہے۔ کسی بھی ناجائز کام کے لئے سفارش کرائی جا سکتی ہے۔ پیر صاحب اپنے مرید افسر کے نام سفارشی رقعے میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ کام کر کے "عند اللہ ماجور" ہوں۔ گویا ان کے نزدیک اللہ کے ہاں ناجائز کام کرنے کا بھی اجر ہے۔

مسلمان ہر کام کے لئے پوری کوشش کرتا ہے اور پھر نتیجہ اللہ تعالےٰ پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کامیابی کے لئے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا ہے۔ کسی نیک آدمی سے دعا کرانا بھی درست ہے۔ اس میں ہرج کی کوئی بات نہیں۔ مومن اوّل تو کوئی خلافِ شرع کام کرتا ہی نہیں، اگر کرتا ہے تو کوئی مردِ کامل اس کے کہنے پر اس کی کامیابی کی دعا کر کے اپنے آپ کو اس گناہ میں شریک نہیں کرتا۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید جو ہندوستان کا بادشاہ تھا اور تسخیرِ ممالک کا ارادہ رکھتا تھا، میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چاندی کے سکّے پیش کر کے عرض گزار ہوا کہ میں نے تسخیر کے ارادے سے دکن پر فوج کشی کی ہے۔ آپ کامیابی کے لئے دعا کریں۔ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ سکّے واپس کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے بادشاہ ہی کا حق ہے جو شاہی لباس میں گدا ہے۔ اس کا اقتدار خلق کا دشمن ہے۔ نوعِ انساں کا رداں ہے، اور وہ رہزن ہے وہ لوٹ مار کو تسخیر کا نام دے کر خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اسے جوعُ الارض کا مرض ہے۔ بادشاہی فوج اور دشمن کی فوج کے آدمی ناحق قتل ہو رہے ہیں اور اس کی ذمّہ داری بادشاہ پر ہے۔ تلوار صرف رضائے الٰہی اور دینِ حق کی سربلندی کے لئے اٹھائی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے تلوار اٹھانا جائز نہیں ؎

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
میکند تاراج را تسخیرِ نام
عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم!
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دو نیم
آتشِ جانِ گدا جوعِ گداست
جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

اپنے فکرِ خام اور خود فریبی کے خیال سے لوٹ مار کو تسخیر کا نام دیتا ہے۔ بادشاہی فوج اور دشمن کی فوج دونوں اس کی بھوک کی تلوار سے دو ٹکڑے ہو رہی ہیں۔ گدا کی بھوک اس کی جان کے لئے عذاب ہوتی ہے لیکن بادشاہ کی بھوک ملک و ملّت کے لئے تباہی کا باعث بنتی ہے۔ جس شخص نے بھی غیر اللہ کے لئے تلوار اٹھائی وہ اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم صحابہ کرامؓ کے درمیان اس طرح تشریف رکھتے تھے کہ اجنبی آدمی کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے پیر یہ برداشت نہیں کرتے کہ مرید اُن کے برابر بیٹھیں۔ ادب و احترام کے نام پر طرح طرح کی بدعات رائج کر دی ہیں۔ غیر مسلموں کی بہت سی رسومات کو اسلام میں داخل کر لیا ہے۔ بالوں کی کتاب پر عمل کر کے پیر بننے والوں کے دل توحید سے خالی ہیں۔ نمود و نمائش سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ مریدوں کے جلو میں رات دن سفر میں رہتے ہیں۔ ملک و ملّت کی ضروریات سے آنکھیں بند کئے ہوئے اپنے حال میں مگن رہتے ہیں۔ ملک میں فحاشی عام ہو رہی ہو، لادینی نظریات پھیل رہے ہوں، سوشلزم کا سیلاب آ رہا ہو، ملّت کو فرقہ پرستی کا گھن کھائے جا رہا ہو، صوبائی اور لسانی تعصّبات کے اژدہا منہ کھولے کھڑے ہوں، غیر اسلامی آئین ملک پر مسلّط کیا جا رہا ہو، عوام کو ناروا پابندیوں میں جکڑ کر آزادی سے محروم کیا جا رہا ہو، ملک اندرونی اور بیرونی طور پر دشمنوں میں گھرا ہوا ہو، نظریۂ پاکستان کی حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو، رشوت، بد دیانتی اور بدعنوانی عام ہو رہی ہو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کھلے بندوں کی جا رہی ہوں، انہیں ان باتوں کا ذرا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بینائی سے اور سینے دلوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ واعظ اور مفتی بھی اپنے وعظ اور فتوے فروخت کر کے کافروں کو اسلام پر ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان حالات میں جو شخص بھی دین کو اس کی روح کے ساتھ سمجھے اور

اور اس پر عمل کرے۔ وہ یقیناً بڑا خوش نصیب انسان ہے ؎

کعبہ آباد است از اصنامِ ما
خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما
شیخ در عشقِ بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زُنّار ساخت
پیرِ ما پیراز بیاضِ مُو شُدند
سبحہ بہرِ کو دکانِ کو شُدند
دل ز نقشِ لا الٰہ بیگانہ
از صنم ہائے ہوس بت خانہ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ ایں سوداگرانِ دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر
از ضرورت ہائے ملّت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند
سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست
اعتبارِ ملّتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت
مفتیٔ دینِ مبیں فتوٰی فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما
رُخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

کعبہ ہمارے بتوں سے آباد ہے اور کفر اسلام پر خندہ زن ہے۔ شیخ نے بتوں کے عشق میں اسلام گنوا دیا۔ اپنی تسبیح کی لڑی زنّار سے تیار کی۔ پیر بالوں کی کتاب پر عمل کر کے پیر بن گئے ہیں اور گلی کے بچّوں کے لئے ہنسی کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ ان کے دل توحید کے نقش سے خالی ہیں اور ہوس کے بتوں سے صنم خانے بنے ہوئے ہیں۔ ہر لمبے بالوں والا درویش اور صوفی بن جاتا ہے۔ افسوس ان دین بیچنے والے سوداگروں پر! مریدوں کے ساتھ رات دن سفر میں رہتے ہیں اور قوم کی ضروریات سے بے خبر ہیں۔ ان کی آنکھیں نرگس کی طرح بے نور ہیں۔ اور ان کے سینے دل کی دولت سے خالی ہیں۔ منصب پرست واعظوں اور صوفیوں نے امّت مسلمہ کا اعتبار کھو دیا۔ ہمارے واعظ نے اپنی آنکھیں بت خانہ پر گاڑ دیں۔ دینِ مبین کے مفتی نے فتوٰی فروخت کرنا شروع کر دیا۔ دوستو! اس کے بعد ہماری تدبیر کیا ہو! ہمارا پیر شراب خانے کی طرف رخ رکھتا ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اصلاح و ارشاد کے متعلق دو زرّیں اصول دیئے تھے۔ ایک یہ کہ مصلح اور مرشد رشد و ہدایت کے سلسلے میں کسی اجر کا مطالبہ نہ کرے۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے اپنی اپنی امّت سے کہا کہ وہ ان سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ بڑی سے بڑی شخصیّت کی بھی اطاعت صرف معروف میں کی جائے گی اور کسی کا کوئی ایسا حکم واجب الاطاعت نہیں ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ لیکن دورِ حاضر کے پیروں نے اپنی برتری قائم کرنے کی خاطر ان دونوں اصولوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

ہندوؤں میں برہمنوں کو تمام ہندو طبقوں پر برتری حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ برہمن کی زبان سے جو کچھ نکلے اسے پرمیشور کا حکم سمجھو اور اس کی اطاعت کرو۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنی پوجا کرائی بلکہ دان پرساد وصول کر کے امیر بننے کا بھی گُر دریافت کر لیا۔

مسلمان پیروں نے بھی برہمنوں کی طرح مختلف حیلوں بہانوں سے نہ صرف نذرانے وصول کرنے شروع کر دیئے بلکہ اپنے ہر حکم کو واجب الاطاعت قرار دے کر اپنی پرستش بھی کرانے لگے۔ چنانچہ حافظ شیرازی

فرماتے ہیں ؎ بہ مئے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید۔ یعنی اگر تیرا پیر تجھے مصلّے پر بیٹھ کر شراب پینے کا حکم دے تو اس کی بھی تعمیل کر ؎

ہم کو تو میسّر نہیں مٹّی کا دِیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بُتاں پُجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد،
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

پہلے اولیاء اللہ کو کتاب و سنّت سے عشق ہوتا تھا اور یہی عشق وہ دوسروں میں پیدا کرتے تھے۔ وہ اسوۂ رسولؐ کے خود بھی شیدائی تھے اور دوسروں کو بھی اس کا شیدائی بناتے تھے۔ نہ وہ خود کرامتوں پر فریفتہ ہوتے تھے نہ دوسروں کو اس کا فریفتہ بناتے تھے۔

ان سے اگر کوئی کرامت ظاہر بھی ہوتی تھی تو جا بے جا اس کے اظہار سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کا ہر عمل خلوص پر مبنی ہوتا تھا اور ریاکاری کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی اور ولایت کا شہرہ سن کر ایک شخص ان کے پاس آیا اور چند دن قیام کے بعد واپس روانہ ہوگیا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو حضرت جنید بغدادیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کیسے آئے تھے اور اب کیسے واپس جا رہے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا میں تو یہ سن کر آیا تھا کہ آپ بڑے بزرگ ہیں اور صاحبِ کرامت ہیں۔ مگر میں نے آپ میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کیا تو نے میرا کوئی عمل کتاب و سنّت کے خلاف دیکھا ہے؟ اس شخص نے کہا

نہیں۔ آپ نے فرمایا "بس جنید کے پاس تو یہی کچھ ہے"۔ اب مرید بھی کرامتوں کے شیدائی ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں کو بڑھا چڑھا کر افسانہ بنا دیتے ہیں اور پیر صاحب بھی یہ جانتے ہوئے کہ ان کے مریدان کے بارے میں مبالغے سے کام لے رہے ہیں، ان کی اصلاح نہیں کرتے ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

قرآنِ پاک کے احکام کو اگر انسان خلوص کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرے تو اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ جن احکام کا تعلق بنیادی عقائد و اعمال سے ہے، وہ اتنے واضح ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن بعض لوگ پہلے ہی ایک عقیدے اور عمل پر جمے ہوتے ہیں اس کو قرآن کے مطابق بدلنے کی بجائے قرآنِ پاک کی آیات کی کوئی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ مطلب کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں اور اس کے مفہوم کو اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق ڈھال لیتے ہیں ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

قرآن پاک میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اپنے بیٹوں سے پوچھا "میرے بعد کس کی بندگی کرو گے" تو انہوں نے کہا "ہم تمہارے اور تمہارے باپ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السّلام کے الٰہِ واحد کی پرستش کریں گے، اور ہم اسی کے احکام ماننے والے ہیں"۔ بات بالکل سیدھی ہے کہ ہم خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔ لیکن بعض لوگ اس سے آبا پرستی کا جواز مہیّا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السّلام کے بیٹوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اپنے خدائے واحد کی عبادت کریں گے بلکہ اپنے باپ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے اور تمہارے آبا و اجداد کے رب کی عبادت کریں گے۔ اس لئے باپ دادا کے دین

پر چلنا ضروری ہے اور ان کی طرف سے جو رسوم و رواج ورثے میں ملیں ان پر عمل کرنا ہی سعادت مندی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کی تو آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لینے کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ اس سے بعض لوگ یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدد حاصل کرنے کے لئے ان کے گھر گئے تھے۔ اس لئے پریشانی کے وقت بزرگوں کے مزار پہ جا کر ان سے مدد مانگنا جائز ہے۔ اس طرح تاویل کے ذریعے مقابر پرستی کی دلیل مہیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ سے اس عقیدے کا کوئی تعلق نہیں:

قرآن پاک میں ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔"

بات بالکل سیدھی ہے کہ زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ تعالےٰ ہے۔ اسے قرآنِ پاک میں کئی دوسری جگہوں پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِ خَزَآئِنِهٖ بِیَدِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ خَزَآئِنِهٖ بِیَدِكَ

"اے اللہ میں تجھ سے اس بھلائی کا سوال کرتا ہوں جس کے خزانے تیرے ہاتھ میں ہیں اور اس شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کے خزانے تیرے ہاتھ میں ہیں۔"

یعنی خیر و شر کے تمام خزانوں کا مالک اللہ تعالےٰ ہے۔ اب اس کی تاویل ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں

کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے یہ اس لئے کہلوایا گیا ہے کہ خزانے تو خزانچی کے پاس ہوتے ہیں جو مالک کے حکم سے خرچ ہوتے ہیں۔ آپ کہہ دیں میں مالک ہوں خزانچی نہیں ہوں۔

اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا حرام اور شرک ہے۔ لیکن جو لوگ مقبروں پر پیشانی رگڑتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ سجدہ تو اس وقت بنتا ہے جب سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھا جائے۔ یہ پڑھے بغیر پیشانی قبر پر رکھ دینا سجدہ نہیں ہے ؎

زِمَن بر صوفی و مُلّا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا!
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را!

صوفی و مُلّا پر میرا سلام ہو۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام مجھے سنایا لیکن ان کی تاویل اس طرح کی کہ خدا، جبریل اور مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی حیران رہ گئے۔

اصل صوفی وہی ہوتا ہے جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو اور فقر کی صفات میں سے ایک صفت اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا اور مشقتیں برداشت کرنا ہے۔ اب جو لوگ صوفی کہلاتے ہیں ان کے دلوں میں جہاد کا وہ ولولہ اور ذوق و شوق باقی نہیں رہا۔ انہوں نے ذکر و فکرِ صبحگاہی کو متاعِ حیات سمجھ لیا ہے۔ پہلے زمانے کے جو صوفی فقر کے علمبردار ہوتے تھے وہ جذبۂ جہاد سے بھی سرشار ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے خون سے بہادری اور شجاعت کی وہ داستانیں رقم کیں کہ تاریخ کے اوراق ان کے زندۂ جاوید کارناموں کی بدولت تابندہ ہیں۔ اس زمانے میں بہادری اور شجاعت کو فقر اور فقر کو تصوّف کی سند سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب تصوّف کا دامن ایسے فقر سے خالی ہو گیا ہے ؎

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

خانقاہی نظام

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہی نظام کی ابتدا عیسائی علما کے نظریۂ رہبانیّت سے ہوئی۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے دو سو سال بعد تک مسیحیت میں رہبانیّت کا کوئی تصوّر نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیّت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لئے عیسائی علما نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ مشرک سوسائٹی کی لذّت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترکِ لذّات، نفس کو مارنا، خواہشات کا قلع قمع کرنا اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیّت دینے ہی کو آدمی کی روحانیت کا کمال قرار دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین دار آدمی کے لئے سرے سے کسی قسم کی املاک رکھنا ہی گناہ سمجھا جانے لگا اور اخلاق کا یہ معیار ہو گیا کہ آدمی ہر لحاظ سے تارک الدنیا اور مفلس ہو۔ عوام بھی صرف اسی شخص کو خدا رسیدہ سمجھنے لگے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہ رہا ہو۔ عیسائی علما نے یہ نظریہ بدھ مذہب کے بھکشوؤں، ہندو جوگیوں، قدیم مصری فقرا اور ایران کے مانویوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیۂ نفس اور تقرّبِ الٰہی کا وسیلہ قرار دے لیا۔

شروع شروع میں کلیسائی نظام نے رہبانیّت کے اس نظریّے کی مخالفت کی لیکن زیادہ عرصہ تک وہ اس کی مخالفت کا متحمّل نہ ہو سکا اور آہستہ آہستہ رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام کا حصّہ بن گئے۔ چنانچہ چرچ کے خدمت گاروں اور پادریوں کے لئے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ ازدواجی زندگی سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھیں۔ ابتدا میں یہ پابندی صرف پادریوں اور چرچ کے خدمت گاروں کے لئے تھی۔ لیکن بعد میں ہر شخص کے لئے کہ جو خدا کی محبّت چاہتا ہو ضروری قرار دیا گیا کہ وہ انسانی محبّت

کی ساری زنجیریں کاٹ کر بہن بھائیوں، بال بچّوں اور ماں باپ سے بھی قطع تعلق کرلے۔ چنانچہ ولایت کا مقام حاصل کرنے کے خواہش مند دنیا کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرنے لگے۔

چوتھی صدی عیسوی تک تارک الدنیا لوگوں کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ ان کے کے لئے الگ خانقاہیں تعمیر کرنا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ سب سے پہلے مصر میں سینٹ اینتھنی نامی راہب نے پسپیر کے مقام پر پہلی خانقاہ تعمیر کی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لئے خانقاہیں تعمیر کی جانے لگیں۔ ان میں سے بعض تو اتنی وسیع و عریض ہوتی تھیں کہ ان میں تین تین ہزار راہبوں کے رہنے کی گنجائش ہوتی تھی۔ جو لوگ بھی عیسائی علما کے وعظ سے متاثر ہو کر تقرّبِ الٰہی حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے وہ ان خانقاہوں کا رُخ کرتے۔ خانقاہوں کے منتظمین انہیں طرح طرح کی ریاضتیں کرا کر سلوک کی منزلیں طے کراتے اور جتنا کوئی شخص نفس کشی میں کمال حاصل کرتا اتنا ہی بڑا ولی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے کے عیسائی اولیا کے تذکرے نفس کشی اور اپنے جسم کو اذیّت پہنچانے کے لئے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ ان ریاضتوں اور نفس کشی کے واقعات میں جن عیسائی راہبوں نے شہرت حاصل کی اور عیسائیوں کے نزدیک ولایت کے مقام تک پہنچے ان میں سکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت ۸۰ پونڈ بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ وہ چھ مہینے تک ایک دلدل میں سوتا رہا، اور زہریلی مکھیاں اس کے جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کا ایک مرید یوسی بیوس اپنے پیر سے بھی سبقت لے گیا۔ وہ ۱۵۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ ہیساریوں نے ۴۰ سال تک زمین پر پیٹھ نہیں لگائی۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس دوران وہ نہ تو کبھی بیٹھا اور

نہ لیٹتا۔ آرام کے لئے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا۔ اس کی غذا صرف وہ تبرک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لئے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سیمیون اسٹائیلائٹ جو عیسائی ادبیائے کبار میں شمار ہوتا ہے' ایسٹر سے پہلے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنوئیں میں جا رہتا تھا۔ بعض راہب کئی کئی سال تک کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ جنگلوں میں مارے مارے پھرتے اور گھاس پھونس کھا کر گذارہ کرتے۔ بعض اپنے اعضا کو طوق و سلاسل سے جکڑے رکھتے تھے۔ کچھ لوگ ہر وقت ننگے رہتے تھے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے تھے۔ بعض ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ سینٹ ابراہام جب سے مسیحیت میں داخل ہوا پورے پچاس سال تک اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔

راہبوں کی غیر معمولی ریاضتوں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر عوام میں ان کے لئے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ درویشی کا لباس پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترکِ دنیا کے بھیس میں جلبِ زر کا ایسا کاروبار چمکایا کہ اس سلسلے میں بڑے بڑے طالبانِ دنیا ان سے مات کھا گئے۔ ان راہبوں نے عوام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ جس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے یا کسی خانقاہ یا چرچ میں جا کر اعترافِ گناہ کرنے اور بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس عقیدے کے عام ہوتے ہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی اور وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ

قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔

خانقاہوں کی طرف عوام کا رجوع اور دولت کے بہاؤ نے اخلاقی جرائم کو جنم دیا۔ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئے اور اعترافِ گناہ کی رسم بدکرداری کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ قرونِ متوسّط کے مصنّفین کی کتابوں میں اس قسم کی شکایات کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے خلاف جو بھی نظام قائم کیا جائے، بظاہر وہ کتنا ہی خوشنما معلوم کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن اسے ضرور شکست ہوتی ہے۔ یہی حال مسیحیت میں اس خانقاہی نظام کا ہوا جس کی عمارت خدائی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر خود ساختہ تزکیۂ نفس کے اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔

اسلام آیا تو اس نے اپنے ماننے والوں کو رہبانیت سے منع کر دیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے لَا رُھبَانِیَۃَ فِی الاِسلام اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ اسلام دین و دنیا کی تفریق کا قائل نہیں اس کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا عبادت ہے۔ ہر وہ کام جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے مطابق کیا جائے وہ کارِ ثواب اور عبادت ہے۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دنیاوی کیوں نہ نظر آتا ہو۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ انہوں نے ہمیشہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت اور ارشادات کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوتا تھا۔ وہ جہاں بھی ہوتے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے تھے لیکن جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو اس تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی میں بھی تبدیلی آگئی۔ بادشاہت کے آغاز میں بادشاہ بھی کتاب و سنّت کے مطابق احکام جاری کرتے رہے لیکن بعد میں جب دوسری عجمی سلطنتوں سے تعلقات

بڑھے تو مسلمان بادشاہ بھی مطلق العنان بن گئے۔ ان کے نزدیک اب وہ کتاب وسنّت کی روح کارفرمانہ رہی جو ابتدائی دور کے مسلمان سربراہوں کے احکام میں موجود تھی۔ پہلے مسلمانوں کا امیر یا خلیفہ بیک وقت عالم فقیہہ اور امام بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں جو عمّال مقرّر ہوتے تھے وہ بھی ان صفات کے حامل ہوتے تھے اس لئے حکومت کے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں کو اپنی زندگیاں اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اپنے طور پر کسی الگ رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ مسلمانوں کے خلیفہ اقتدار کو ایک مقدس امانت سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے حاکم کم اور خادم زیادہ ہوتے تھے۔ ان کے احکام میں ان کی ذاتی اغراض کا قطعاً کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کر کے وہ مومنانہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن بادشاہوں نے مطلق العنانی اختیار کر لی، معاشرے میں حقیقی اسلامی روح کارفرمانہ رہی تو لوگوں کو اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنے کے لئے الگ رہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ وہ ایسے صاحب علم ونظر بزرگوں کے پاس رہنمائی کے لئے حاضر ہوتے جن کا زہد وتقویٰ مسلّم تھا۔ اس طرح سرکاری انتظامات سے بالکل الگ درس وتدریس اور تزکیۂ نفس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری صدی ہجری میں صوفی ابو ہاشم نے اس مقصد کے لئے فلسطین میں رملہ کے مقام پر باقاعدہ ایک خانقاہ تعمیر کی جو ایک زردشتی آتش پرست امیر کی فیاضی کا نتیجہ تھی۔ اس خانقاہ کی تعمیر کے بعد عیسائیوں کی طرح مزید خانقاہیں تعمیر کرنے کا سلسلہ تو شروع نہ ہوا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مروّجہ شرعی علوم کے متوازی ایک الگ سلسلۂ تعلیم شروع ہو گیا جسے تصوّف یا علمِ باطن کا نام دیا گیا۔ بقول مولانا جامی ذوالنون مصری نے تیسری صدی ہجری میں علمِ تصوّف کے اسرار کو مدوّن کیا اور آدابِ صوفیاء وضع کئے۔

اسی دوران تصوّف نے فلسفے کی طرف قدم بڑھایا اور رضائے الٰہی کی بجائے الوہیّت ہی کو اپنی منزل قرار دے کر عارف و معروف ایک ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعیف الاعتقاد لوگوں نے صوفیا کو الوہی صفات کا حامل قرار دے دیا۔ ان صوفیا کی طرف بعض لوگ تو واقعی رشد و ہدایت کی غرض سے آتے تھے لیکن بعض اپنی دنیوی اغراض کے لئے بھی رجوع کرنے لگے۔

چوتھی صدی ہجری میں بوعلی سینا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روحیں دنیا میں انسانوں کے کام آتی ہیں، اور ان کی مدد کرتی ہیں ۔ اس نظریے کی اشاعت نے لوگوں کا رجوع مزارات کی طرف کر دیا۔ چنانچہ دنیا میں وہ جن بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے وفات کے بعد ان کے مزارات پر حاضری کو نہ صرف سعادت سمجھنے لگے بلکہ حلِّ مشکلات کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔

مزارات کی طرف لوگوں کے رجوع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں ہی کے ایک فرقے نے مشہدِ حسینؓ اور بعض دیگر مزارات کو اس قدر اہمیت دی کہ ان کی زیارت کو حج کے مساوی درجہ دے دیا، اور طرح طرح کی کرامات ان مزارات کی طرف منسوب کر دیں۔ اس کا اثر دوسرے مسلمانوں پر بھی پڑا۔ اور وہ بھی بزرگوں کے مزاروں پر حاضری کو حلِّ مشکلات کا ذریعہ سمجھنے لگے۔

برصغیرِ پاک و ہند میں بعض بزرگوں نے اپنی چلّہ کشی اور ریاضت کے لئے اولیائے کرام کے مزارات کے قریب کسی جگہ کا انتخاب کیا جس سے اس نظریے کو اور بھی تقویت ملی کہ مزاروں پر حاضری دینے سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ حالانکہ ان کا مقصد ان اولیا کی تعلیم سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان سے کچھ حاصل کرنے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کی تعلیمات پر عمل کرنے سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لوگوں نے اس کی غلط تاویل

کر کے کچھ اور ہی مفہوم اخذ کر لیا اور مزاروں پر اپنی مشکلات کے حل کے لئے حاضری دینے لگے۔ یہ کام بڑا آسان تھا۔ اس لئے آرام طلب طبیعتوں کو اس میں سکون معلوم ہوا اور لوگ ان کی طرف مائل ہونے لگے۔ حالانکہ اسلام میں زیارتِ قبور کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کی جائے، موت کو یاد رکھا جائے یا انہیں ایصالِ ثواب کر کے ان کی مغفرت یا بلندیٔ درجات کی دعا کی جائے۔

دنیا میں جہاں مسلمان تاجروں اور مجاہدوں کے ذریعے دین کی شمع روشن ہوئی وہاں اولیائے کرام نے بھی اسے وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوتی تھی کہ جو لوگ خلوصِ نیّت سے رشد و ہدایت کی خاطر ان کی طرف رجوع کرتے ان کی کایا کلپ ہو جاتی اور وہ راست باز مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے لگتے۔ ان بزرگوں نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا، اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے اور شرک سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کبھی اپنی بندگی کا درس نہیں دیا۔ نہ کبھی یہ کہا کہ جو کچھ طلب کرنا ہو ہم سے طلب کرو۔ اور جب ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں تو اس مقصد کے لئے ہمارے مزاروں پر حاضری دینا۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ ان بزرگوں سے پوچھے گا کہ تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود ہی راہِ راست سے بھٹک گئے۔ وہ عرض کریں گے "پاک ہے آپ کی ذات۔ ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو مولا بنائیں مگر آپ نے انکو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا۔ حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو گئے"

انیسویں صدی عیسوی میں جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے تسلّط کو مضبوط کر لیا تو آہستہ آہستہ انہوں نے مختلف ریاستوں کو کسی نہ کسی بہانے اپنی حکومت میں جذب کرنا شروع کر دیا۔ ریاستوں کے نوابوں، جاگیرداروں اور راجاؤں نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا۔ انہیں اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی گذشتہ عیش کوشی کی زندگی کو ایک عرصہ تک

طول دینے کے لیے مختلف تدبیریں کیں جن میں ایک یہ تھی کہ بعض مزاروں کے نام وسیع قطعاتِ اراضی وقف کر دیئے اور کسی نہ کسی ذریعے سے ان اوقاف کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھا۔ اس طرح مزارات پر گدی نشینی کی رسم کو استحکام نصیب ہوا۔ ان مزارات پر جو بھی ایک بار گدّی نشین ہو گیا اس نے اسے موروثی بنا لیا قطع نظر اس بات کے کہ اس میں کوئی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ خانقاہ اور مزار لازم و ملزوم ہو گئے اور اس بات کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا کہ جو لوگ ان خانقاہوں پر براجمان ہیں، وہ لوگوں کی رہنمائی اور تعلیم کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ ان مزارات پر نذر و نیاز کی آمدنی کو دیکھ جس کو بھی موقع ملا وہ کسی مزار پر گدّی نشین ہو کر خانقاہ کا انچارج بن بیٹھا، اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس طرح شاہینوں کے نشیمن زاغوں کے تصرّف میں آتے چلے گئے۔

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں برصغیر ہند و پاک کے معروف عالم دین جناب احمد رضا بریلوی نے بزرگانِ دین سے استمداد کے متعلق مروّجہ رسوم و عقائد کو مدوّن کیا اور مختلف تاویلات کے ذریعے انہیں کتاب و سنّت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ان کے نام کی نسبت سے بریلوی مکتبِ فکر کی داغ بیل پڑی بلکہ خانقاہی نظام کو بھی زبردست تقویت حاصل ہوئی۔

علاّمہ اقبال کسی مزار پر مجاور یا گدّی نشین بن کر مزار کی آمدنی پر گذر اوقات کرنے کو انسانی شرف کے منافی خیال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

مریدے خود شناسے پختہ کارے — بہ پیرے گفت حرفے نیش دارے
بمرگِ ناتمامے جاں سپردن — گرفتن روزی از خاکِ مزارے

ایک خوددار اور بالغ نظر مرید نے اپنے پیر سے ایک تلخ بات کہی کہ خاکِ مزار سے روزی حاصل کرنا اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

جو دولت بغیر محنت کے ہاتھ آئے اسے محنت سے کمائی ہوئی دولت کی نسبت

فضول خرچیوں اور عیش و مسرت میں اڑانا آسان ہوتا ہے۔ چنانچہ گدّی نشینوں نے مزاروں سے حاصل شدہ آمدنی سے خوب عیش کی زندگی بسر کی۔ ان میں سے بعض کی زندگی میں مسلمان کی زندگی کی ایک رمق بھی نظر نہ آتی تھی لیکن ضعیف الاعتقاد لوگوں کے دلوں میں مزارات پر حلِّ مشکلات کے لئے حاضری کا عقیدہ اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مزاروں پر دیئے جانے والے نذرانے ناجائز کاموں میں صرف ہوتے ہیں، ان سے غریبوں مسکینوں کو کم ملتا ہے اور گدّی نشینوں کے عیش کا سامان زیادہ ہوتا ہے برابر اسے ثواب سمجھ کر نذرانے پیش کرتے رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بے شک گدّی نشینوں میں برائیاں ہیں لیکن جن کے قدموں میں وہ رہ رہے ہیں وہ تو خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ اس طرح خانقاہی نظام محکم سے محکم تر ہوتا چلا گیا۔

برصغیر میں ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کے استھانوں پر سال میں ایک بار میلہ لگاتے تھے جو ان کے مذہبی تہوار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس موقع پر وہ خاص طور پر نذریں چڑھاتے، منّتیں مانتے اور بعض دوسری رسوم ادا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ میل جول کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی بزرگوں کے مزارات پر سال میں ایک مرتبہ میلہ لگانا شروع کر دیا۔ ان میلوں میں کھیل تماشوں اور دیگر خرافات کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے لگا جو عام میلوں ٹھیلوں میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض میلوں میں رقاصاؤں کے باقاعدہ مجرے ہونے لگے۔ معروف اولیاء اللہ میں سے کسی کے متعلق بھی یہ ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنے کسی پیش رو کی قبر پر میلہ لگایا ہو۔ لیکن ان کے سجّادہ نشینوں بقول اقبال جھوٹے صوفیا نے یہ کام بھی شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ حرم شریف کے آداب کی طرح مزارات کے متعلق کچھ آداب مقرر کر کے انہیں میلوں کے دنوں میں باقاعدگی سے سرانجام دیا جانے لگا اور ان کا نام عرس رکھ دیا گیا۔ ان عروس میں سے بعض ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں ایک ولی اللہ کی تو پرستش کی جاتی ہے اور اس سے ملحقہ قبرستان میں سینکڑوں گمنام اور نامعلوم اولیاء اللہ کی قبریں پاؤں تلے روندی

جاتی ہیں ۔ حالانکہ کسی قبر پر مجاور بن کر بیٹھنے ، اس کے ساتھ ٹیک لگانے یا اس کے اوپر بیٹھنے کی سخت ممانعت ہے ۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص آگ کی چنگاری پر بیٹھے اور وہ اس کے کپڑوں کو جلا کر اس کے جسم تک پہنچ جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ کسی قبر پر بیٹھے ۔

عوام الناس کے مزاروں پر نذریں نیازیں چڑھانے اور عرس کو کارِ ثواب سمجھنے کے عقیدے میں کسی معیار کو پیشِ نظر نہ رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّار اور ہوشیار قسم کے لوگوں کو یہ موقع ہاتھ آگیا کہ وہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا کاروبار چمکائیں اور جس قبر والے کو چاہیں ولی اللہ بنا دیں ۔ چنانچہ ایسے لوگوں نے عوام کے اس رجحان سے خوب فائدہ اٹھایا اور جس قبر کے متعلق چاہا جھوٹے افسانے گھڑ کر ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اس کی طرف مائل کر دیا ۔ اس سلسلے میں معروف اولیاء اللہ کے مزارات کے علاوہ جن مزارات کی طرف لوگوں کو رجوع کرتے دیکھا گیا ہے ان میں سے چند ایک کا حال ملاحظہ ہو

ایک گاؤں میں ایک مقبرہ ہے ۔ لوگ اس پر نذریں نیازیں چڑھاتے اور اس کے نام کی منّتیں مانتے ہیں ۔ لوگوں سے دریافت کیا گیا کہ اس مقبرے میں کون سے ولی اللہ مدفون ہیں ۔ جواب ملا "اس میں کوئی بھی دفن نہیں" ۔ بات یہ ہے کہ یہاں ایک شخص کو خواب میں ایک بزرگ ملے تھے ۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ یہاں میرا مقبرہ تعمیر کرو ۔ یہ مقبرہ اس خواب کی عملی تعبیر ہے ۔

ا ایک گاؤں میں ایک مشہور بزرگ کا مزار ہے ۔ ہر سال عرس ہوتا ہے اور ہزاروں عقیدتمند دور دور سے آتے ہیں ۔ ابھی تک اس بزرگ کے کئی ہم عصر زندہ ہیں ۔ اس کے متعلق اس کے ہمعصر بزرگوں سے دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ ایک ہندو تاجر تھا ۔ جوئے کے کاروبار میں بہت بڑے خسارے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھا ۔ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا ۔ لوگ ترس کھا کر کچھ نہ کچھ کھانے کو دے جاتے ۔ اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں

آنے کی وجہ سے اس کے اردگرد بیکار اور مفت خورے جمع ہو گئے اور اس کی کرامتیں مشہور کرنا شروع کر دیں۔ لوگ اس سے کوئی بات پوچھتے تو وہ ہوں ہاں کر دیتا۔ اس کے آس پاس بیٹھنے والے کہہ دیتے، جاؤ باباجی نے کہہ دیا ہے تمہارا کام ہو جائے گا۔ اس طرح کسی کا کام ہو جاتا تو وہ زیادہ نذر نیاز لے کر باباجی کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ یوں اس کے پاس لوگوں کا آنا جانا ہو گیا۔ جب وہ مرا تو اسے قریبی گاؤں میں دفن کر کے مزار تعمیر کر دیا گیا۔ اس کے نام "گلزاری لال" سے "ی اور لال" کا نقطہ ہٹا کر آخر میں شاہ اور شروع میں بابا لگا کر اولیاء اللہ کی صف میں شامل کر دیا گیا۔ وہ آخری دم تک ایمان کی دولت سے محروم رہا۔ لیکن آج شیخ پورہ تحصیل و ضلع قصور میں اس کا مزار مرجعِ خاص و عام ہے۔

ماضی بعید کو چھوڑیئے، ماضی قریب کے ایک بزرگ کا حال سنیئے: چند سال پہلے تک اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ لیکن آج اس کے مزار پر جو عرس ہوتا ہے اس کے مقابلے میں حقیقی اولیاء اللہ کے عرس بھی معمولی نظر آتے ہیں۔ اس بزرگ کو جاننے والے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگ اب بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ صاحب ایک فقیر تھے۔ جنہوں نے کتے رکھے ہوئے تھے۔ کتوں سے پیار کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ جس بستر میں خود استراحت فرماتے اسی میں کتے پڑے رہتے۔ جس برتن میں کتے کھاتے اس میں انہیں کھانے میں قطعاً عار نہ تھی جو کچھ مانگ کر لاتے یا خود لوگ انہیں دے جاتے، سب کتوں کے کام آتا۔ شعائرِ اسلامی کے پابند نہ تھے۔ صفائی اور طہارت کا بھی زیادہ خیال نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ تو اسلام کی تبلیغ کی نہ ان کے دستِ مبارک پر کوئی کافر مسلمان ہوا۔ نہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا اور نہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے کسی مسلمان کی زندگی میں مثبت تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ حضرت فوت ہوئے تو ان کی قبر پر عالیشان مقبرہ تعمیر کر دیا گیا۔ اب لوگ انہیں "کُتیاں والی سرکار" کہتے ہیں۔ پتوکی ضلع قصور میں ان کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے اور ہزاروں عقیدت مند نذر و نیاز پیش کرتے اور مزار

پر ہر سال چادریں چڑھاتے ہیں۔ اس مزار کے ارد گرد رہنے والے بندگانِ خدا بے شک نانِ شبینہ کو ترستے رہیں لیکن یہاں رہنے والے کتّوں کی تواضع حلوا پوری اور جلیبیوں سے ہوتی ہے۔

یہ ایک محدود سے علاقے کے صرف چند مزارات کے کوائف ہیں۔ اگر وسیع پیمانے پر مزارات کا ایک تحقیقی سروے کیا جائے تو نا معلوم کیسے کیسے انکشافات ہوں۔

مزاروں پر دولت کی ریل پیل اور عورتوں اور مردوں کی بلا روک ٹوک آمد و رفت نے اخلاقی جرائم کو جنم دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض مزارات سے ملحقہ حجرے منشیات کے کاروبار اور بدکاری کے اڈے بن گئے۔ چنانچہ ایوبی دور میں حکومتِ پاکستان نے بڑے بڑے مزارات پر قبضہ کر کے محکمہ اوقاف کی تحویل میں دے دیا۔ بعض ممالک میں یہ پہلے ہی سے حکومت کی تحویل میں تھے۔ اس کارروائی سے کئی برائیوں میں کمی آگئی، لیکن قبر پرستی اور نذر و نیاز پیش کرنے کے عمل میں کسی قسم کا فرق واقع نہ ہوا۔ حکومت نے ان مزارات پر "اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں" کے مفہوم کی تختی آویزاں کر کے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی ہے۔

آہستہ آہستہ مزاروں سے متعلق افعال و اعمال دین کا حصّہ بنتے چلے گئے۔ ان پر نذریں نیازیں دینے، چادریں چڑھانے اور انہیں غسل دینے کو دین سمجھ لیا گیا۔ اس طرح یہ نظام دن بدن بارونق ہوتا چلا گیا۔ مسلمانوں کی توجہ اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئی، اسلامی آئین اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں اس کی بالادستی قائم کرنے کے لئے جہاد کا جذبہ ختم ہو گیا۔ بزرگوں کے ساتھ خالی عقیدت و محبّت کو نجات کے لئے کافی سمجھ لیا گیا۔ کسی بزرگ کے مزار پر کسی خاص دروازے سے گزرنے کو جنّت تک پہنچنے کا راستہ تصوّر کر لیا گیا۔

اسلام مردِ مومن میں امانت و دیانت، حق گوئی و بے باکی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، فقر و استغنا اور عزّتِ نفس ایسی جن صفات کے ذریعے اس کے کردار کی تشکیل کرتا ہے

دہ کم سے کم ہوتی چلی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں عزم وہمت اور شان وشوکت کے ساتھ غالب قوم کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا ارمان باقی نہ رہا۔ اسی لئے علامہ اقبال اس نظام کو پسند نہیں کرتے اور فرماتے ہیں ؎

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

ان عروس سے ایک زبردست ملی نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مرکزیت جو اسلام نے بیت الحرام کے طواف کے ذریعے پیدا کی تھی، ختم ہوگئی اور امتِ مسلمہ سینکڑوں گروہوں میں بٹ گئی۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

"ان لوگوں نے عرس کو حج تصوّر کر لیا اور اس طرح حرمین کے حقوق تلف کر کے چھوٹی چھوٹی جماعتیں حلقۂ اسلام کے اندر بنالی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جمعیتِ حلقۂ اسلامیہ اپنی اصلی صورت میں قائم نہیں رہی۔"

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کیلئے دو حرم مقرر ہیں۔ ایک حرم مکہ جہاں بیت اللہ ہے اور دوسرا حرم مدینہ جہاں مسجد نبوی اور روضۂ اقدس ہے۔ ان حرمین کے کچھ آداب ہیں جو انہیں کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً بیت اللہ کو غسل دینا، اس پر غلاف چڑھانا، اس کے گرد طواف کرنا، اس کے دروازے کے ساتھ چمٹ کر دعائیں مانگنا، اس کے قریب کے پانی کو مقدّس اور متبرک سمجھنا، اس کے آس پاس کے درختوں کو نہ کاٹنا، اس کی حدود میں شکار نہ کرنا۔ اسی طرح مسجدِ نبوی، روضۂ اقدس اور اس کے آس پاس کی سرزمین جو حدودِ حرم میں داخل ہے کے بھی کچھ آداب ہیں جو انہیں کے لئے مخصوص ہیں۔ اب مسلمانوں نے یہ سارے کام مزارات کے لئے بھی انجام دینے شروع کر دیئے ہیں۔ مثلاً مزاروں کو غسل دیتے ہیں، چادریں چڑھاتے ہیں، ان سے چمٹ کر دعائیں مانگتے ہیں، ان کے قریب کے پانی کو مقدّس اور متبرک سمجھتے ہیں، اس کے قریب

کے درختوں کی شاخیں نہیں کاٹتے اور ارد گرد کے ماحول کا حرم کی طرح ادب و احترام کرتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ سارے کام حریفین شریفین کے ساتھ ناانصافی اور ان کی حق تلفی کے مترادف ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

اے کہ بر بیت الحرم بیداد کرد — اے کہ مسلم را حجے ایجاد کرد
عرس را از حج گراں پائی شمرد — تا حق بطحا و یثرب ہم ببرد
حکمتِ ایں سادہ و آساں گزار — حلقۂ را داد مرکز صد ہزار
از میانِ حلقۂ صد حلقہ رست — نقش دورِ ما ہجوم نقطہ شُست[1]

اے (عرس جاری کرنے والے) تو نے بیت الحرام کے ساتھ ناانصافی کی اور مسلمانوں کے لئے ایک حج ایجاد کر دیا۔ عرس کو حج سے بھی زیادہ افضل سمجھا۔ اور اس طرح مکہ اور مدینہ کا حق چھین لیا۔ اس سادہ اور سہل تدبیر نے ملتِ اسلامیہ کو ہزاروں مرکزوں میں تقسیم کر دیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) ایک حلقے سے سینکڑوں حلقے پیدا ہوئے اور ہمارے دائرے کے نقوش نقطوں کی کثرت نے مٹا دیئے۔ یعنی ان عرسوں کی وجہ سے ہماری مرکزیت ختم ہو گئی۔

اسلام ایک ایسا نظامِ عدل ہے جس میں اونچ نیچ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے قوانین جس طرح ایک فقیر کے لئے ضروری ہیں اسی طرح ایک بادشاہ کے لئے بھی ان پر عمل کرنا فرض ہے۔ اسلام میں نہ تو کوئی شخص خود کسی کا غلام ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی غلام ہوتا ہے۔ مومن کے لئے کسی شخص کے کسی ایسے حکم کی تعمیل جائز نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی نافرمانی ہوتی ہو۔ اسلام انسان کے دل سے مال و زر کی محبت نکال کر خدا کی محبت پیدا کرتا ہے۔ مسلمان اپنے مال و دولت کو خدا

---

[1] مکاتیبِ اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی

کی مقدّس امانت سمجھ کر اس کے احکام کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اسلام دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف رکھتا ہے۔ اس میں نہ تو رشوت کا پیسہ جمع ہوتا ہے نہ سود کی رقم شامل ہوتی ہے نہ دھوکے اور فریب کے ذریعے کسی کا حق مارا ہوتا ہے۔ نہ ملاوٹ کے ذریعے مال کمایا گیا ہوتا ہے۔ الغرض مسلمان کا مال ہر لحاظ سے پاک ہوتا ہے۔ صاحبِ مال اس میں سے زکوٰۃ نکالنے کے علاوہ بھی غریبوں مسکینوں پر خرچ کرتا رہتا ہے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور اس کا مال ہر آلودگی سے پاک رہے۔ اسلام کے نزدیک زمین بادشاہوں کی نہیں کہ جس طرح چاہیں اپنے خزانے بھرتے رہیں بلکہ اس کا حقیقی مالک اللہ تعالےٰ ہے اور اس کے احکام کے مطابق ہی اس کا انتظام چلایا جا سکتا ہے۔ زمین ہی کیا کائنات کی ہر شے کا حقیقی مالک خدا ہے، انسان تو محض امین ہے اور جو شخص امانت کو اس کے مالک کے حکم کے بغیر اپنے تصرّف میں لاتا ہے وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مردوں کو عورتوں کی عزّت و ناموس کا محافظ قرار دیتا ہے، اسے بے حجاب کر کے شمعِ انجمن بنانے کی بجائے چراغِ خانہ بنا کر اس کی عزّت و توقیر میں اضافہ کرتا ہے۔ اسلام میں عورت اسلامی برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے قابلِ تحریم ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے عورت کی عزّت و ناموس کی خاطر کئی جنگیں لڑیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں مدینے کے ایک بازار میں ایک مسلمان عورت یہودیوں کے نرغے میں آ جاتی ہے۔ وہ اسے مذاق کرتے اور چھیڑتے ہیں، اور وہ عورت آواز دیتی ہے کہ کیا یہاں کوئی غیرت مند مسلمان نہیں ہے کہ میں یوں مدینے کے اندر سرِ بازار رسوا کی جا رہی ہوں۔ ایک راہ گیر مسلمان اس آواز کو سنتا ہے اور تلوار سونت کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہودیوں سے بات کرتا ہے تو وہ اسے بھی تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر خیریت چاہتے ہو تو گھر کی راہ لو اور ہمارے معاملے میں دخل نہ دو۔ مسلمان کہتا ہے کہ ہمارا دین عورتوں

کی عزّت و حرمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے اس عورت کی عزّت مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ یہ کہہ کر وہ اس نوجوان عورت کو چلنے جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ عورت چلنے لگتی ہے تو ایک یہودی اسے لپک کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسلمان مزاحمت کرتا ہے تو یہودی جمع ہو کر اس تنہا مسلمان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مسلمان بیسیوں یہودیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ لیکن عورت اپنی عزّت بچا کر جا چکی ہوتی ہے۔

پہلی صدی کے اواخر میں لنکا سے ایک بحری جہاز روانہ ہوتا ہے۔ اس میں مسلمان تاجروں کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ دیبل کے قریب بحری قزاق اس جہاز کا سامان لوٹ لیتے ہیں اور عورتوں کو قیدی بنا لیتے ہیں۔ جب حجّاج بن یوسف ثقفی کو اس واقعے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ دیبل کے حکمران کو اس نقصان کی تلافی کے لئے تحریر کرتا ہے۔ راجہ داہر جواب دیتا ہے کہ یہ بحری قزاق میری قلمرو سے باہر ہیں۔ حجاج بن یوسف محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجتا ہے دیبل اور سندھ کا علاقہ فتح ہو جاتا ہے اور بحری قزاقوں کے ساتھ ساتھ ان کے ظالم سرپرستوں کا بھی قلع قمع ہو جاتا ہے۔

اندلس میں ایک امیر آدمی کی لڑکی اس زمانے کے رواج کے مطابق بادشاہ کے گھر تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ بادشاہ اس لڑکی کی عزّت پر حملہ کرتا ہے۔ امیر آدمی اپنے آپ کو بادشاہ کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے اور افریقہ پہنچ کر مسلمان حاکم کو اس ظلم کی اطلاع دیتا ہے، اور اس قسم کے مظالم سے اندلس کے لوگوں کو نجات دلانے کے لئے فریاد کرتا ہے۔ پہلی صدی کے آخر میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ ہوتا ہے اور اندلس فتح ہو جاتا ہے۔ مسلمان وہاں صدیوں تک عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔

تیسری صدی ہجری کا واقعہ ہے روم میں ایک سپاہی ایک برھمیا کو ایک تھپڑ رسید کرتا ہے۔ برھمیا کہتی ہے کہ اگر آج یہ علاقہ مسلمان خلیفہ کے زیرِ تسلّط ہوتا تو مجھ پر یہ ظلم نہ ہوتا۔ سپاہی ایک اور تھپڑ رسید کر کے کہتا ہے "جا، مسلمان خلیفہ سے کہو کہ ابلق گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے۔

اور تمہاری مدد کرے۔ بغداد میں عباسی خلیفہ معتصم باللہ تک یہ بات پہنچتی ہے تو وہ ملک بھر سے ابلق گھوڑے اکٹھے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ابلق گھوڑے اکٹھے کر کے روم پر حملہ کیا جاتا ہے، روم فتح ہو جاتا ہے، اس بڑھیا اور سپاہی کو تلاش کیا جاتا ہے۔ سپاہی کو اس کے کئے کی سزا دی جاتی ہے اور مسلمان خلیفہ خود اس بڑھیا کو بلا کر کہتا ہے کہ دیکھو میں ابلق گھوڑوں پر سوار ہو کر تمہاری مدد کو پہنچ گیا ہوں۔ یہ چند واقعات ہیں ورنہ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ مسلمانوں نے عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

اسلام مسلمانوں کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ ان میں صبر و تحمل، عزم و ہمت اور راست بازی کی اعلیٰ صفات پیدا ہو جاتی ہیں، پھر وہ جہاد کے ذریعے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے ان کی مردانگی کے جوہر کھلتے ہیں۔ اسلام کی اس قسم کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں بڑے بڑے بہادر مردِ میدان پیدا ہوئے۔ ایسے بہادر کہ جو بھی ان کی تلوار کے سامنے آیا دو ٹکڑے ہو گیا۔ حضرت علیؓ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت ابو عبیدہؓ اور دوسرے صحابہؓ کے علاوہ، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور دیگر ایسے نامور سپہ سالار پیدا ہوئے کہ تاریخ ان کے مقابلے کی کوئی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام مسلمان کو زندگی کی حقیقتوں سے فرار کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کا گہری نظر سے جائزہ لیتا رہے اور جہاں بھی خرابی دیکھے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ دین اسلام کی حقیقت احتسابِ کائنات ہے۔ مومن دنیا کے معاملات سے لاتعلق ہو کر زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ دنیا کے نظام کو اسلام کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ معیشت، معاشرت، حکومت، تہذیب و تمدن غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کرتا ہے اور ظلم و جور کو مٹا کر نظامِ عدل قائم کرتا ہے۔

مسلمان لایعنی مباحث میں الجھنے کی بجائے اپنے علم کے مطابق عمل پر توجہ دیتا ہے۔ وہ گفتار کی بجائے کردار کا غازی ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اصل قوّت اس کے کردار میں مخفی ہوتی ہے۔ مفاد پرست، خوشامدی، چند چھنکتے ہوئے سکوں کے بدلے بک جانے والے، صداقت دامانت سے عاری انسان مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہوتے ہیں۔ طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حق پرست، خدا و رسول کے فرمانبردار، صادق اور امین، پاکیزہ اور نچتہ سیرت و کردار کے مالک ہوں۔

علامہ اقبال نے ایک تمثیل کے ذریعے اسلام کی حقیقت بیان کر کے مسلمانوں کی اصل قوّت کا راز بتایا ہے اور پھر انہیں کمزور کرنے والے عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ وہ تمثیل یوں ہے کہ ابلیس ایک مجلسِ مشاورت منعقد کرتا ہے جس میں اس کے مشیر شرکت کرتے ہیں۔ مشیر اپنی اپنی کارکردگی بیان کرتے ہیں۔ اپنے آقا کے قائم کئے ہوئے نظام کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ مستقبل کے ان خطرات کا ذکر کرتے ہیں جو ابلیسی نظام کی چولوں کو ڈھیلا کر سکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس نظام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے۔ کوئی کہتا ہے مزدکیّت سے خطرہ ہے کوئی کہتا ہے جمہوریت سے خطرہ ہے۔ ایک کہتا ہے اسلام سے خطرہ ہے۔ دوسرا کہتا ہے خطرے کی کوئی بات نہیں ؎

ہے طوافِ حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

ابلیس سب کے مشوروں کو بغور سن کر تبصرہ کرتا ہے اور اس نظام کو محکم کرنے کے لئے انہیں ایک منصوبہ تیار کر کے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کا اب قرآن پر عمل نہیں رہا۔ یہ لوگ بھی سرمایہ داری میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے مغربی پیشواؤں کے پاس بلندیٔ سیرت و کردار کی وہ شمع نہیں ہے جس سے وہ مشرق کی تاریکیوں کو منوّر کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے قائم کردہ نظام

کو اگر خطرہ ہے تو وہ اسلام سے ہے کیونکہ امتِ مسلمہ میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے نصب العین کو اپنے سینوں میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے عہدِ حاضر کے تقاضوں سے یہ خوف ہے کہ حضورؐ کی شریعت ظاہر نہ ہو جائے۔ اور مومن اس پر عمل کرنا شروع نہ کر دیں۔ خدا کی پناہ! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار خدا کی پناہ! یہ ایک ایسا آئین ہے جو عورتوں کی عزت کا محافظ ہے۔ یہ مردِ مجاہد پیدا کرتا ہے اور انہیں مردانگی کے جوہر سے آراستہ کرتا ہے یہ ہر قسم کی غلامی کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اس میں نہ تو کوئی بادشاہ ہوتا ہے اور نہ راستے میں بیٹھنے والا فقیر۔ اس کے تحت سب کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دولت کو ہر نجاست سے پاک کرتا ہے۔ امیروں کو دولت کا امین بناتا ہے۔ اس سے بڑھ کر فکر و عمل کا اور کیا انقلاب ہوگا کہ اس آئین کے تحت زمین بادشاہ کی نہیں بلکہ خدا کی ملکیت ہوتی ہے۔ یہ آئین دنیا کی نظروں سے اوجھل رہے تو بہتر ہے۔ ہمارے لئے اس وقت یہی غنیمت ہے کہ مومن خود یقین کی دولت سے محروم ہے۔ اس کے لئے ابلیس اپنے مشیروں کو کام کرنے کے لئے ایک لائحہ عمل تجویز کرتا ہے۔ وہ یہ کہ مومن کو ذاتِ باری تعالےٰ کے متعلق موشگافیوں اور قرآن پاک کی آیات کی مختلف تاویلیں کرنے میں الجھائے رکھو۔ عیسیٰ علیہ السلام مر گئے یا زندہ ہیں! اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے جدا ہیں یا عین ذات ہیں؟ قرآن پاک کے الفاظ قدیم ہیں یا کسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں وضع کیا ہے؟ ان میں سے مسلمانوں کی نجات کس عقیدے میں ہے؟ اسے پختہ کردار کا مالک نہ بننے دو تاکہ یہ زندگی کے ہر میدان میں شکست کھائے۔ آخر میں وہ اپنے لائحہ عمل کا جو لبِ لباب پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان کو خانقاہی نظام میں پختہ کر کے دنیا سے الگ تھلگ رکھو۔ یہ اس فانی دنیا پر حکومت کا کام دوسروں کے لئے چھوڑ کر خود زندگی کے معاملات سے دستبردار ہو جائے گا اس کیلئے ایسا ہی تصوف بہتر ہے۔

ابلیس !

جانتا ہوں میں یہ امّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر!
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے!
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب،
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر "الٰہیات" میں الجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے ---
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

ابلیس کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہوا۔ چنانچہ اس وقت خانقاہوں کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے فن سے ناآشنا ہیں اگر کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو تعلیم و تربیت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں تو ان کی تعلیم زبانی ذکر اذکار اور تسبیح و مناجات تک محدود ہوتی ہے۔ اس نظام کا بیشتر حصہ شخصیت پرستی اور قبر پرستی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اب خانقاہوں سے باطل کے ساتھ معرکہ آرائی کا سبق نہیں ملتا بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینے اور خود اپنے حال میں مست رہنے کا درس ملتا ہے۔ حالانکہ انقلاب صرف دعاؤں سے برپا نہیں

ہوتے۔ بے معرکہ جینے کی تلافی مناجاتِ سحر سے ممکن نہیں۔اس کے لئے نظم و ضبط، پختہ کردار اور آئین کی پابندی کی ضرورت ہے۔ مسلسل جہاد، مقصد سے لگن، جفاکشی اور ہر میدان میں باطل قوتوں کا مقابلہ کر کے ہی اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ دنیا پر حکمرانی کا خواب زبانی جمع خرچ سے شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔اس کے لئے عمل کی ضرورت ہے۔ بے عملی اور جمود کی زندگی سے برائیوں کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ ایسا کرنے کے لئے عصائے کلیمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو کم تر سمجھنے والے کبھی غالب نہیں ہوتے۔ اس احساس کو ختم کر کے ہی خودی کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ پستیوں پر نظر رکھنے والے بلند منزلوں کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس مقصد کے لئے شاہینی صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ باطل کے خس و خاشاک کو جلانے کے لئے شعلۂ سوزاں درکار ہوتا ہے۔ حرکت اور حرارت سے ہی زندگی کے میدان میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ جمود کی کیفیت تو ناکامیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے ؎

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

اصل تعلیم و تربیت وہی ہے جس سے انسان میں وہ صفات پیدا ہو جائیں جو زندگی کی معرکہ آرائیوں میں مفید ثابت ہوں۔ اس کے دل میں عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کی طبیعت میں بلندی، نگاہ میں دور اندیشی اور پاکیزگی، دل میں حرارت اور سوز پیدا ہو جائے۔ دوسروں کی عیب جوئی کی بجائے ان سے محبت کا جذبہ بیدار ہو اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے۔ کوئی گمراہ ہو تو اسے صراطِ مستقیم پر گامزن کیا جائے، مظلوم کی مدد کی جائے۔ اپنے آپ میں مگن رہنے کا نام زندگی اور محبت نہیں ہے۔ صحیح تربیت

سے انسان کی نگاہ حق اور باطل، مستقیم اور کج، روشن اور تاریک، نیک و بد، خیر اور شر کو پہچاننے کے قابل ہوتی ہے۔ بعض اوقات نگاہ کی بے بصیرتی ہی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر تعلیم و تربیت سے نگاہ میں بلندی پیدا نہ ہو تو ایسی تعلیم بے کار ہے۔ نگاہ کے ساتھ ساتھ دل کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ جب نگاہ حق و باطل کو پہچاننے کے قابل ہو جاتی ہے تو دل بھی اللہ تعالےٰ کی معرفت سے منوّر ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ایسی تبدیلی آتی ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی کے علاوہ کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ہوش سنبھالنے کے بعد ابتدائے جوانی ہی میں اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل کر لی تو پھر ان کی پوری زندگی اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی میں بسر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر انہوں نے آگ میں پڑنا قبول کیا، اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت کی اور پھر اس کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ جس شخص کو اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے پھر اسے اس کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرنا، گھر بار چھوڑنا اور ہر طرح کی مشقّتیں برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جو مدرسہ یا تربیت گاہ انسان میں یہ خصوصیات پیدا نہ کرے، اس کی تعلیم و تربیت ناقص ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبّت نہ معرفت نہ نگاہ

جب روحانی تعلیم و تربیت کا انتظام مزاروں کے سجّادہ نشینوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مجاہد عالموں کے ہاتھ میں ہوتا تھا تو ان کی خانقاہوں کے تربیت یافتہ مجاہد اور بہادر شیر ہوتے تھے۔ وہ زمانے کے ساتھ چلنے کی بجائے زمانے کو اپنے ساتھ چلاتے تھے۔ وہ ہوا کا رُخ دیکھ کر نہیں چلتے تھے۔ بلکہ اپنی متعیّن منزل کی جانب گامزن رہتے تھے۔ اگر لوگ ترکستان کی طرف جا رہے ہوں تو وہ ان کا ساتھ دینے کی بجائے عازمِ کعبہ ہی رہتے تھے۔ وہ بہادر شیروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ دریاؤں کے رُخ پر

نہیں بہتے تھے ۔ بلکہ دریاؤں کو اپنے رُخ پر موڑتے تھے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ زمانے کا دستور ہی یہ ہے۔ ہم اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں ۔ وہ کبھی ملامت کرنے والوں کی ملامت سے خائف نہیں ہوتے تھے ۔ وہ خود صبغۃُ اللہ میں رنگے ہوتے تھے ۔ جہاں جاتے دوسروں پر بھی یہ رنگ چڑھا دیتے تھے ۔ وہ کبھی رسم و رواج کی پابندی نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ ہر وقت اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے تھے۔ مسلمان کی زندگی کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کو اس صراطِ مستقیم پر گامزن کر دے جو اللہ تعالےٰ نے اس کو عطا کیا ہے ۔ خواہ اسے کتنی ہی مخالفتوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اور کتنی ہی مال و جان کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے ۔ آج خانقاہوں کے تربیت یافتہ بھی زمانے کے رُخ پر چلے جا رہے ہیں ۔ چند وظیفے اور تسبیحات زبان سے ادا کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے روحانیت کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں ۔

مسلمان کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا مزاج ، اس کی طبیعت باقی انسانوں سے مختلف ہے ۔ اس نے اللہ کو اپنا رب مان کر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اب اس کی ساری زندگی اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں بسر ہو گی ۔ اب نہ وہ اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرے گا نہ کسی بادشاہ کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالے گا ، اور نہ کسی دوسرے حاکم کی اطاعت کرے گا ۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے ، نمازیں پڑھتا ہے ، روزے رکھتا ہے لیکن وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ حکومت کا نظام کس قانون کے تحت چل رہا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو حاکم ماننے کے دعوے میں جھوٹا ہے ۔ اگر وہ سچّا ہوتا تو ایک پل کے لئے بھی گوارا نہ کرتا کہ جس ذات کو اس نے اَحکمُ الحاکمین تسلیم کیا ہے ، اس کے احکام کو پس پُشت ڈال کر کوئی اپنا قانون چلائے اور وہ اسے راضی خوشی تسلیم کر لے ۔ مسلمان اگر اس قسم کے حالات سے دو چار ہو تو وہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے ، اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک وہ اللہ کے

دین کو غالب نہ کر دے ۔ اس کی زندگی ایک مسلمان کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی جب تک اقتدار اور حکومت کو اللہ تعالےٰ کے دستور کے تابع نہ کر دے ۔ مسلمان کی دنیا بالکل الگ ہوتی ہے ۔ ایک غیر مسلم کسی سے محبّت کرتا ہے تو اپنے نفس، اپنے مفاد یا قوم کے لئے۔ جنگ کرتا ہے تو ایسے ہی کسی مقصد کے لئے۔ اس کی تجارت، لین دین، تہذیب و تمدّن، معاشرت معیشت غرض کہ زندگی کے ہر معاملے میں یا تو اس کا ذاتی مفاد ہوگا یا کوئی اور غرض وابستہ ہوگی۔ لیکن ایک مسلمان خدا کی مرضی کے خلاف کسی مفاد کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ اس کا جینا مرنا خدا کے لئے ہوتا ہے، اس کی ساری صلاحیتیں، دل و دماغ کی ساری قابلیتیں اور جسم و جان کی ساری قوّتیں اللہ کی مرضی کے مطابق صرف ہوتی ہیں ۔ وہ اپنے نفس، خاندان برادری، سوسائٹی، حکومت غرض کہ ہر ایک کی بندگی کو چھوڑ کر صرف خدا کی بندگی اختیار کرتا ہے ۔ خدا اسے جس کام کا حکم دیتا ہے اس میں لگ جاتا ہے ، اور جس کام میں روکتا ہے، اس سے رک جاتا ہے ۔ جہاں وہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے وہاں خرچ کرتا ہے ، اور جہاں خرچ نہ کرنے کا حکم دیتا ہے وہاں سے رک جاتا ہے ۔ وہ ہر اس قوّت کا مقابلہ کرتا ہے۔ جو دین پر چلنے میں اس کی مزاحم ہو۔ یہ کوئی فرد ہو، جماعت ہو یا حکومت ہو الغرض اس کی دنیا کسی مدرسے یا خانقاہ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کا دائرہ کار پوری دنیا تک وسیع ہوتا ہے ؎

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ

مسلمانوں کی پریشاں نظری کا اصل سبب یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے انہیں اُن کے اصل مقام سے آشنا نہیں کیا۔ ان میں ضبطِ نفس، خودی اور نظم و ضبط کی صفات پیدا نہیں کیں بلکہ انہیں خانقہی رسوم و آداب سے روشناس کرا کر ان میں موجود صلاحیتوں کو بھی زنگ آلود کر دیا۔ ان کے تربیت یافتہ نوجوان جس ڈگر پر چل رہے ہیں وہ اس سے

ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور جو رسوم و آداب انہیں اس نظام سے ملے ہیں، انہیں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں نے بھی اپنی عزّت و توقیر کی خاطر دین کو چند رسموں تک محدود کر کے لوگوں کو انہیں کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ہمارے نوجوانوں میں بڑی صلاحیتیں ہیں اگر انہیں صحیح رہنمائی میسّر آجائے تو وہ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ اگر ہمارے مذہبی پیشوا خانقہی رسوم و آداب کی بجائے نوجوانوں کو ضبطِ نفس، خودی اور نظم و ضبط کا درس دے کر جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ان میں جہاد کی روح پھونک دیں تو وہ دنیا میں اپنی قوم کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کر سکتے ہیں ؎

اے پیرِ حرم رسم خانقاہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

اللہ کے ذکر کی تین اقسام ہیں۔ دل میں اللہ تعالےٰ کی یاد کو تازہ رکھنا، زبان سے اس کی تسبیح، تحمید اور تکبیر بیان کرنا اور عمل کے ذریعے اس کی اطاعت کا دم بھرنا۔ لیکن خانقہی نظام کے علمبرداروں نے اپنے عقیدت مندوں کو ذکر کی پہلی دونوں قسموں کا پیرو بنا رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ عمل سے غافل ہو گئے ہیں۔ آدھی رات کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اپنی جگہ بہت افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے غور و خوض اور مراقبے بھی بجا لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ دین کے دوسرے تقاضوں سے انسان غافل ہو جائے اور زندگی کا وسیع میدان طاغوتی طاقتوں کے کھل کھیلنے کے لئے کھلا چھوڑ دے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور مراقبوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی اصلاح کر کے میدانِ عمل میں آئے، دنیا کی خرابیوں کی درکرے، برائیوں کو

مٹانے اور اور بھلائیوں کو پھیلانے کے لئے جدوجہد کرے۔ اگر ذکر نیم شبی اور مراقبے کسی کے دل میں بلند جذبات پیدا نہ کریں تو ایسے مراقبے بے کیف اور بے فائدہ ہیں۔

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور ۔!!
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کسی امّت کا عالمِ شباب یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد مردِ میدان ہوتے ہیں۔ زندگی کے حقائق پر نظر رکھتے ہیں۔ زمانہ اگر غلط روش پر چل نکلے تو وہ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ اپنے ساتھ صراطِ مستقیم پر چلانے کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ وہ طاغوتی طاقتوں کو اتنا زور نہیں پکڑنے دیتے کہ وہ ملّت کے لئے کسی خطرے کا نشان بن جائیں۔ وہ بروقت ان سے جنگ کر کے ان کو مغلوب کرتے ہیں لیکن کسی قوم کے افراد بزدل اور کمزور ہو کر شیری کی بجائے روباہی اختیار کر لیں، اپنی خانقاہوں یا گھروں میں بیٹھے مذہبی رسومات ادا کرتے رہیں، ان کے اندر مایوسی و قنوطیت کے جراثیم پیدا ہو جائیں، ان کے دلوں پر مردنی چھا جائے، اندوہ اور دلگیری کی فضا میں زندگی بسر کرنے پر قناعت کر لیں، حالات کو بدلنے کے لئے کسی قسم کی جدوجہد نہ کریں اور رہبانیت کی طرف مائل نظر آئیں تو یہ اس امّت کا عالمِ پیری ہوتا ہے، اور اس کے زوال کا وقت قریب ہوتا ہے۔ مردِ مومن اپنے اوپر کبھی یہ حالت طاری نہیں ہونے دیتا۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو وہ انہیں سازگار بنانے کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی حالات کو بدلنے کے لئے جہاد کیا تھا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہمسائگی کو چھوڑا، مسجدِ نبوی اور مسجدِ حرام میں نمازیں پڑھنے کی سعادت کو خیرباد کہہ کر اس سے بڑی سعادت حاصل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یزید آہستہ آہستہ عوام پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ اللہ تعالےٰ کے آئین کو بالادستی حاصل نہ رہی تھی۔ لوگ یزید کی ناروا پابندیوں کو قبول کئے بیٹھے تھے کہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالےٰ کی حاکمیت اور قرآن کے آئین کی بالادستی قائم کرنے کے لئے میدان میں آ گئے اور مسلمانوں کو یہ درس دے گئے کہ جب بھی حالات اس

قسم کے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو بدلنے کے لئے جہاد کریں اور حق وصداقت کی خاطر مال اور جان کی قربانی دے دیں لیکن باطل کے سامنے سر نہ جھکائیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبّیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہِ دلگیری
ترے دین وادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امّتوں کا عالمِ پیری

مشرکانہ رسوم وعقائد

پروفیسر گولزیئر (GOLZIER) نے جو یورپ میں علوم اسلامیہ کے سب سے بڑے ماہر ہیں، اپنی مشہور کتاب "مطالعاتِ اسلامیہ" میں ایک مبسوط مضمون تصوّف کے اس پہلو پر لکھا ہے جس کا عنوان ولی پرستی ہے۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ چونکہ مذہبِ اسلام میں خدا اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں اور فطرتِ انسانی طبعی طور پر ایک واسطے کی متلاشی ہے، اس واسطے مسلمانوں میں ولی پرستی، پیر پرستی اور قبر پرستی پیدا ہوئی۔ علّامہ اقبال مسلمانوں میں اس شرک کی موجودگی کا تو اعتراف کرتے ہیں لیکن پروفیسر گولزیئر کی بیان کردہ وجہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ ایک محقّق جس کے دل و دماغ نے مسیحی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔ مسلمانوں کی پیر پرستی کو اسی نگاہ سے دیکھے گا۔ ہم پروفیسر گولزیئر کے اس خیال سے متفق نہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں میں اس شرک کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے بالکل اور اسباب ہیں اگر اس دیباچے کا مقصد تصوّف کے اس

پہلو پر بحث کرنا ہوتا تو ہم ان اسباب پر مفصّل لکھتے۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اس شرکِ خفی نے کس طرح مسلمانوں کو گھن کی طرح کھایا ہے وہ مولٰینا اسماعیل رحمۃ اللہ کی "تقویۃ الایمان" کا مطالعہ کریں۔ مسلمانانِ ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کو یہ کتاب غور سے پڑھنی چاہیئے۔ گو ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قوّت کا بیشتر حصّہ مسلم مشرکوں کو گالیاں دینے میں ضائع کیا ہے۔ کیا خوب ہو اگر کوئی بزرگ اس کتاب کا ایک موزوں انتخاب عام مسلمانوں کے مطالعہ کے لئے شائع کر دے۔[1]

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاّمہ اقبال مسلمانوں میں مروّجہ بعض رسوم و عقائد کو درست نہیں سمجھتے اور انہیں شرکِ خفی کا نام دیتے ہیں اسی لیئے ان کا کہنا ہے کہ "تقویۃ الایمان" برصغیر کے تمام مسلمانوں کو بغور پڑھنی چاہیئے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ جن کاموں کو جائز اور حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں ان کے متعلق شریعت کے کیا احکام ہیں اور اگر وہ کسی غلط فہمی کی بنا شرکِ خفی کے مرتکب ہو رہے ہوں تو اپنی اصلاح کر لیں اور آخرت کے دردناک عذاب سے بچ جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "تقویۃ الایمان" کے کچھ حصّے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سے کام ہیں جن کے اندر شرک پوشیدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ شرکِ جلی پہچاننا آسان ہے لیکن شرکِ خفی ایسا شرک ہے جس کا مرتکب بعض اوقات کسی کام کو ثواب سمجھ کر تا ہے لیکن حقیقت میں وہ شرک کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیئے شرکِ جلی اور خفی کی تمام اقسام سے ہر مسلمان کا باخبر ہونا نہایت ضروری ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کو پانچ فصول میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں شرک کی برائی اور توحید کی خوبی کا ذکر ہے۔ دوسری فصل میں شرک فی العلم، تیسری

---

[1] تاریخ تصوّف۔ علاّمہ محمد اقبال مرتبہ پروفیسر صابر کلوروی

میں شرک فی التصرف، چوتھی میں شرک فی العبادت اور پانچویں میں شرک فی العادت کا تذکرہ ہے۔ ان تمام فصول سے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

فصل اوّل

شرک کی بُرائی

قال اللہ تعالیٰ:

اِنَّ اللہ لا یغفر اَنْ یشرک بہٖ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد ضلّ ضلالاً بعیدا

ترجمہ: فرمایا اللہ تعالیٰ نے یعنی سورہ نساء میں:

بے شک اللہ نہیں بخشتا یہ کہ شریک ٹھہرادے اس کا اور بخشتا ہے ورے اس سے جس کو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو بے شک راہ بھولا دُور بھٹک کر۔

یعنی اللہ کی راہ بھولنا یوں بھی ہوتا ہے کہ حرام و حلال میں امتیاز نہ کرے چوری اور بدکاری میں گرفتار ہو جاوے۔ نماز روزہ چھوڑ دیوے۔ جورو بچّوں کا حق تلف کرے۔ ماں باپ کی بے ادبی کرے۔ لیکن جو شرک میں پڑا وہ سب سے زیادہ بھولا اس لئے کہ وہ ایسے گناہ میں گرفتار ہوا کہ اللہ اس کو ہرگز نہ بخشے گا اور سارے گناہوں کو اللہ شاید بخش بھی دیوے (یعنی شرک اور کفر بغیر توبہ کے نہیں بخشے جاتے باقی گناہوں میں چاہے تو بے توبہ صغیرہ پر عذاب کرے اور چاہے تو کبیرہ بھی بخش دے) اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نہ بخشا جائے گا۔ جو اس کی سزا ہے مقرر ملے گی پھر اگر پرلے درجے کا شرک ہے کہ آدمی جس سے کافر ہو جاتا ہے تو اس کی سزا یہی ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو دوزخ میں رہے گا نہ اس سے کبھی باہر نکلے گا نہ اس میں کبھی آرام پاوے گا اور جو اس سے ورلے درجے کے شرک ہیں ان کی سزا جو اللہ کے ہاں مقرر

ہے سو پاوے گا ۔ اور باقی جو گناہ ہیں ان کی جو کچھ سزائیں اللہ کے ہاں مقرر ہیں سو اللہ کی مرضی پر ہیں چاہے دیوے چاہے معاف کرے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ۔ اس کی مثال یہ کہ بادشاہ تقصیریں اس کی رعیت کے لوگ جتنی کریں جیسے چوری ، قزاقی چوکی پہرے کے وقت سو جانا ، دربار کے وقت کو ٹال جانا ، لڑائی کے میدان سے ٹل جانا ، سرکار کے پیسہ پہنچانے میں قصور کرنا علیٰ ہذا القیاس ان سب کی سزائیں بادشاہ کے ہاں مقرر ہیں مگر چاہے تو پکڑے چاہے تو معاف کر دے ۔ اور ایک تقصیریں اس ڈھب کی ہیں کہ جن میں بغاوت نکلتی ہے ۔ جیسے کسی امیر یا وزیر یا چودھری قانون گو کو یا چوہڑے چمار کو بادشاہ بنا دے یا اس کے واسطے تاج و تخت تیار کرے یا اس کے تئیں ظلِ سبحانی بولے یا اس کے تئیں بادشاہ کا سا مجرا کرے ۔ یا اس کے لیے ایک دن جشن کا ٹھہرا دے اور بادشاہ کی طرح نذر دیوے ۔ یہ تقصیر سب تقصیروں سے بڑی ہے اس کی سزا مقرر اس کو پہنچتی ہے اور جو بادشاہ ایسوں کو سزا نہ دیوے اس کی بادشاہت میں قصور ہے ۔ چنانچہ عقلمند لوگ ایسے بادشاہ کو بے غیرت کہتے ہیں ۔ سو اس مالک الملک شاہنشاہ غیور سے ڈرا چاہیئے کہ پرلے سرے کا زور رکھتا ہے اور ویسی غیرت ۔ سو وہ مشرکوں سے کیونکر غفلت کرے گا اور کس طرح ان کو ان کی سزا نہ دے گا ۔ اللہ سب مسلمانوں پر رحمت کرے اور ان کو شرک کی آفت سے بچا دے آمین ـــــ!

۲ ۔ مشکوٰۃ کے باب الریا میں لکھا ہے کہ مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا ابوہریرہ نے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ فرمایا اللہ تعالےٰ نے کہ میں بڑا بے پروا ہوں ساجھیوں میں ساجھی سے ۔ جو کوئی کرے کچھ کام کہ ساجھی کر دے اس میں میرے ساتھ اور کسی کو ۔ سو میں چھوڑ دیتا ہوں اس کو اور اس کے ساجھی کو اور میں اس سے بیزار ہوں ۔ یعنی جس طرح اور لوگ اپنی مشترک چیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں سو میں یوں نہیں کرتا کیونکہ میں بے پروا ۔ ہوں بلکہ جو کوئی کچھ کام میرے واسطے کرے اور غیر کو بھی اس میں شریک کر دے سو میں اپنا حصہ بھی

نہیں لیتا بلکہ سارے ہی کو چھوڑ دیتا ہوں اور اس سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص ایک کام کرے اللہ کے واسطے پھر وہی کام کرے اور کسی کے واسطے، اس پہ شرک ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرک جو عبادت اللہ کی کرے وہ بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں بلکہ اللہ اس سے بزار ہے۔

فصل دوئم

بیان میں بُرائی اشراک فی العلم کے

۳۔ قال اللہ تعالیٰ:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ

ترجمہ: فرمایا اللہ تعالےٰ نے یعنی سورہ انعام میں کہ:

اسی پاس کنجیاں ہیں غیب کی۔ نہیں جانتا ان کو مگر وہی ــــ

یعنی جس طرح اللہ صاحب نے بند دل کے واسطے ظاہر کی چیزیں دریافت کرنے کو کچھ راہیں بتادی ہیں جیسے آنکھ دیکھنے کو، کان سننے کو، ناک سونگھنے کو، زبان چکھنے کو، ہاتھ ٹٹولنے کو، عقل سمجھنے کو اور وہ راہیں ان کے اختیار میں دی ہیں کہ اپنی خواہش کے موافق ان سے کام لیتے ہیں۔ جیسے کچھ دیکھنے کو دل چاہا تو آنکھ کھول دی نہ چاہا تو بند کر لی۔ جس چیز کا مزہ دریافت کرنے کا ارادہ ہوا منہ میں ڈال لیا نہ ارادہ ہوا نہ ڈالا۔ سو گویا کہ ان چیزوں کے دریافت کرنے کو کنجیاں ان کو دی ہیں جیسے جس کے ہاتھ کنجی ہوتی ہے قفل اسی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ جب تو چاہے تو کھولے جب چاہے نہ کھولے۔ اسی طرح ظاہر کی چیز کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے جب چاہیں کریں جب چاہیں نہ کریں سو اس طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو کہ جب چاہے کر لیجے۔ یہ اللہ

صاحب ہی کی شان ہے۔ کسی ولی و نبی کو، جن و فرشتے کو، پیر و شہید کو، امام زادے کو، بھوت و پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔ بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو جتنی بات چاہتا ہے خبر دیتا ہے سو یہ اپنے ارادے کے موافق نہ ان کی خواہش پر۔ چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بعضی بات کے دریافت کرنے کی خواہش ہوئی اور وہ بات معلوم نہ ہوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو ایک آن میں بتا دی۔ چنانچہ حضرتؐ کے وقت میں منافقوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی اور حضرتؐ کو اس سے بڑا رنج ہوا اور کئی دن تک بہت تحقیق کی پھر کچھ حقیقت نہ معلوم ہوئی اور بہت فکر و غم میں رہے۔ جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو بتا دیا کہ وہ منافق جھوٹے ہیں اور عائشہؓ پاک ہیں۔ سو یقین یوں رکھا چاہیئے کہ غیب کے خزانے کی کنجی اللہ ہی کے پاس ہے۔ اس نے کسی کے ہاتھ میں نہیں دی اور کوئی اس کا خزانچی نہیں۔ مگر اپنے ہی ہاتھ سے قفل کھول کر اس میں سے جس کو جتنا چاہے بخش دے۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی یہ دعوےٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے کہ میں جب چاہوں اس سے غیب کی بات معلوم کر لوں اور آئندہ باتوں کو معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے سو وہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعوٰی خدائی کا رکھتا ہے اور جو کوئی کسی نبی ولی یا جن و فرشتہ کو، امام و امام زادہ کو یا پیر و شہید کو، نجومی و رمال یا جفار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن اسٹی کو یا بھوت و پری کو ایسا جانے اور اس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس آیت سے منکر اور یہ جو وسواس آتا ہے کہ بعضے وقت کوئی نجومی یا رمّال یا برہمن یا شگونی کچھ کہہ دیتا ہے اور وہ اسی طرح ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی غیب دانی ثابت ہوتی ہے۔ سو یہ بات غلط ہے۔ اس واسطے کہ بہت باتیں ان کی غلط بھی ہوتی ہیں تو معلوم ہوا کہ علمِ غیب ان کے اختیار میں نہیں۔ ان کی اٹکل کبھی درست ہوتی ہے کبھی غلط اور

یہی حال ہے استخارہ اور کشف کا اور قرآن مجید کے فال کا۔ لیکن پیغمبروں کی وحی میں کبھی غلطی نہیں پڑتی سو وہ ان کے قابو میں نہیں۔ اللہ صاحب جو آپ چاہتا ہے سو بتا دیتا ہے۔

۴ - وقال اللہ تعالیٰ

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝

ترجمہ اور فرمایا اللہ صاحب نے سورۂ احقاف میں :

اور کون زیادہ گمراہ ہوگا اس شخص سے کہ پکارتا ہے ورے اللہ سے اُن لوگوں کو کہ قبول نہ کریں گے اس کی بات قیامت کے دن تک اور وہ اُن کے پکارنے سے غافل ہیں

یعنی شرک کرنے والے بڑے احمق ہیں کہ اللہ قادر علیم کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں کہ اوّل تو ان کا پکارنا سنتا ہی نہیں اور دوسرے کچھ قدرت نہیں رکھتے کہ اگر کوئی قیامت تک ان کو پکارے تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے لوگ اگلے بزرگوں کو دور دور سے پکارتے ہیں اور اتنا ہی کہتے ہیں کہ یا حضرت تم اللہ کی جانب میں دعا کرو کہ وہ اپنی قدرت سے ہماری حاجت روا کرے اور پھر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس واسطے کہ ان سے حاجت نہیں مانگی بلکہ دعا کروائی ہے۔ سو یہ بات غلط ہے۔ اس واسطے گو اس مانگنے کی راہ سے شرک نہیں ثابت ہوتا لیکن پکارنے کی راہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کو ایسا سمجھا کہ دور سے اور نزدیک سے سن لیتے ہیں جبھی ان کو اس طرح پکارا اور حالانکہ اللہ صاحب نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو اللہ کے ورے ہیں یعنی مخلوق سو وہ پکارنے والے کے پکارنے سے غافل ہیں۔

نصل سوئم

اشراک فی التصرّف کی بُرائی کے بیان میں

۵۔ قال اللہ تعالیٰ :

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهِ ط قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ط

ترجمہ فرمایا اللہ صاحب نے یعنی سورہ مومنون میں :

کہہ کون ہے وہ شخص جس کے ہاتھ میں ہے قابو ہر چیز کا اور وہ حمایت کرتا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کرتا جو جانتے ہو وہیں کہہ دیں گے کہ اللہ ہی ہے ۔ کہہ پھر کہاں سے خبط میں پڑ جاتے ہو ۔

یعنی جس سے پوچھیے کہ ایسی شان کس کی ہے کہ ہر چیز اس کے قابو میں ہے جو چاہے کر ڈالے اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے اور اس کی حمایت میں کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے اور اس کے تقصیر دار کو کہیں پناہ نہ مل سکے اور اس کے مقابلے میں کسی کی حمایت نہ چل سکے ۔ سو ہر کوئی یہی جواب دے گا کہ ایسی شان اللہ کی ہے ۔ سو سمجھا چاہیے کہ پھر اور کسی سے مرادیں مانگنی محض خبط ہے ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ مگر اپنے بتوں کو اس کے جناب میں اپنا وکیل سمجھ کر مانتے تھے ۔ اسی سے کافر ہو گئے ۔ سو اب بھی جو کوئی مخلوق کو عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے سو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے ۔ گو اللہ تعالیٰ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابلہ کی طاقت اس کو نہ ثابت کرے ۔

۶۔ وقال اللہ تعالیٰ:

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَیْئًا وَّلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ

ترجمہ فرمایا اللہ صاحب نے یعنی سورۂ نحل میں:

اور پوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسوں کو کہ اختیار نہیں رکھتے ان کی روزی کا آسمانوں سے اور نہ زمین سے کچھ۔ اور نہیں طاقت رکھتے۔

یعنی اللہ کی سی تعظیم کرتے ہیں ایسے لوگوں کی کہ ان کا اختیار نہیں اور ان کی روزی پہنچانے میں کچھ دخل نہیں رکھتے۔ نہ آسمانوں سے مینہہ برسا دیں نہ زمین سے کچھ اگا دیں اور ان کو کسی نوع کی قدرت نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے عوام الناس کہتے ہیں کہ اولیاء انبیاء کو امام و شہیدوں کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت تو ہے لیکن اللہ کی تقدیر پر پردہ شاکر ہیں اور اس کے ادب سے دم نہیں مارتے۔ اگر چاہیں تو ایک دم میں اُلٹ پلٹ کر دیں لیکن شرع کی تعظیم میں چپ بیٹھے ہیں۔ سو یہ بات سب غلط ہے بلکہ کسی کام میں نہ بالفعل ان کو دخل ہے نہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔

۷۔ مشکوٰۃ کے باب التوکل والصبر میں لکھا ہے، ترمذی نے ذکر کیا کہ نقل کیا ابن عباس نے کہ تھا میں پیچھے پیغمبر خدا کے ایک دن۔ سو فرمایا اے لڑکے یاد رکھ اللہ کو۔ وہ یاد رکھے گا تجھ کو۔ یاد رکھ اللہ کو پاوے گا تو اس کو اپنے روبرو اور جب مانگے تو کچھ مانگ اللہ ہی سے۔ اور جب مدد چاہے تو مدد چاہ اللہ ہی سے اور یہ یقین سمجھ لے کہ بیشک سب لوگ اگر اکٹھے ہو جاویں اس پر کہ کچھ فائدہ پہنچا دیں تجھ کو تو فائدہ نہ پہنچا سکیں گے مگر جتنا کہ لکھ دیا اللہ نے تیرے حق میں اور وہ جو اکٹھے ہوویں اس پر کہ نقصان پہنچاویں تجھ کو کچھ تو نہ نقصان پہنچا سکیں گے مگر وہی کہ لکھ دیا ہے اللہ نے تجھ پر۔ اٹھائی گئی قلم اور سوکھ گیا کاغذ۔ یعنی اللہ صاحب کو کہ سب بادشاہوں کا بادشاہ

ہے اور بادشاہوں کی طرح مغرور نہیں کہ کوئی رعیتی بہتیرا ہی التجا کرے، اس کی طرف مارے غرور کے خیال نہیں کرتے، اس لئے رعیتی لوگ امیروں کو مانتے ہیں اور ان کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں تاکہ ان کی خاطر سے التجا قبول ہووے بلکہ وہ بڑا کریم رحیم ہے وہاں کسی کی وکالت کی کچھ حاجت نہیں۔ جو اس کو یاد رکھے وہ اس کو آپ ہی یاد رکھتا ہے کوئی سفارش کرے یا نہ کرے اور اسی طرح گو وہ سب چیز سے پاک ہے۔ اور سب سے بلند مگر اور بادشاہوں کا سا دربار نہیں کہ کوئی رعیتی لوگ وہاں پہنچ نہ سکیں اور امیر و وزیر ہی رعیت پر حکم چلا دیں اور رعیت کے لوگوں کو انہیں کا حکم ماننا پڑے گا اور انہی کا دربار کرنا پڑے اور بلکہ اپنے بندوں سے بہت نزدیک ہے جو ادنیٰ بندہ اپنے دل سے اس کی طرف متوجہ ہووے تو وہیں اس کو منہ ہی کے آگے پاوے وہاں اپنی غفلت ہی کے سوا اور کچھ پردہ نہیں۔ جو کوئی اس سے کچھ دور ہے سو اپنی غفلت کے سبب سے دور ہے۔ اور وہ سب سے نزدیک۔ پھر جو کوئی کسی پیر و پیغمبر کو پکارتا ہے کہ وہ اس کو اللہ کے نزدیک کر دیویں سو یہ نہیں سمجھتا کہ پیر و پیغمبر تو اس سے دور ہیں اور اللہ نہایت نزدیک۔ سو یہ ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک رعیتی آدمی اپنے بادشاہ کے پاس اکیلا بیٹھا ہے اور وہ بادشاہ اسی کی عرض سننے کو متوجہ ہے۔ پھر وہ رعیتی کسی امیر وزیر کو دور سے پکارے کہ تو میری طرف سے فلانی بات بادشاہ کے حضور میں عرض کر دے۔ سو وہ اندھا ہے یا دیوانہ۔ اور فرمایا کہ ہر مراد اللہ ہی سے مانگے اور ہر مشکل میں اسی کی مدد چاہے اور یہ یقین سمجھ لیجئے کہ قلم تقدیر ہرگز نہیں پھرتا، اور لکھا ہرگز نہیں ٹلتا۔ پھر اگر سارے جہان کے بڑے اور چھوٹے مل کر چاہیں کہ کسی کو کچھ نفع و نقصان پہنچاویں اللہ کے لکھے سے کچھ بڑھ نہیں سکتا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے عوام الناس کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو اللہ نے یہ طاقت بخشی ہے کہ تقدیر کو بدل ڈالیں، جس کی تقدیر میں اولاد نہیں لکھی اس کو اولاد دے دیویں جس کی عمر تمام ہو چکی ہو اس

کی عمر بڑھا دیویں۔ سو یہ بات کچھ صحیح نہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ اپنے ہر بندے کی کبھی دعا قبول بھی کر لیتا ہے اور انبیاء و اولیاء کی اکثر۔ مگر دعا کی توفیق دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور قبول کرنا بھی۔ اور دعا بھی کرنی اور مراد بھی ملنی دونوں باتیں تقدیر میں لکھی ہیں۔ تقدیر سے باہر کوئی کام دنیا میں نہیں کر سکتا اور کچھ کام کرنے کی قدرت نہیں۔ ہر بندہ بڑا ہو یا چھوٹا، نبی ہو یا ولی سوائے اس کے کہ اللہ سے مانگے اور اس کی جانب میں دعا کرائے کچھ اور طاقت نہیں رکھتا۔ پھر وہ مالک مختار ہے چاہے اپنی مہربانی کی راہ سے قبول کرے چاہے اپنی حکمت کی راہ سے قبول نہ کرے۔

۸۔ مشکوٰۃ کے باب التوکل والصبر میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ نے ذکر کیا کہ عمرو بن العاصؓ نے نقل کیا ہے کہ پیغمبرِ خدا نے فرمایا ہے کہ بے شک آدمی کے دل کی ہر میدان کی طرف راہ ہے۔ جو کوئی پیچھے ڈالے اپنے دل کو سب راہوں کے تو کچھ پروا نہیں رکھتا اللہ کہ کس جنگل میں تباہ کر دے اس کو اور جو کوئی بھروسہ کرے۔ اللہ پر تو وہ کفایت کرتا ہے اس کو سب راہوں کی یعنی جب آدمی کو کسی چیز کی طلب ہوتی ہے یا کوئی مشکل اڑ جاتی ہے تو اس کے دل میں ہر طرف خیال دوڑتے ہیں کہ فلانے پیغمبر کو پکارے، فلانے امام کی مدد چاہے، فلانے پیر و مرشد کی منت مانے، فلانی پیرنی کو مانے، فلانے نجومی یا رمّال سے پوچھے، فلانے ملّا سے فال نکلوائے۔ پھر جو کوئی ہر خیال کے پیچھے پڑتا ہے تو اس سے اپنی قبولیت کی نگاہ پھیر لیتا ہے اور اس کو اپنے سچے بندوں میں نہیں رکھتا اور اللہ کی تربیت اور ہدایت کی راہ اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور وہ اسی طرح انہیں خیالات کے پیچھے دوڑتا دوڑتا تباہ ہو جاتا ہے۔ کوئی دہریا ہو جاتا ہے کوئی ملحد کوئی مشرک ہو جاتا ہے اور کوئی سب سے منکر ہو جاتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہے اور کسی خیال کے پیچھے نہیں پڑتا سو اللہ اس کو اپنے مقبول بندوں میں گن لیتا ہے اور اس پر ہدایت کی راہیں کھول دیتا ہے اور اس کے دل کو چین اور آرام ایسا بخش دیتا ہے کہ خیالات باندھنے والوں کو ہرگز میسّر نہیں ہوتا اور جو کچھ

جس کی تقدیر میں لکھا ہے وہ اس کو مل کر ہی رہتا ہے۔ مگر خیالات باندھنے والا مفت رنج کھینچتا ہے اور توکل کرنے والا چین و آرام پاتا ہے۔

فصل چہارم

اشراک فی العبادت کی بُرائی کے بیان میں

۹۔ وقال اللہ تعالیٰ:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

ترجمہ اور کہا اللہ صاحب نے کہ:

مت سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو اور سجدہ کرو اللہ کو جس نے پیدا کیا ان کو جو تم اسی کے بندے بنا چاہتے ہو۔

یعنی جو آدمی چاہے کہ اللہ ہی کا بندہ بنے تو سجدہ اسی کو کرے اور کسی چاند و سورج کو نہ کرے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں یوں ہی فرمایا ہے کہ سجدہ کرنا حق خالق ہی کا ہے سو کسی مخلوق کو نہ کیا چاہیئے کہ مخلوق ہونے میں چاند اور سورج اور نبی اور ولی برابر ہیں سو جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دنیوں میں کسی کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے جیسے فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو کیا اور حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کرلیں تو کچھ مضائقہ نہیں سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے، یہ چاہیئے لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کرلیں۔ اور اصل بات یہی ہے کہ بندے کو اللہ کا حکم ماننا چاہیئے۔ جب اس نے جو حکم فرمایا اس کو جان و دل سے قبول کرلینا چاہیئے اور حجت نہ نکالے کہ اگلے لوگوں پہ تو یہ حکم نہ تھا ہم پر کیوں

ہوا کہ ایسی حجتیں لانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ کہ ایک بادشاہ نے اپنے ملک میں ایک مدت تک ایک حکم جاری کیا پھر بعد اس کے ایک اور حکم جاری کیا۔ پھر جو کوئی یہ بات کہنے لگے کہ ہم پہلے ہی حکم پر چلے جاویں گے، پچھلا حکم نہیں مانتے تو وہ بھی باغی ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اور فرمایا اللہ صاحب نے سورۂ حج میں کہ آواز کر دے لوگوں میں حج کی کہ چلے آویں گے تیرے پاس پیادے اور دُبلے دُبلے اونٹوں پر کہ چلے آتے ہیں دور دور کے راستے سے کہ پہنچیں اپنے فائدوں کی جگہوں میں اور یاد کریں اللہ کا نام کئی معین دنوں میں اس چیز پر کہ دیا ہے اس نے ان کو مواشی چوپایوں میں سے سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ بدحال محتاج کو پھر چاہیے کہ تمام کریں میل کچیل اپنا اور پوری کریں منتیں اپنی اور طواف کریں اس قدیم گھر کا۔ یعنی اللہ صاحب نے اپنی تعظیم کے لئے بعضے بعضے مکان ٹھہرائے ہیں جیسے کعبہ اور عرفات اور مزدلفہ اور منیٰ اور صفا اور مروہ اور مقامِ ابراہیم اور ساری مسجد الحرام بلکہ سارا مکہ معظمہ بلکہ سارا حرم اور لوگوں کے دل میں وہاں جانے کا شوق ڈال دیا ہے کہ ہر طرح سے خواہ سوار خواہ پیادہ دور دور سے قصد کرتے ہیں اور رنج اور تکلیف سفر کی اٹھائے میلے کچیلے ہو کر وہاں پہنچتے ہیں اور اس کے نام پر وہاں جانور ذبح کرتے ہیں اور اپنی منتیں ادا کرتے ہیں اور اس کا طواف کرتے ہیں اور اپنے مالک کی تعظیم جو دل میں بھر رہی ہے وہاں جا کر خوب نکالتے ہیں۔ کوئی چوکھٹ کو چومتا ہے، کوئی دروازے کے سامنے دعا کر رہا ہے، کوئی غلاف پکڑے ہوئے التجا کر رہا ہے۔ کوئی اس کے پاس اعتکاف کی نیت سے بیٹھ کر رات دن اللہ کی یاد میں مشغول ہے، اور کوئی ادب سے کھڑا ہوا اس کو دیکھ ہی رہا ہے۔ غرض اس قسم کے کام سے اللہ کی تعظیم کرتے ہیں اور اللہ ان سے راضی ہے اور ان کو دین و دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سو اس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کے لئے نہ کیا چاہیے اور کسی کی قبر پر یا چلہ پر یا کسی کے تھان پر دور دور سے قصد کر نا سفر کا رنج اور تکلیف اٹھا کر میلے کچیلے

ہو کر وہاں پہنچنا اور وہاں جا کر جانور چڑھانے اور منتیں پوری کرنی اور کسی قبر یا مکان کا طواف کرنا اور اس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت اٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا اور اس قسم کے کام کرنے اور ان سے کچھ دین دنیا کے فائدہ کی سا یہ سب شرک کی باتیں ہیں ان سے بچنا چاہیئے کیونکہ یہ معاملہ خالق ہی سے کیا چاہیئے کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ اس سے یہ معاملہ کیجیے۔

۱۱۔ قال اللہ تعالیٰ :

اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ

ترجمہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں:

یا گناہ کی چیز کہ مشہور کی گئی ہو اللہ کے سوا اور کی کر کے۔

یعنی جیسا سُور اور لہو اور مُردار ناپاک حرام ہے ایسا ہی وہ جانور بھی ناپاک اور حرام ہے کہ خود گناہ کی صورت بن رہا ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کا ٹھہرایا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جانور کسی مخلوق کے نام کا نہ ٹھہرائے اور وہ جانور حرام ہے اور ناپاک۔ اس آیت میں کچھ اس بات کا مذکور نہیں کہ اس جانور کے ذبح کرنے کے وقت کسی مخلوق کا نام لیجیے جب حرام ہو بلکہ اتنی ہی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا کہ یہ گاؤ سیّد احمد کبیر کی ہے یا یہ بکرا شیخ سدو کا ہے سو وہ حرام ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی جانور ہو مرغی یا اونٹ کسی مخلوق کے نام کا کر دیجیے ولی کا یا نبی کا، باپ کا یا دادے کا، بھوت کا یا پری کا، وہ سب حرام ہے اور ناپاک۔ اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ اَخْرَجَ التِّرْمِذِیُّ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلعم

لَا تَقُوْمُوا السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِیْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَحَتّٰى تَعْبُدُ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِیْ الْاَوْثَانَ

ترجمہ: مشکوٰۃ کے کتاب الفتن میں لکھا ہے کہ ترمذی نے ذکر کیا کہ نقل کیا

ثوبانؓ نے کہا کہ فرمایا پیغمبرؐ خدا نے کہ نہیں آئے گی قیامت یہاں تک کہ مل جاویں کتنی قومیں میری امت میں سے مشرکین میں اور یہاں تک کہ پوجنے لگیں گی کئی قومیں میری امت میں سے تھانوں کو۔ یعنی شرک دو طرح کا ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ کسی کے نام کی صورت بنا کر پوجے اس کو عربی زبان میں صنم کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ کسی تھان کو مانے یعنی کسی کے مکان کو یا درخت کو یا کسی پتھر کو یا لکڑی کو یا کاغذ کو کسی کے نام ٹھہرا کر پوجے۔ اس کو عربی زبان میں وثن کہتے ہیں۔ اس میں داخل ہے قبر اور کسی کا چلہ اور لحد اور کسی کے نام کی چھڑی اور تعزیہ اور عَلَم اور شُدّا اور امام قاسم کی، پیر دستگیر کی، مہدی اور امام کا چبوترہ اور استاد اور پیروں کے بیٹھنے کی جگہ کہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور وہاں جا کر نذریں چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں اور اسی طرح شہید کے نام کا طاق اور نشان اور توپ جس کو بکرا چڑھاتے اور اس کی قسم کھاتے ہیں اور اسی طرح بعضے مکان مرضوں کے نام سے مشہور کرتے ہیں جیسے سیتلا کا تھان یا مسانی کا یا بھوانی کا یا کالی کا یا کالکا کا یا براہی کا۔ غرض یہ سب وثن ہیں۔ سو پیغمبرؐ خدا نے خبر دی ہے کہ مسلمان جو قیامت کے نزدیک مشرک ہو جاویں گے ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا کہ ایسی چیزوں کو مانیں گے برخلاف اور مشرکوں کے کہ جیسے ہندو یا مشرکین عرب کہ اکثر صنم پرست ہیں۔ یعنی مورتوں کو مانتے ہیں۔ سو دونوں مشرک ہیں، اللہ سے پھرے ہوئے رسول کے دشمن۔

فصل پنجم

اشراک فی العادات کی برائی کے بیان میں

۱۳۔ اور کہا اللہ تعالیٰ نے یعنی سورۂ اعراف میں کہ اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور بنایا اسی سے جوڑا اس کا کہ چین پاوے اس سے پھر جب ڈھانپ

لیا اس کو پیٹ رہ گیا ہلکا سا پھر گزر گئی اسی طرح پھر جب بوجھل ہوئی تو دونوں پکارنے لگے اپنے مالک اللہ کو کہ جو بخش دے تو ہم کو اچھا بچہ تو بے شک ہو دیں ہم حق ماننے والے۔ پھر جب اس نے دیا ان کو اچھا بچہ ٹھہرانے لگے اس کے شریک اسی چیز میں کہ اس نے دیا ان کو سو بہت دور ہے اللہ ان کے شریک بتانے سے۔ یعنی اوّل بھی انسان کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور اسی نے جورو بھی دی اور خاوند جورو میں الفت دی اور جب اولاد کی امید ہوتی ہے تو اسی کو پکارتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں جو اولاد اچھی بچھی ہووے تو اللہ کا بہت حق مانیں۔ پھر جب وہ اولاد بخشتا ہے تو اوروں کو ماننے لگتے ہیں اور ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ کوئی کسی کی قبر پر لے جاتا ہے کوئی کسی کے تھان پر، کوئی کسی کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کی بدھی پہناتا ہے، کوئی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کا فقیر بناتا ہے کوئی نام رکھتا ہے نبی بخش، کوئی علی بخش، کوئی امام بخش، کوئی ستیلا بخش، کوئی گنگا بخش۔ سو اللہ تو ان کی نذر و نیاز کی پروا نہیں رکھتا وہ تو بڑا بے پروا ہے مگر وہ آپ ہی مردود ہو جاتے ہیں۔

۱۴۔ وقال اللہ تعالیٰ :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط

ترجمہ اور کہا اللہ صاحب نے یعنی سورۂ نحل میں کہ نہ کہو جھوٹی باتیں کہ بیان کرتی ہیں تمہاری زبانیں کہ یہ کیا چاہیے اور یہ نہ کیا چاہیے کہ باندھتے ہو اللہ پر جھوٹ۔

بے شک جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ وہ مراد نہیں پاتے۔ یعنی اپنی طرف سے جھوٹ مت ٹھہراؤ کہ فلانا کام کیجیے اور فلانا کام نہ کیجیے کہ کسی کام کو رد کرنا یا نہ رد کر دینا اللہ ہی کی شان ہے۔ سو اس میں اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور یہ خیال باندھنا کہ فلانے کام کو یوں کیجیے تو مرادیں ملتی ہیں اور نہیں تو خلل ہو جاتا ہے۔ سو یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ اللہ پر

جھوٹ باندھنے سے کبھی مراد نہیں ملتی ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں پان نہ کھانا چاہیئے ، لال کپڑا نہ پہنے ، حضرت بی بی کی صحنک مرد نہ کھاویں اور جب ان کی نیاز کیجیئے تو اس میں بالضرور فلانی فلانی ترکاری ہوں ، اور مسّی اور مہندی ہو اور اس کو لونڈی نہ کھاوے اور جس عورت نے دوسرا خاوند کیا ہو وہ بھی نہ کھاوے اور جو نیچ قوم میں ہو یا بدکار ہو وہ بھی نہ کھاوے اور شاہ عبدالحق کا توشہ حلوا ہی ہوتا ہے اور اس کو احتیاط سے بنائے اور حقہ پینے والے کو نہ دیجیئے اور شاہ مدار کی نیاز مایندہ ہی چڑھتا ہے اور بوعلی قلندر کی سہ منی اور اصحاب کہف کی گوشت روٹی اور بیاہ میں فلانی فلانی رسمیں ضرور ہیں ۔ اور موت میں فلانی فلانی اور موت کے بعد نہ آپ شادی کیجیئے نہ کسی کی شادی میں آپ بیٹھیئے اور فلانے لوگ نیلا کپڑا نہ پہنیں اور فلانی لال سُوسی نہ پہنے ۔ سو سب جھوٹ ہیں اور شرک میں گرفتار اور اللہ کی حکومت کی شان میں اپنا دخل کرتے ہیں کہ ایک شرع اپنی جُدی قائم کرتے ہیں ۔

۱۵۔ اَخْرَجَ مُسْلِمٌ عَنْ حَفْصَةَ رض زَوْجِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَتٰی عَرَّافًا فَسَاَلَہٗ عَنْ شَیْءٍ لَمْ تُقْبَلْ صَلٰوتُہٗ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ۔

(ترجمہ) مشکوٰۃ کے باب الکہانت میں لکھا ہے کہ مسلم نے ذکر کیا کہ بی بی حفصہ رض نے نقل کیا کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ جو کوئی جاوے کسی خبریں بتانیوالے کے پاس پھر پوچھے اس سے کچھ تو نہیں قبول ہوتی اس کی نماز چالیس دن ۔

یعنی جو کوئی غیب کی باتیں بتانے کا دعوٰی رکھتا ہے اس پاس جو کوئی جا کر پوچھے تو اس کی عبادت چالیس دن تک مقبول نہیں کیونکہ اس نے شرک کی بات ۔

کی اور شرک سب عبادتوں کا نور کھو دیتا ہے اور نجومی اور رمّال اور جفّار اور فال دیکھنے والے اور کشف اور استخارہ کا دعوٰی کرنے والے اس میں داخل ہیں۔

۱۶۔ اَخرَج البخاری عن ابی ھریرۃ قال رسول اللہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم لاعدٰوی ولا ھامّۃ وَلاَصفر۔

ترجمہ: مشکوٰۃ کے باب الفال والطیرہ میں لکھا ہے:

بخاری نے ذکر کیا کہ ابوہریرہ نے نقل کیا کہ پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا نہ کسی کا کسی کو مرض لگے نہ کسی مردے کی کھوپڑی میں سے اُلّو نکلے (عرب کے جاہلوں میں یہ مشہور تھا کہ اگر مقتول کا بدلا نہ لیا جائے تو اس کی کھوپڑی میں سے ایک اُلّو نکلتا ہے، اور جب تک انتقام نہ لے لیا جائے وہ فریاد کرتا پھرتا ہے اس کو ہامہ کہتے تھے) اور صفر بھی کچھ نہیں۔ (عرب کے جاہلوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ جس کو ایسا مرض پیدا ہو جائے کہ کھاتا چلا جاوے اور پیٹ نہ بھرے جس کو جوع الکلب کہتے ہیں سو اس کے پیٹ میں کوئی بھوت بلا گھس جاتی ہے کہ وہی کھاتی چلی جاتی ہے۔ اس کو صفر کہتے ہیں)۔

سو پیغمبر خدا نے فرمایا کہ یہ بات غلط ہے کچھ بھوت بلا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا یہ جو لوگ بعضے مرضوں کے ساتھ کچھ بلا خیال کرتے ہیں اور اسی کو مانتے ہیں جیسے سیتلا اور مسانی اور براہی سو یہ سب غلط ہے اور یہ بھی ان میں مشہور تھا کہ مہینہ صفر کا نامبارک ہے اس میں کوئی کام نہ کیا چاہیئے سو یہ بھی غلط ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کہنی کہ تیرہ دن صفر کے نامبارک ہیں ان میں کچھ بلائیں اترتی ہیں اور اسی پر ان دنوں کا نام تیرہ تیزی رکھنا کہ ان کی تیزی سے کچھ کام بگڑ جاتا ہے۔ اور اسی طرح کسی مہینے کو یا تاریخ کو یا دن کو نامبارک سمجھنا یہ سب شرک کی رسمیں ہیں

۱۷۔ مشکوٰۃ کے باب الاسامی میں لکھا ہے کہ ابو داؤد اور نسائی نے ذکر کیا کہ شریح نے نقل کیا اپنے باپ سے کہ جب وہ آیا پیغمبرِ خدا کے پاس اپنی قوم کے ساتھ تو حضرت نے سنا ان لوگوں کو کیا کہتے ہیں اس کو ابو الحکم۔ یعنی اصل قضیہ چکا دینے والا۔ پھر فرمایا اس کو پیغمبرِ خدا نے کہ بیشک اللہ ہی ہے اصل قضیہ چکانے والا اور اسی کا ہے ہر حکم۔ پھر تجھ کو کیوں کہتے ہیں ابو الحکم یعنی یہ بات ہر قضیہ چکا دے اور ہر جھگڑا مٹا دے۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ آخرت میں ظہور کرے گی کہ پہلے پچھلے دین و دنیا کے جھگڑے سب صاف ہو جائیں گے۔ اس بات کی کسی مخلوق کو طاقت نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو فقط اللہ ہی کی شان کے لائق ہے اور اس میں وہ پایا جاتا ہے وہ اور کسی کو نہ کہے۔ جیسے بادشاہوں کا بادشاہ، مالک سارے جہان کا خداوند، جو چاہے کر ڈالے، معبود، بڑا، داتا، بے پروا علیٰ ہذا القیاس۔

۱۸۔ اَخْرَجَ فِی شَرحِ السُّنَّۃِ عَنْ حُذَیفہ عَنِ النبیِّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قال لَا تَقُوْلُوْ مَاشَاءَ اللّٰہُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَ قُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ

ترجمہ: مشکوٰۃ کے باب الاسامی میں لکھا ہے کہ شرح السنۃ میں ذکر کیا کہ نقل کیا حذیفہ نے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ یوں نہ بولا کرو جو چاہے اللہ اور محمدؐ اور بولا کرو جو چاہے اللہ فقط۔

یعنی جو کہ اللہ کی شان ہے اور اس میں کسی مخلوق کو دخل نہیں سو اس میں اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو نہ ملاوے گو کہ کتنا ہی بڑا ہو اور کیسا ہی مقرب۔ مثلاً یوں نہ بولے کہ اللہ و رسول چاہے گا تو فلانا کام ہو جاوے گا کہ سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے۔

۱۹۔ اَخْرَجَ التِّرْمِذِیّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہُ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یقولُ مَنْ حَلَفَ بِغَیرِ اللّٰہِ فَقَد اَشْرَکَ

ترجمہ: مشکوٰۃ کے باب الایمان والنذور میں لکھا ہے کہ ترمذی نے ذکر کیا کہ نقل کیا ابن عمر نے کہ سنا میں نے پیغمبرِ خدا سے کہ فرماتے تھے کہ جس نے قسم کھائی غیر اللہ کی سو بے شک شرک کیا۔

ب: مشکوٰۃ کے باب الایمان والنذور میں لکھا ہے کہ مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا عبدالرحمٰن نے نے پیغمبرِ خدا نے فرمایا کہ نہ قسم کھایا کرو جھوٹے معبودوں کی اور نہ باپ دادوں کی۔

ج: مشکوٰۃ کے باب الایمان والنذور میں لکھا ہے کہ بخاری اور مسلم نے ذکر کیا کہ ابن عمرؓ نے نقل کیا کہ پیغمبرِ خدا نے فرمایا کہ اللہ منع کرتا ہے تم کو باپ دادوں کی قسم کھانے سے جس کو قسم کھانا ہو سو اللہ ہی کی قسم کھاوے یا چپ رہے۔

۲۰- مشکوٰۃ کے باب النذور میں لکھا ہے کہ ابو داؤد نے ذکر کیا کہ ثابتؓ نے نقل کیا کہ ایک شخص نے منت مانی پیغمبرِ خدا کے وقت میں کہ ذبح کرے اونٹ ایک مقام میں کہ اس کا نام بُوانہ تھا۔ پھر آیا پیغمبرِ خدا کے پاس اور خبر دی ان کو۔ سو فرمایا پیغمبرِ خدا نے کہ کیا تھا اس میں کوئی تھان کفر کے وقت کا کہ پوجتے ہوں لوگ۔ کہا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ وہاں کوئی تہوار ہوتا تھا ان کا۔ لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ تو پوری کر منت اپنی کیونکہ نہ پوری کیا چاہیئے ایسی منت کہ اس میں کچھ اللہ کا گناہ ہو یعنی اللہ کے سوا کسی اور کی منت ماننی گناہ ہے۔ سو ایسی منت کو پورا کرنا نہ چاہیئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اوّل تو اللہ کے سوا کسی اور کی منت نہ مانئے اور جو مانی ہو پورا نہ کیجئے۔ کیونکہ یہ بات خود گناہ ہے۔ پھر اس پر ہٹ کرنا اور زیادہ گناہ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس جگہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور چڑھاتے ہوں یا پوجا کرتے ہوں یا اور کسی طرح کا وہاں جمع ہو کر شرک کرتے ہوں وہاں اللہ کے نام کا بھی جانور نہ لے جائے اور کسی طرح ان میں نہ شریک ہو جئے۔ نہ اچھی نیت سے نہ بُری نیت سے کہ ان سے مشابہت کرنی خود بری بات ہے۔

۲۱- اَخْرَجَ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

لَا یَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ عَبْدِیْ وَ اَمَتِیْ کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ وَکُلُّ نِسَاءِکُمْ اِمَاءُ اللّٰہِ وَ لَا یَقُوْلُ الْعَبْدُ لِسَیِّدِہٖ مَوْلَایَ فَاِنَّ مَوْلٰکُمُ اللّٰہُ:

ترجمہ: مشکوٰۃ کے باب الاسامی میں لکھا ہے کہ مسلم نے ذکر کیا، ابوہریرہؓ نے نقل کیا کہ پیغمبرِ خدا نے فرمایا کہ کوئی تم میں سے یوں نہ بولے کہ میرا بندہ اور میری بندی تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں اللہ کی بندی ہیں اور غلام بھی اپنے میاں کو یوں نہ کہے کہ میرا مالک کیونکہ تم سب کا مالک اللہ ہے۔

یعنی میاں اپنے غلام و لونڈی کو اپنا بندہ اور بندی نہ کہے اور غلام اپنے میاں کو اپنا مالک نہ کہے کیونکہ مالک اللہ ہے اور باقی سب اسی کے بندے ہیں نہ ایک دوسرے کا بندہ ہے نہ مالک۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کسی کا حقیقت میں غلام ہے سو وہ بھی آپس میں یہ گفتگو نہ کریں۔ یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا مالک۔ پھر جھوٹ موٹ کا بندہ بننا اور عبد النبی اور بندہ علیؓ اور بندہ حضور اور پرستارِ خاص اور امر پرست اور آشنا پرست اور پیر پرست اپنے تئیں کہلوانا اور ہر کسی کو خداوند، خدائیگاں، دانا کہہ بیٹھنا تو محض بے جا ہے اور نہایت بے ادبی اور ذرا سی بات میں کہنا کہ تم ہماری جان و مال کے مالک ہو ہم تمہارے بس میں ہیں جو چاہو کرو محض جھوٹ ہے اور شرک کی بات۔

۲۲- اَخْرَجَ الشَّیْخَانِ عَنْ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔

ترجمہ: مشکوٰۃ کے باب المفاخرۃ میں لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ نے نقل کیا کہ پیغمبرِ خدا نے فرمایا کہ مجھ کو حد سے مت بڑھاؤ جیسا کہ عیسٰی ابن مریم کو نصاریٰ نے حد سے بڑھا دیا۔ سو میں تو اسی کا بندہ ہوں۔ سو یہی کہو

کہ اللہ کا بندہ ہے، اور اس کا رسول۔

یعنی جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں سو بیان کرو۔ وہ رسول کہہ دینے میں آجاتے ہیں۔ کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں اور سارے مراتب اس سے نیچے ہیں۔ مگر آدمی رسول ہو کر بھی آدمی ہی رہتا ہے اور بندہ ہی ہونا اس کا فخر ہے۔ کچھ اس میں خدائی کی شان نہیں آجاتی اور خدا کی ذات میں نہیں مل جاتا۔ سو یہ بات کسی بندہ کے حق میں نہ کہا چاہیئے کہ نصاریٰ ایسی ہی باتیں حضرت عیسیٰ کے حق میں لکھ کر کافر ہو گئے اور اللہ کی راہ سے راندے گئے۔ سو اسی لیے پیغمبر خدا نے اپنی امت کو فرمایا کہ تم نصاریٰ کی چال نہ چلو اور اپنے پیغمبر کی تعریف میں حد سے مت بڑھو کہ نصاریٰ کی طرح کہیں مردود نہ ہو جاؤ۔ لیکن افسوس کہ ان کی امت کے بے ادب لوگوں نے ان کا حکم نہ مانا اور آخر نصاریٰ کی سی باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ کو یہی کہتے تھے کہ اللہ ان کے بھیس میں ظاہر ہوا اور وہ ایک طرح سے انسان ہیں اور ایک طرح سے خدا۔ سو بعینہٖ یہی بات بعضوں نے حضرتؐ کی شان میں کہہ ڈالی بلکہ بعضے جھوٹے دغا بازوں نے اس بات کو خود پیغمبر خدا کی طرف نسبت کیا ہے کہ انہوں نے خود فرمایا ہے اَنَا اَحْمَدُ بِلَا مِیْم اور اسی طرح ایک بڑی سی عبارت عربی کی بنا کر اس میں ایسی ایسی خرافاتیں جمع کر کے اس کا نام خطبۃ الافتخار رکھا ہے۔ اور اس کو حضرت مرتضیٰ علیؓ کی طرف نسبت کیا ہے ــــ سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ اللہ سارے جھوٹوں کا منہ کالا کرے اور جس طرح نصاریٰ کہتے تھے کہ سارے کاروبار اس جہان کے اور اُس جہان کے حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہیں اور جو کوئی انکو مانے اور ان کی التجا کرے اس کو بندگی کی کچھ حاجت نہیں اور کچھ گناہ اس کو خلل نہیں کرتا اور کچھ حرام و حلال کا اس کے حق میں امتیاز کرنا ضرور نہیں۔ وہ خدا کا سانڈھ بن جاتا ہے جو چاہے سو کرے۔ حضرت عیسیٰؑ آخرت میں اس کو شفاعت سے بچالیں گے۔ سو اسی طرح کا عقیدہ جاہل مسلمانوں کو حضرت

پیغمبر کی جناب میں ہے۔ بلکہ ان سے اُتر کر اماموں کی اور اولیاء کی بلکہ ہر ملّا مشائخ کی جناب میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ ہدایت کرے۔

۲۳۔ مشکوٰۃ کے باب التصاویر میں لکھا ہے، بخاری نے ذکر کیا، بی بی عائشہ رضؓ نے نقل کیا کہ انہوں نے خریدا ایک غالیچہ کہ اس میں تصویریں تھیں۔ پھر جب اس کو دیکھا پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور اندر نہ گئے۔ سو پہچانی میں نے ان کے چہرے پر ناخوشی۔ کہا مَیں نے یا رسول اللہ میں توبہ کرتی ہوں اللہ اور اللہ کے رسول کے روبرو کیا گناہ کیا میں نے؟ سو پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کیسا ہے یہ غالیچہ؟ کہا میں نے آپ کے لئے خریدا ہے کہ اس پر بیٹھو اور اس کا تکیہ بناؤ۔ سو پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ ان تصویر دل والے قیامت کے دن عذاب میں پھنسیں گے اور کہا جائے گا ان کو کہ جان ڈالو اس چیز میں کہ بنائی تم نے اور فرمایا کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے اس میں فرشتے نہیں آتے۔ یعنی اکثر مشرک مورتوں کو پوجتے ہیں۔ سو اس لئے فرشتوں کو تصویروں سے گھن آتی ہے، اور پیغمبروں کو بھی ان سے نفرت ہے اور ان کے بنانے والوں پر عذاب ہوگا کہ بت پرستی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے جاہل لوگ پیغمبر کے یا اماموں کے یا اولیاء کے یا اپنے پیروں کی تصویروں کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے پاس برکت کے لئے رکھتے ہیں سو محض گمراہ ہیں اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پیغمبر اور فرشتے ان سے بیزار ہیں۔ بلکہ سب تصویروں کو ناپاک سمجھ کر گھر سے دور کیجئے کہ پیغمبر بھی خوش ہوں اور فرشتے بھی اس گھر میں آویں اور ان کے قدم سے گھر میں برکت پھیل جاوے۔

۲۴۔ وَاَخْرَجَ رَزِیْنٌ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِنِّیْ لَا اُرِیْدُ اَنْ تَرْفَعُوْنِیْ فَوْقَ مَنْزِلَتِیَ الَّتِیْ اَنْزَلَنِیْھَا اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا مُحَمَّدٌ

ابْنُ عَبْدِ اللّٰہِ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔

(ترجمہ) مشکوٰۃ کے باب المفاخرت میں لکھا ہے کہ رزین نے ذکر کیا کہ انسؓ نے نقل کیا کہ فرمایا پیغمبرؐ خدا نے کہ بے شک میں نہیں چاہتا کہ بڑھا دو تم مجھ کو زیادہ اس مرتبہ سے کہ اللہ نے بخشا ہے مجھ کو۔ سو میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبداللہ کا کہ اللہ کا بندہ ہی ہوں اور اس کا رسول۔

یعنی جیسے اور سردار اپنی تعریف میں مبالغہ کرنے سے خوش ہوتے ہیں سو پیغمبر ان سے نہ تھے کیونکہ اور سرداروں کو کچھ ان مبالغہ کرنے والوں کے دین سے کچھ کام نہیں ہوتا۔ خواہ درست رہے یا بگڑ جاوے اور پیغمبرؐ خدا تو اپنی امت کے بڑے مربی شفیق تھے اور ان پر بہت مہربان اور رات دن ان کو اپنی امت کے دین ہی کو درست کرنے کا فکر تھا۔ سو جب انہوں نے معلوم کیا کہ میری امت کے لوگ مجھ سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور بہت احسان مند اور یہ دستور ہے کہ جب کسی کو کسی سے بہت محبت ہوتی ہے تو اپنے محبوب کے خوش کرنے کو اس کی تعریف میں حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور جو کوئی پیغمبروں کی تعریف میں حد سے بڑھے گا تو خدا ہی کی بے ادبی کرے گا۔ اور اس سے بالکل اس کا دین برباد ہو جائے گا۔ اور پیغمبر کا اصل دشمن بن جاوے گا۔ سو اسی لئے فرمایا کہ مجھ کو یہ مبالغہ خوش نہیں آتا۔ سو میرا نام محمدؐ ہے نہ خالق نہ رازق اور سب آدمیوں کیطرح اپنے باپ ہی سے پیدا ہوا ہوں اور بندہ ہی ہونا میرا فخر ہے۔ مگر اور سب لوگوں سے میرا امتیاز مجھ کو یہی ہے کہ اللہ کے احکام سے میں واقف ہوں اور لوگ غافل۔ سو ان کو اللہ کا دین مجھ ہی سے سیکھنا چاہیئے۔ سو اے مالک ہمارے اپنے ایسے پیغمبر رحیم و کریم پر ہزاروں درود و سلام بھیج اور انہوں نے جیسا ہم سے جاہلوں کو دین کے سکھانے میں حد سے زیادہ کوشش کی سو تو ہی اس کی کوشش کی قدردانی کر کہ ہم تو ایک عاجز بندے ہیں محض بے مقدور ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

دین وسیاست کی علیٰحدگی

دین اس طرزِ زندگی کا نام ہے جو انسان کسی کی اطاعت کر کے اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کو حاکم تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کر لیتا ہے تو اس کے احکام اور مقرر کئے ہوئے ضابطے اس کا قانون اور شریعت بن جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم تسلیم کر کے اس کی رعایا بن جاتا ہے تو اس کے احکام کی اطاعت بندگی یا عبادت بن جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے احکام کو چھوڑ کر کسی بادشاہ یا دنیوی حاکم کی اطاعت کر رہا ہے تو وہ گویا اس کی بندگی کر رہا ہے اور خدا کی بندگی اس وقت شمار ہو گی جب وہ حاکم اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرے، اور اپنے بنائے قانون نہ چلائے۔ اسے اپنے قانون بنانے کا اختیار اسی حد تک ہو گا جس حد تک شریعت اسے اجازت دے گی۔ کسی شخص کے دو دین نہیں ہو سکتے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ایک شخص خدا کو حاکم مان کر اس کی اطاعت کا دم بھرے اور شریعت کے خلاف کسی بادشاہ کے بنائے ہوئے قوانین پر بھی عمل کرے۔ یہ دو متضاد باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر کوئی شخص اذان سن کر مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتا ہے اور مسجد سے باہر تمام معاملات، تجارت، لین دین، معیشت، معاشرت عدالتی نظام اور دوسرے کاروبار میں کسی دنیوی حاکم یا اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو وہ خدا کی اطاعت اور بندگی کے دعوے میں جھوٹا ہے۔ ایسا کرنا نفاق کی علامت ہے۔ محض عقیدے اور نظریے میں خدا کو اپنا حاکم تسلیم کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہر دین کو اپنی کامل صورت میں جلوہ گر ہونے کے لئے اقتدار اور حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا سے منحرف ہو کر جمہوری حکومت کے قوانین کی پابندی کرتا ہے تو اس کا دین خدائی دین نہیں جمہوری دین ہے۔ اگر کوئی بادشاہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا دین بادشاہی دین تو ہو سکتا ہے خدائی دین نہیں ہو سکتا اگر کوئی اشتراکی فلسفے کے تحت قائم شدہ حکومت کی پابندی کرتا ہے تو اس کا دین اشتراکی تو ہو سکتا ہے خدائی دین ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کوئی دین بھی کسی دوسرے دین کے ساتھ اشتراک قبول کر کے خالص نہیں رہ سکتا۔ اگر دین جمہوری ہو تو بادشاہی نہیں۔ اگر بادشاہی ہو تو جمہوری نہیں ہو سکتا اگر اشتراکی ہو تو جمہوری یا بادشاہی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر دین خدائی ہو تو اشتراکی، جمہوری، بادشاہی یا کوئی اور دین نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ پاک میں اس خالص دین کی پیروی کا یوں حکم دیا گیا ہے:

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ

(ترجمہ) لوگوں کو اس کے سوا کسی بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ سب طرف سے منہ موڑ کر اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی عبادت کریں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

(ترجمہ) حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ مسلمان ایسے معاشرے میں رہ رہا ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ حاصل نہ ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کو بدلنے کے لئے کوشش کرے کیونکہ حکومت و اقتدار میں اللہ کے قوانین کو بالادستی حاصل نہ ہونے کی مثال

ایسے ہی ہے جیسے آپ مکّہ معظّمہ جانا چاہتے ہوں اور کسی ایسی موٹر گاڑی میں بیٹھ جائیں جو ترکستان جا رہی ہو۔ اس گاڑی میں آپ بیٹھے بیٹھے نمازیں پڑھتے رہیں اور درود و وظائف جاری رکھیں، روزے رکھتے رہیں اور یہ سمجھیں کہ آپ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے تو یہ آپ کی خام خیالی ہوگی۔ آپ اپنی منزل پر ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ جو ڈرائیور اس گاڑی کو چلا رہا ہے اس کو ہٹائیں اور کسی ایسے آدمی کو ڈرائیور مقرر کریں جو گاڑی کا رُخ موڑ کر اسے آپ کی منزل کی طرف رواں کر دے۔

قرآن پاک میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

(ترجمہ) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ شرک کرنیوالوں کو ایسا کرنا کتنا ہی ناگوار گزرے۔

چنانچہ آپؐ نے محض عبادات کا ہی طریقہ نہیں بتایا بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی فرمائی۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم صرف نماز کے لئے امام نہ تھے بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ اور قائد بھی تھے۔ آپؐ بشیرؐ بھی تھے اور نذیرؐ بھی۔ آپؐ نے چوری کی برائیاں بیان کر کے لوگوں کو صرف وعظ و تلقین کے ذریعے چوری سے منع نہیں کیا بلکہ چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ قتل کے گناہ کی صرف مذمّت نہیں کی بلکہ قاتل کے قتل کا بھی حکم صادر فرمایا۔ زنا کو صرف کبیرہ گناہ کہہ کر اس سے باز رہنے کی تلقین نہیں کی بلکہ اس کے مرتکب افراد پر حدود بھی جاری کیں۔ زکوٰۃ اور عشر کی ادائیگی کی نصیحت ہی نہیں کی بلکہ باقاعدہ طور پر اس کی وصولی بھی کی۔

دین کو غلبہ قوّت و اقتدار کے ذریعے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے ذریعے حکومت کا نظام چلایا جائے اور اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا قانون کس مپرسی کے عالم میں رہے تو کوئی بھی ذی عقل یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ اللہ کا دین غالب ہو گیا ہے۔ دینِ اسلام کا سب سے بڑا مقصد انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں دینا ہے۔ انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنا ہے۔ اس جمہوری اور مہذّب دور میں بھی انسان انسان کی غلامی سے آزاد نہیں ہوا۔ اس وقت صاحب اقتدار لوگ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند تر مخلوق سمجھتے ہیں وہ اپنے آپ کو حاکم اور عوام کو محکوم خیال کرتے ہیں۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں خلیفہ کی ناراضگی نہ تو کسی کو کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی نہ اس کی دوستی کسی کو قانون سے الگ کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی آج کسی مجسٹریٹ یا پولیس افسر کو ناراض کر کے دیکھیے وہ آپ کے کس بل نکال دے گا۔ آپ مجرم ہوں یا نہ ہوں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں گے۔ یہ تو خیر افسروں کی بات ہے، محکمہ بجلی کے کسی معمولی ملازم، تحصیل کے کسی چپراسی یا عدالت کے کسی اہل کار کو ناراض کر کے دیکھیے اور پھر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی حکمرانی کے مزے چکھیے! ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے !!
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اسلام اس قسم کے رویّے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ حرّیت و مساوات کی فضا قائم کر کے شرفِ انسانیّت کو بحال کرتا ہے۔ اسلام کی یہ شان و شوکت صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جبکہ مسجدوں سے لے کر حکومت کے ایوانوں تک اسی کا بول بالا ہو۔

اسلام میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ دین اور سیاست کی علیٰحدگی کا نظریہ عیسائیوں کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قیصر کا حق قیصر کو اور خدا کا حق خدا کو دو۔ اسلام میں قیصر خدا کا ہی حق وصول کرنے کے لئے مقرر ہوتا ہے — عیسائیت میں بھی دین و سیاست کی حقیقی علیحدگی چار پانچ صدیاں قبل ہوئی ورنہ برطانیہ میں کلیسائی نظام کو اس قدر برتری حاصل تھی کہ کوئی قانون اس وقت تک قابل عمل نہیں ہوتا تھا جب تک اسے پوپ کی باقاعدہ منظوری حاصل نہ ہو جاتی تھی حتیٰ کہ بادشاہ اپنے طور پر اپنی بیوی کو طلاق تک دینے کا مجاز نہ تھا۔ یہ اسی افراط و تفریط کا نتیجہ تھا کہ بادشاہت نے کلیسا کا جوا اپنی گردن سے اتار دیا اور بادشاہت کو کلیسائی نظام سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ اسلام میں کسی انسان پر کسی مذہبی پیشوا یا بادشاہ کا حکم نہیں چلتا بلکہ خدا کا حکم چلتا ہے۔ اس لئے یہ ایک اعتدال پسند دین ہے جس میں افراط و تفریط کی کوئی گنجائش نہیں۔

اسلام میں جو بھی صاحب اقتدار ہوتا ہے، خدا کے نام پر حکومت کرتا ہے۔ اسی کے احکام جاری کرتا ہے، اس کی اپنی حیثیت ایک نائب کی سی ہوتی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے عمّال اپنے اپنے صوبوں یا شہروں میں حاکم بھی ہوتے تھے اور امام اور خطیب بھی ہوتے تھے وہ فیصلے بھی کرتے تھے اور نمازوں کی امامت بھی کراتے تھے۔ وہ خطبہ بھی دیتے تھے اور احکام بھی جاری کرتے تھے۔ انسان کی اپنی اغراض ہوتی ہیں۔ اس کے وضع کردہ قوانین میں اس کی اغراض اور مفادات کا شامل ہو جانا لازمی امر ہے۔ ایک بادشاہ قانون کے ذریعے اپنی بادشاہت کو مستحکم کرنے کے لئے قانون بنائے گا۔ ایک سرمایہ دار آدمی سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ فراہم کرے گا۔ وہ ایسے قوانین وضع کرے گا جس سے دولت دولت مندوں کے پاس جمع ہوتی رہے۔ اس کی اپنی تجوریاں بھرتی رہیں۔ خواہ غریبوں کا استحصال ہی کیوں نہ ہوتا رہے۔ ایک جاگیردار ایسے قوانین وضع کرے گا جن سے جاگیرداری عوام پر مسلط رہے۔ برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ ہر قسم کی خواہشات

سے پاک ہے۔ اس کی کوئی برادری اور رشتے داری نہیں کہ وہ ان کو فائدہ پہنچانے کے لئے قانون بنائے گا۔ ساری مخلوق اس کا کنبہ ہے اس لئے اس کا قانون سب کے لئے یکساں ہوگا۔ وہ محتاج نہیں کہ کسی قانون کے ذریعے اپنے خزانے بھرنے کی کوشش کرے۔ وہ زمین و آسمان کے سب خزانوں کا مالک ہے۔ وہ عالم الغیب ہے۔ انسان کی فطرت سے آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون سا قانون انسانوں کے لئے ہر قسم کے حالات میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر اس کا دیا ہوا آئین نافذ نہ ہو اور کسی انسان یا انسانوں کے کسی ادارے کا اپنی مرضی سے بنایا ہوا آئین جاری ہو تو اس میں ظلم و جور، جبر و ستم اور استحصال و ناانصافی کے عناصر کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں۔ اللہ تعالےٰ کے آئین کے سوا دنیا میں ایسا کوئی آئین ہو ہی نہیں سکتا جو تمام انسانوں کے لئے یکساں حقوق کا علم بردار ہو۔ جس میں کسی طبقے کا استحصال نہ ہو، کسی کے حق میں مفید اور کسی کے غیر مفید نہ ہو۔ امن و آشتی اور عدل و انصاف کی فضا صرف اللہ تعالےٰ کی حاکمیت قائم کر کے ہی مہیا کی جا سکتی ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جنت کے نوجوانوں کے سردار تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی اگر وہ کسی بڑی قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار نہ بھی کرتے تو ان کے پاکیزہ اعمال انہیں جنت میں بلند مقامات تک پہنچانے کے لئے کافی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کے نوجوانوں کے سردار ہونے کی بشارت دے دی تھی۔ آپ مدینے میں رہ کر مسجد نبوی میں نماز ادا کر کے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل کر سکتے تھے۔ مکے میں مسجد حرام میں نماز پڑھ کر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن آپ یہ سب کچھ چھوڑ کر دین کی بالادستی قائم کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ حالانکہ یزید نہ تو کافر ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ جنگ ضروری ہو گئی تھی نہ اس نے مسلمانوں پر نماز روزے کی ادائیگی

پر پابندی لگادی تھی، نہ اس نے مسلمانوں کو زکوٰۃ اور حج کے فریضے کی ادائیگی سے منع کر دیا تھا اور نہ ہی اس نے تسبیح و مناجات اور اللہ اللہ کرنے پر کوئی قدغن لگائی تھی۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یزید کے نظامِ حکومت میں جو تبدیلی آئی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے کی بجائے اپنی حاکمیت قائم کر لی تھی۔ مسلمانوں کے بیت المال کو جو سربراہِ مملکت کے پاس امانت کے طور پر ہوتا ہے اس نے اپنا نجی خزانہ قرار دے لیا تھا۔ اور اسے اپنی مرضی سے فضول خرچیوں اور بے جا تصرّف میں اڑانے لگا تھا۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بیت المال میں جو کچھ آتا تھا وہ اسلامی قانون کے تحت آتا تھا اور اسلام ہی کی ہدایات کے مطابق خرچ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اس زمانے میں ایک آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ سب کے سامنے خلیفۂ وقت سے پوچھ سکتا تھا کہ مین سے جو چادریں آئی ہیں وہ سب کے حصّے میں ایک ایک آئی ہے اور ایک چادر سے اتنا لمبا کرتہ نہیں بن سکتا۔ آپ نے کیسے بنالیا؟ ان کے زمانے میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہ تھا۔ انصاف کے معاملے میں کسی سے کوئی امتیازی سلوک نہ ہوتا تھا۔ خلیفۂ وقت کو بھرے مجمع میں ایک بدّو کھڑے ہو کر کہہ دیتا تھا کہ اگر آپ سیدھے چلتے رہے تو ہم آپ کی اطاعت کریں گے لیکن اگر آپ نے کجروی اختیار کی تو اس تلوار کے ذریعے آپ کی کجی نکال دیں گے۔ خلیفۂ وقت کی ناراضگی نہ تو کسی کے لئے مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی تھی اور نہ اس کی رضا کسی کے لئے انعام و اکرام کی بارش کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ سب کے سب یکساں طور پر ایک ہی آئین کے پابند تھے۔

بادشاہت آئی تو عوام سے اظہارِ رائے کی آزادی کا حق چھین لیا گیا۔ امرا و وزرا تو ایک طرف بادشاہوں کے لونڈی غلام تک قانون سے بالاتر ہو گئے۔ بادشاہ کی ناراضگی مصیبت کا پیش خیمہ اور اس کی رضا انعام و اکرام کے حصول کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح لوگوں میں حق گوئی و بے باکی کی جگہ خوشامد، پست ہمتی، بزدلی اور مصلحت پرستی جیسی اخلاقی

خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ اس صورت حال کو صرف دو لفظوں دین و سیاست کی علیحدگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب نظر آدمی گاڑی کا رخ بدلتے ہی بھانپ جاتا ہے کہ اب یہ کس سمت جانے والی ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے امّتِ مسلمہ کو پیش آنے والے حالات کا اندازہ یزید کی اس روش سے لگا لیا تھا جس کی وجہ سے آپ اس کے مقابلے میں نکل آئے اور جان و مال کی ایسی قربانی پیش کی کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کا اندازہ کچھ غلط نہ تھا بعد میں سفاکی و بربریت کا جو دور شروع ہوا اس کی ابتدا یزید ہی کے عہد میں ہوئی تھی۔ حجّاج بن یوسف ثقفی کے نام سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ وہ مسلمان بھی تھا، نمازیں بھی پڑھتا تھا لیکن دین و سیاست کی علیحدگی کا نتیجہ تھا کہ وہ اتنا سفاک اور ظالم ثابت ہوا کہ جس نے بھی اس کی مرضی کے خلاف بات کی اسے اس نے قتل کرا دیا۔ جس کو چاہا انعام و اکرام سے نوازا اور جس کو چاہا جیل میں بند کر دیا۔ جب وہ مرا تو ہزاروں بے گناہ آدمی جیلوں میں بند تھے۔ زندگی میں اس کی تلوار ہمیشہ انسانی خون کی پیاسی رہی۔ بغیر مقدمہ چلائے معمولی معمولی باتوں پر اس نے ہزاروں آدمیوں کو تہ تیغ کیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بجا طور پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے آئین کی بالادستی قائم کرنے نکلے تھے۔ یہ ان کی ذاتی سوچ نہ تھی بلکہ قرآن حکیم کی تعلیم کا تقاضا ہی یہ تھا ؎

تیغ بہر عزّتِ دیں است و بس
مقصدِ او حفظِ آئین است و بس
ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملّتِ خوابیدہ را بیدار کرد
رمزِ قرآں از حُسین آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

تلوار بس دین کی عزت کے لیے ہے اس کا مقصد آئین کی حفاظت کرنا ہے۔ مسلمان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھکتا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے خون نے ان رازوں کی تشریح کی اور سوئی ہوئی ملّت کو بیدار کیا۔ ہم نے قرآن کی رمز حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے سیکھی اور اس کی آتش سے شعلے جمع کیے۔

اگر سیاست کو دین سے جدا کر دیا جائے تو صرف چنگیزیت اور بربریت باقی رہ جاتی ہے۔ صاحبِ اقتدار جس پر چاہتا ہے اپنے بنائے ہوئے قانون کے ذریعے ظلم و جور کے دروازے کھول لیتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ کے آئین سے آزادی حاصل کر لیتا ہے وہ اپنی راہ میں مزاحم ہونے والے کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر مروّجہ قانون اجازت نہ بھی دے تو وہ ایسا قانون وضع کر لیتا ہے۔ جس کے ذریعے جس بے گناہ کو چاہے قانون کے شکنجے میں جکڑ کر اس کی آزادی سلب کر لے۔ یہ بات کسی مطلق العنان حکمران تک ہی محدود نہیں بلکہ جمہوری اداروں میں برسر اقتدار پارٹیاں اپنی اکثریت کے بل پر جس قسم کے قوانین چاہتی ہیں بنا لیتی ہیں۔ ان ناانصافیوں کا واحد حل سیاست کو دین کے تابع کرنے میں مضمر ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو ——!
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پابندِ دین سیاست میں اللہ تعالےٰ کی فرمانروائی قائم ہوتی ہے اور لادین سیاست میں طاغوتی طاقتوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ فرمانروا اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جن کا اسلام کی بنیادی تعلیمات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر اسے اسلامی اصولوں سے قطع نظر مختلف طبقات کو خوش کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ہر ذریعے سے انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی عورتوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی آزادی اور حقوق کا ڈھونگ رچاتا ہے، کبھی جاگیرداروں کو

مراعات دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ کبھی سرمایہ داروں کو ساتھ ملانے کے لئے ان کی خواہش کے مطابق قوانین بناتا ہے کبھی مزدوروں کا اعتماد حاصل کرتا ہے کبھی کسانوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس طرح یہ طبقات بھی جب دیکھتے ہیں کہ قانون میں اتنی لچک موجود ہے کہ ہلڑ بازی کے ذریعے اپنا ہر جائز ناجائز مطالبہ منوایا جاسکتا ہے تو ضرورت پڑنے پر وہ یہ حربہ بھی استعمال کر گزرتے ہیں ۔ اگر عوام کو علم ہو کہ ملک کا آئین کسی فرد واحد کا بنایا ہوا نہیں بلکہ کتاب و سنّت کی روشنی میں بنایا ہوا جمہوری آئین ہے اور کوئی شخص اسے اپنی مرضی سے تبدیل کرنے کا مجاز نہیں تو اوّل تو وہ ایسا تجربہ کریں گے ہی نہیں اگر کرینگے تو انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا ۔ صاحبِ اقتدار، اقتدار تو چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ کسی بنیادی قانون میں تبدیلی کر کے کوئی ناجائز مطالبہ پورا نہیں کر سکتا ۔ اس طرح مستقل اسلامی آئین ملکی اور قومی استحکام میں مددگار ثابت ہو گا ۔

لادین سیاست و اقتدار میں جس کا بھی عمل دخل ہو جائے وہ چند دن خوب عیش کرتا ہے اپنے لئے دولت کے انبار جمع کرتا ہے ۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے اور حکمران کی اپنے اقتدار کو طول دینے کی خواہش سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے ۔ حکمران یہ جانتے ہوئے کہ اس کا فلاں گورنر یا فلاں حاکم فلاں فلاں خرابیوں میں مبتلا ہے چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا ۔ اس طرح اس کی سیاست اخلاقی اصولوں سے خالی شیطان کی تابع ہو کر رہ جاتی ہے ۔ آہستہ آہستہ حکمرانوں کے ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں اور وہ جن لوگوں کو بھی اپنی راہ کا روڑا سمجھتے ہیں انہیں اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے کمینہ سے کمینہ حرکت بھی کر گزرتے ہیں ۔ ان کی شیطانی کرتوتوں سے اصل پردہ اس وقت اٹھتا ہے جب وہ اقتدار سے الگ ہوتے ہیں ۔ جب تک وہ اقتدار میں رہتے ہیں پروپیگنڈے اور خوش آمدیوں کے ذریعے اپنی ذلیل حرکتوں پر پردہ ڈالے رکھتے ہیں، اپنے خود ساختہ قوانین کے بل بوتے پر حکومت کرتے رہتے ہیں ۔ نہ ان کے

دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ عوام کے محاسبے کا ڈر۔ خدا اور عوام کے سامنے جواب دہی کا ڈر صرف پابند دین سیاست سے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ الغرض لادین سیاست سراپا کمینگی اور شیطان کی لونڈی ہوتی ہے ؎

جو حق بات ہو مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیزِ اہرمن، دوں نہاد و مردہ ضمیر

بعض لوگ لادین سیاست کو پابندِ دین اور مہذّب بنانے کے لیے کوشش کرنے کی بجائے اس سے دور رہنے میں ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاست میں حصّہ لینا شریف آدمیوں کا کام نہیں۔ یہ ایک گندہ کھیل ہے جس سے سوائے آلودگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ سیاست کا میدان طاغوتی طاقتوں کی رزم آرائیوں کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ عوام کے سامنے پاکیزہ سیاست کی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی اس لئے وہ یہ سمجھنے پر مجبور رہتے ہیں کہ بس دھوکہ دہی، کذب بیانی، ہراساں کرنے، دھونس جمانے، جھوٹے وعدے کرنے تحریص و ترہیب اور ہیرا پھیری کے ذریعے عوام کا اعتماد حاصل کرنے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے وعدوں کو فراموش کر کے اقتدار کے نشے میں مست ہو جانے کا نام سیاست ہے۔ جہاں تک موجودہ صورتِ حال کا تعلق ہے سیاست کے اس نقشے میں کوئی رنگ آمیزی نہیں لیکن جو لوگ سیاست کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک کر کے دین کے تابع کرنے کے متمنّی ہوں ان کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ وہ عوام کے سامنے اخلاقی حدود کی پابندی کرتے ہوئے صدق و صفائی، محبّت و اخوّت، دیانت داری، صبر و تحمّل، راست بازی اور وعدوں کی پابندی کر کے سیاسی کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔ الزام تراشی کا جواب الزام تراشی سے نہ دیں۔ جھوٹے وعدے نہ کریں۔ اپنے اصولوں کے

علی الرغم کسی قسم کی سودے بازی نہ کریں اور ہر معاملے میں قرآن کی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کو سامنے رکھ کر عدل و انصاف کے تقاضے پورے کریں۔ اس قسم کے رویّے سے عوام پر یہ بات واضح ہو گی کہ اگر سیاست کو دین کا تابع کر دیا جائے تو زندگی میں کیسی بہاریں آتی ہیں۔

ہندو مت میں ذات پات کی تمیز شدّت سے کی جاتی ہے۔ مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری ہے۔ برہمنوں کے بغیر ہندو کوئی بھی مذہبی رسم ادا نہیں کر سکتے۔ ملک میں حکمرانی کسی کی بھی ہو، دوسری ذاتوں پر برہمنوں کی حکومت ہمیشہ قائم رہی ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو نیچ خیال کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ کوئی نیچ ذات کا آدمی انہیں چھو بھی لے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ناپاک ہو گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو دوسروں سے ہمیشہ برتر سمجھا ہے اور نیچ ذات کے لوگوں کو مذہبی علوم کے قریب نہیں آنے دیا۔ ہندوؤں میں برہمنوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے بڑے بڑے مصلح پیدا ہوئے۔ انہوں نے فاقے کر کر کے نفس کشی کی اور بڑے متبرک بننے کے بعد لوگوں کو اپنی طرف متوجّہ کیا لیکن وہ برہمنوں کے اس طلسم کو نہ توڑ سکے۔ مہاتما گاندھی نے اس غرض کے لئے مرن برت رکھا اور برہمنوں کے تفوّق کو ختم کرنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن وہ نہ چھوت چھات کے مرض کی شدّت میں کمی کر سکے اور نہ ہی برہمنوں کی برتری کو کم کر کے عام آدمی کی سطح پہ لا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعونوں کے دماغ سے فرعونیّت نکالنے کے لئے عصائے کلیمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر طاقت اور قوّت میسّر نہ ہو تو خالی وعظوں سے مکمّل اصلاح نہیں ہو سکتی۔ دین کوئی بھی ہو، جب تک اس کے پیچھے قوّتِ نافذہ موجود نہ ہو اس کی برتری قائم نہیں کی جا سکتی۔ وعظ و نصیحت کے ذریعے آپ چند آدمیوں کو راہِ راست پر لائیں گے لیکن حکومت غلط آدمیوں کے ہاتھوں میں ہو گی تو وہ پوری قوم کو غلط راہ پر ڈال دیں گے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹتا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ ایک خاندان کے نظام سے لے کر پورے ملک بلکہ پوری دنیا پر حکمرانی کے اصول اور قاعدے مقرر کرتا ہے۔ حکومت اور عوام کے فرائض کا تعین کرتا ہے اور ہر ایک کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں کام کرنے کی آزادی فراہم کرتا ہے۔ اسلام میں اصل حاکمیت اللہ تعالےٰ کی ہے۔ مسلمانوں کے خلیفہ یا امیر کی حیثیت نائب کی ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام و قوانین کو نافذ کرتا ہے، اور خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے عوام کے آرام و آسائش اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ حضرت عمرؓ رات کو مدینے کی گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کی تکالیف معلوم کر کے ان کا ازالہ کریں۔ یہ احساسِ ذمہ داری اس وجہ سے تھا کہ ان کا ایمان تھا کہ قیامت کے دن ان سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق سوال ہوگا۔

اگر سیاست سے دین کو الگ کر دیا جائے تو امیر و وزیر اپنے اپنے آرام و آسائش میں منہمک رہتے ہیں اور عوام کی آسائش کا خیال رکھنے سے غافل ہو جاتے ہیں۔ حرص و ہوس کے پجاری کبھی دوسروں کی خاطر تکلیف برداشت نہیں کرتے بلکہ اپنے عیش و آرام کی خاطر دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں۔

دین و سیاست کی علیحدگی ملک و ملّت کے لئے بہت بڑی نامرادی اور جدید تہذیب کی کج فہمی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا دیا ہوا آئین امیر غریب سب کے لئے یکساں عدل و انصاف کا اہتمام کرتا ہے لیکن اس آئین کو جاری نہ کیا جائے تو سماجی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے دروازے کھلتے ہیں اور ہر طاقتور کمزور کا استحصال کرنے لگتا ہے۔ اکثر اوقات حکومت کے کارپرداز ان جو احکام جاری کرتے ہیں ان میں یا تو ان کا اپنا مفاد ہوتا ہے یا کسی خاص طبقے کا، اس طرح اقربا پروری کی لعنت پروان چڑھتی ہے اور عام لوگ انصاف کے

حصول کے لئے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اسلامی آئین کی عدم موجودگی میں مساوات کا فقدان ہوتا ہے۔ حکومت میں عمل دخل والے لوگ اپنے جائز حقوق سے زیادہ مراعات حاصل کر لیتے ہیں اس طرح امیر اور غریب کا فرق بڑھتا جاتا ہے، دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے، حکومت میں اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ مجرموں کے پشت پناہ بن جاتے ہیں، اس طرح جرائم میں اضافہ ہوتا ہے، سفارش اور رشوت کا بازار گرم ہوتا ہے، دین کی پابندیوں سے آزاد حکومت کے عہدہ میں غیر اخلاقی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے، امرار و وزرا عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس کا اثر پوری قوم پر پڑتا ہے اور عوام بھی آہستہ آہستہ اسی روش پر چل پڑتے ہیں۔ قانون سازی کے وقت دینی تقاضوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف رسمی عبادات اور نجی معاملات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر قوم کے لیڈر محض دنیاوی رہنما نہ ہوں بلکہ وہ عالم فاضل اور متقی ہوں، عوام کی رشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے ہوں، زندگی کے ہر شعبے میں دین اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہو تو پوری قوم کے مزاج میں تبدیلی آجاتی ہے۔ حکمران طبقہ خود صادق اور امین ہو تو اس کے صدق و امانت کا اثر پورے معاشرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگ روحانی پیشوا کی عزت و تکریم اور اس کے احکام کی اطاعت دل و جان سے کرتے ہیں۔ اگر حکومت کے سربراہ دین پر عمل کرنے والے روحانی پیشوا بھی ہوں اور عوام کی ہر طرح کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں تو خدا خوفی، اخوت و محبت، ہمدردی، ایثار و قربانی اور نظم و ضبط کی جو فضا بنے گی اس کا تصور بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے ؎

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری۔
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

گیارہواں باب

روایاتِ ملّیہ

ہمارے اسلاف نے دینِ متین پر عمل کرتے ہوئے صبر و استقامت، ایثار و قربانی، جہاد، شوقِ شہادت، امانت و دیانت، عدل و انصاف، شجاعت و جواں مردی، اطاعتِ امیر، ایفائے عہد اور عزم و توکّل کی جو عمدہ روایات قائم کی ہیں وہ امّتِ مسلمہ کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ علّامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ان شاندار روایات کو یاد رکھنا اور انہیں مشعلِ راہ بنا کر زندگی بسر کرنا ہمارا فرض ہے۔ جو قوم اپنے اسلاف کے کارناموں اور روایات کو بھلا دیتی ہے وہ صحیح راستے سے بھٹک جاتی ہے۔ اور دوسری قوموں میں اپنے تشخص کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ذیل میں ان سینکڑوں روایات میں سے چند ایک کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- صبر و استقامت

جنگِ احد کے تقریباً چار ماہ بعد ماہ صفر ۴ھ میں عضل اور قارہ کے لوگ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارا گروہ اسلام لا چکا ہے لیکن ہم اسلامی احکام سے ناواقف ہیں۔ آپؐ ہمارے ساتھ کچھ آدمی روانہ کریں جو ہمیں دین کے احکام سکھائیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے کہنے پر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں دس آدمیوں کی ایک جماعت روانہ کر دی۔ جب یہ لوگ عسفان اور مکّہ کے وسط میں مقام رجیع پر پہنچے تو سوچی سمجھی سکیم کے مطابق ان غدّاروں نے قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دو۔ بنو لحیان کے دو سو آدمیوں نے جن میں سو ماہر تیر انداز تھے حملہ کر دیا۔ ان بزرگوں نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر پناہ لی۔ کفّار نے کہا کہ تم نیچے اتر آؤ ہم تمہیں امان دیتے ہیں۔ حضرت عاصمؓ نے کہا "میں کافر

کی پناہ میں نہیں آتا۔" چنانچہ انہوں نے پہلے کفار پر تیر چلائے، تیر ختم ہو گئے تو نیزہ سنبھال لیا، نیزہ بھی ٹوٹ گیا تو تلوار نکال لی اور آخرکار اپنے چند ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

حضرت خبیبؓ بن عدی اور زید بن دثنہ نے کافروں کے وعدے پر اعتماد کیا اور ٹیلے سے نیچے اتر آئے۔ لیکن کفار نے بدعہدی کی اور ان کی مشکیں کس کر مکہ لے گئے اور وہاں قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگِ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ اس لئے انہیں حارث کے بیٹوں نے اس غرض سے خرید لیا کہ باپ کے بدلے میں قتل کریں گے۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لئے قریش نے بڑا اہتمام کیا۔ حرم سے باہر ایک درخت پر سولی کا پھندا لگایا گیا۔ سولی چڑھانے کے مقررہ دن کی بڑی تشہیر کی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو سکیں۔ مقررہ دن آیا تو عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب یہ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ حضرت خبیبؓ کو مقتل کی طرف لایا گیا۔ قریش نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتاؤ۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ قریش نے مہلت دے دی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت خبیبؓ نے فرمایا "دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ یہ نہ کہیں کہ موت سے ڈر کر بہانہ ڈھونڈ رہا ہے نماز کو مختصر کر دیا ہے۔" چنانچہ آپ کو کفارِ مکہ کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ ایک سنگدل کافر نے نیزے سے آپ کے جگر کو چھیدا اور کہا "اب تم پسند کرتے ہو گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھنس جائیں اور تم چھوٹ جاؤ۔" حضرت خبیبؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "خدا کی قسم میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میری جان بچ جانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے۔" پھر ان سے کہا گیا اسلام چھوڑ دو تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر تمام دنیا کی سلطنت مجھے بخش دو تب بھی میں اسلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔" مشرکین نیزوں کے وار کرتے جاتے تھے اور اس قسم کے سوالات پوچھتے جاتے تھے۔ آخر عقبہ بن عامر نے گلے میں پھندا ڈالا اور شہید کر دیا۔

حضرت سعید بن عامرؓ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حمص کے گورنر تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ کبھی کبھی اچانک بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اور دیر تک بے ہوش رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا مجھے نہ کوئی مرض ہے نہ کوئی اور شکایت ہے۔ مکّہ میں جب حضرت خبیبؓ کو سولی پر چڑھایا گیا تھا تو میں اس مجمع میں موجود تھا۔ جس وقت مجھے حضرت خبیبؓ کے سولی چڑھنے کا منظر اور ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو کانپ کر بیہوش ہو جاتا ہوں۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں رومیوں کے ساتھ لڑائیوں میں حضرت عبداللہ بن حذیفہ کو رومیوں نے قید کر لیا۔ آپ نہایت وجیہہ و شکیل تھے۔ رومی بادشاہ کے سامنے جب آپ کو پیش کیا گیا تو بادشاہ نے کہا تم اپنا مذہب ترک کر کے نصرانی ہو جاؤ میں تمہیں بادشاہت میں حصّہ دوں گا اور اپنی بیٹی بھی تمہارے نکاح میں دے دوں گا۔ حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا اگر تم مجھے ساری بادشاہت دے دو اور یہ چاہو کہ میں آنکھ جھپکنے کے برابر وقت کے لئے بھی اپنے دین سے پھر جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔ بادشاہ نے کہا "پھر میں تجھے قتل کر دوں گا"۔ حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا "ہاں، یہ تجھے اختیار ہے"۔ بادشاہ کے حکم مطابق آپ کو صلیب پر چڑھا کر نیزوں سے آپ کا جسم چھلنی کر دیا گیا۔ ہر مرتبہ آپ سے کہا جاتا کہ اب بھی نصرانیت قبول کر لو۔ آپ ہر مرتبہ جواب دیتے ہرگز نہیں۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے سولی سے اتار لو اور پیتل کی دیگ خوب تپا کر آگ بنا کر لائی جائے۔ چنانچہ وہ پیش کی گئی تو بادشاہ نے ایک اور قیدی کے متعلق حکم دیا کہ انہیں اس میں ڈال دیا جائے۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس مسلمان صحابیؓ کا جسم دیگ میں پڑتے ہی جل گیا اور ہڈیاں نکل آئیں۔ بادشاہ نے پھر حضرت عبداللہ سے مخاطب ہو کر کہا "میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا حسین و جمیل نوجوان یوں موت کے منہ میں چلا جائے میرا کہنا مان لو اور ہمارا مذہب قبول کر لو ورنہ تمہیں اسی دیگ میں ڈال کر جلا دیا جائے گا"۔ آپ نے فرمایا "یہ ناممکن ہے کہ میں اپنے دین کو چھوڑ دوں"۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں چرخی پر چڑھا کر دیگ میں ڈال دیا جائے۔ جب انہیں دیگ میں ڈالنے جانے کے لئے چرخی پر اٹھایا گیا

تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بادشاہ نے جب آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو حکم دیا کہ رک جاؤ۔ اس کے بعد اس نے حضرت عبداللہ کو قریب بلا لیا۔ اسے امید تھی شاید اب وہ اپنا دین چھوڑ کر اس کی دامادی قبول کر لیں گے اور بادشاہت میں حصّہ دار بن جائیں گے لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ میری آنکھوں میں آنسو اس وجہ سے آئے تھے کہ میرے دل میں یہ خیال آگیا تھا کہ آج میری صرف ایک جان ہے جسے راہِ خدا میں قربان کر رہا ہوں۔ کاش میرے روئیں روئیں میں ایک جان ہوتی تو سب جانیں راہِ خدا میں قربان کر دیتا۔

بادشاہ نے جب آپ کا یہ استقلال دیکھا تو انہیں قید خانہ میں ڈال دیا اور کھانا پینا بند کر دیا۔ کئی دن کے بعد شراب اور خنزیر کا گوشت بھیجا لیکن آپ نے سخت بھوک کے باوجود کھانا نہ کھایا۔ بادشاہ نے بُلوا بھیجا اور نہ کھانے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "میرے لئے اگرچہ یہ کھانا اب مباح تو ہو گیا ہے لیکن میں حرام کھا کر تجھ جیسے دشمنِ دین کو خوش ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔" بادشاہ نے کہا "اچھا میرے سر کا بوسہ لے لو میں تمہیں اور تمہارے تمام ساتھیوں کو قید سے رہا کر دوں گا۔" حضرت عبداللہؓ نے اسے قبول کر لیا اور اس کے سر کا بوسہ لے لیا۔ بادشاہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا اور تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن حذیفہ رہا ہو کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کیا تو حضرت عمرؓ اس تدبیر کے ذریعے مسلمانوں کی رہائی سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ہر مسلمان پر حق ہے کہ حضرت عبداللہؓ کی پیشانی کو بوسہ دے اور میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہؓ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کے بعد وہاں موجود تمام مسلمانوں نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

۲ شوقِ شہادت اور بہادری

۱۔ غزوۂ بدر میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا "اُٹھو اور ایسی جنّت کی طرف بڑھو جس کی چوڑائی زمین و آسمان سے زیادہ ہے اور مومنوں کے واسطے تیار کی گئی ہے"۔ حضرت عمر بن الحمامؓ نے سن کر کہا "واہ! واہ"۔ حضورؐ نے فرمایا واہ واہ کس بات پر کہا۔ عرض کی یارسول اللہ میری خواہش ہے کہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تم بھی ان میں سے ہو۔ اس کے بعد جھولی سے چند کھجوریں نکال کر کھانے لگے۔ پھر کہنے لگے کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار کون کرے۔ یہ کہہ کر تلوار ہاتھ میں لی اور کفّار کے مجمع میں گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

۲۔ حضرت وہبؓ بن قابوس بکریاں چرایا کرتے تھے۔ جنگِ احد کے موقع پر بکریاں چرا کر آئے تو معلوم ہوا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جنگِ اُحد پر گئے ہیں۔ بکریوں کو چھوڑ کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اتنے میں کفّار کی ایک جماعت حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف بڑھی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو ان کو منتشر کر دے وہ جنّت میں میرے ساتھ ہو گا۔ حضرت وہبؓ نے تلوار چلانا شروع کی اور سب کو منتشر کر دیا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ حضرت وہبؓ نے کئی کفّار کو قتل کر کے انہیں منتشر کر دیا۔ تیسری مرتبہ بھی انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ کفّار کو پسپا کیا تو حضورؐ نے انہیں جنّت کی خوشخبری دی۔ اس کا سننا تھا کہ تلوار لے کر کفّار کی ایک جماعت میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جنگ کے اختتام پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے باوجود زخمی ہونے کے اپنے دستِ مبارک سے حضرت وہبؓ کو دفن فرمایا اور دعا کی "اللہ تم سے راضی ہو میں تم سے راضی ہوں"۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی کسی پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا وہبؓ پر آیا کہ حضورؐ نے خود ان کی تدفین کی اور ان کے لئے خاص دعا کی۔

۳۔ جنگِ یرموک تھوڑی دیر کے لئے رکی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان بڑی بیقراری کے عالم میں امیرِ عساکر حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے ابوعبیدہ مجھے لڑائی کی اجازت دیدو

کیونکہ میرے صبر وسکون کا جام لبریز ہوگیا ہے۔ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جدائی میں بیقرار ہو رہا ہوں اور شہادت کے ذریعے جلد از جلد اُن سے ملنے کا متمنّی ہوں۔ اگر آپ نے کوئی پیغام دینا ہو تو دیدیجئے۔ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچادوں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا کہ تو وہ نوجوان ہے جس کے عشق کا احترام بوڑھوں پر بھی واجب ہے۔ جب تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں پہنچے تو میری طرف سے سلام کے بعد کہنا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا ہے اور آپ نے قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں زیرنگیں آنے کے جو وعدے کئے تھے وہ پورے ہوگئے ہیں ؎

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروسِ زمینِ شام
اِک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آکر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے بوعبیدہؓ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا میرے صبر وسکوں کا جام
بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسولؐ میں
اک دم کی زندگی بھی محبّت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالتؐ پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق وشوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

پوری کرے خدائے محمدؐ تیری مراد
کتنا بلند تیری محبّت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو ،
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضورؐ نے

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں رومیوں کے ساتھ لڑائیوں میں ایک مرتبہ حاکم قنسرین نے ایک سال کے لیے مسلمانوں کے ساتھ صلح کی اور اس دوران جنگ نہ کرنے اور مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد نہ کرنے کا عہد کیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور روم کے بادشاہ ہرقل کی طرف سے بھی اسے کمک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے حاکمِ قنسرین کو اس کے فریب کی سزا دینے کے لئے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں گیارہ آدمیوں کا ایک دستہ روانہ ہوا۔ راستے میں شاہ غسان جبلہ بن ایہم کا ہزاروں کی تعداد میں وہ لشکر ملا جو حاکمِ قنسرین کی مدد کے لئے جا رہا تھا۔ مسلمان طے شدہ پروگرام کے مطابق ، خاموشی سے اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ قنسرین سے کچھ فاصلہ پر حاکمِ قنسرین استقبال کے لئے نکلا۔ مسلمان گھوڑے دوڑا کر لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی حاکمِ قنسرین کے پاس پہنچ گئے۔ وہ سمجھا شاید شاہ غسان نے لشکر کے سرداروں کو میری تعظیم کے لئے بھیجا ہے۔ جب حضرت خالد بن ولید نے اسے بتایا کہ میں خالد بن ولید ہوں اور تمہیں تمہارے فریب کی سزا دینے کے لئے آیا ہوں تو وہ حواس باختہ ہو گیا اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ اسے زندہ گرفتار کر لیا جائے۔ مسلمانوں نے اسے زندہ گرفتار کر لیا۔ اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں جبلہ کا لشکر پہنچا تو اس نے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا کہ بے شک ہم بارہ آدمی تمہارے ہزاروں کے لشکر میں گھرے ہوئے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی موت سے خائف نہیں۔ اگر تم ہمیں

شہید کرنے کا ارادہ کرو گے تو ہم بھی حاکمِ قنسرین کو ہلاک کر دیں گے۔ اگر تم اس کی جان بچانا چاہتے ہو تو ایک ایک کر کے مردانہ وار ہمارا مقابلہ کرو۔ اگر اس طرح لڑ کر تم نے ایک ایک کو شہید کر دیا تو حاکمِ قنسرین خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ اگر تم ہمارے ہاتھوں قتل ہو گئے تو حاکمِ قنسرین سے تمہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جبلہ نے اپنے سرداروں سے مشورہ کر کے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید خود مقابلہ کے لئے نکلے تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے انہیں روک دیا اور کہا "پہلے مجھے جانے دیجئے" حضرت خالد بن ولید نے دعا دے کر انہیں اجازت دے دی تو دشمنوں میں سے ایک دلیر جنگجو شخص ان کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے پہلے ہی وار میں اسے ڈھیر کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے یکے بعد دیگرے پانچ رومیوں کو ہلاک کیا۔ یہ دیکھ کر جبلہ حیران رہ گیا، اور آگے بڑھ کر حضرت عبدالرحمٰنؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: تم واقعی بہادر نوجوان ہو۔ میں تم سے لڑنے نہیں آیا۔ اگر تم اسلام کو چھوڑ کر ہماری طرف آجاؤ تو میں اپنی لڑکی سے تمہاری شادی کر دوں گا۔ اور ہرقل سے کہہ کر کسی زرخیز علاقے کا تمہیں بادشاہ بنا دوں گا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "میں اسلام جیسی نعمت کے مقابلہ میں اس دنیوی وجاہت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ایک سچا مسلمان تیری ان باتوں میں نہیں آسکتا۔ اگر مقابلہ کرنا ہے تو مردوں کی طرح سامنے آ ورنہ اپنے کسی اور دلیر سپاہی کو بھیج دے"۔ یہ سن کر جبلہ بہت برہم ہوا اور نیزہ تان کر اچانک حضرت عبدالرحمٰنؓ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اپنا بچاؤ کر کے اپنا نیزہ جبلہ کی طرف بڑھایا جو اس نے ڈھال پر روکا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کا نیزہ ٹوٹ گیا تو انہوں نے تلوار کھینچ لی۔ جبلہ نے بھی تلوار نکالی اور لڑنا شروع کر دیا۔ جبلہ کی تلوار سے حضرت عبدالرحمٰن کے شانے زخمی ہو گئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ دیکھا تو حاکمِ قنسرین کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر ہزارہا رومی ان چند بہادروں پر ٹوٹ پڑے حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ عبدالرحمٰنؓ کو درمیان میں رکھ کر گھیرا بنا لو اور جو بھی تمہاری طرف بڑھے اسے قتل کرتے جاؤ لیکن گھیرا نہ ٹوٹنے پائے۔ اسی

تجویز کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید اور ان کے گیارہ ساتھی دائرے کی شکل میں ایک جگہ جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ رومیوں نے کئی زوردار حملے کیے لیکن ہر بار اپنے کئی آدمیوں کی جانیں ضائع کر کے پسپا ہو گئے۔ صبح سے عصر کا وقت ہو گیا۔ مسلمان رومیوں کو قتل کرتے کرتے تھک گئے۔ اتنے میں ابوعبیدہؓ ابن الجراح لشکرِ اسلام کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسلمانوں کو ان کی آمد کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ہزارہا رومیوں کو تہ تیغ کیا۔ آخر کار رومی مسلمانوں کے ان جانبازوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہزارہا رومی اسیر ہوئے اور بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ شہر کے لوگ 'امان' امان' پکارتے ہوئے باہر نکل آئے۔ بہادر، انصاف پسند اور رحمدل مسلمانوں نے ان کی بدعہدی کے باوجود انہیں امان دے دی اور قنسرین پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے!
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

۳۔ حق گوئی و بیباکی

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور ہارون رشید کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک

دن آپ کی عدالت میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس کا ایک گواہ فضل بن ربیع تھا جو ہارون الرشید کا وزیرِ اعظم تھا۔ یہ وزیر ہی نہ تھا بلکہ بادشاہ کا چہیتا بھی تھا۔ اس کا تعلق برامکہ خاندان سے تھا جسے ہارون الرشید کے عہدِ حکومت میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ فضل بن ربیع کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیرونی ممالک کے سفیر بھی سب سے پہلے فضل بن ربیع ہی سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ مقدمہ پیش ہوا تو امام صاحب نے فضل بن ربیع کی گواہی مسترد کر دی۔ فضل بن ربیع کو اس بات کا بڑا رنج ہوا۔ اس نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ دربار میں حاضر ہو کر امام صاحب کے خلاف بادشاہ کے خوب کان بھرے اور کہا کہ آج انہوں نے میری گواہی مسترد کر دی ہے تو کل آپ کے ساتھ بھی ایسا رویّہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر عدالت میں میری گواہی قابلِ قبول نہیں تو اور کس کی ہوگی؟ بادشاہ نے اسی وقت امام صاحب کو دربار میں طلب کر لیا۔ امام صاحب فوری طور پر وہاں نہ گئے بلکہ مقدمات نپٹانے کے بعد فارغ ہو کر وہاں پہنچے۔ فضل بن ربیع کو بادشاہ کو بھڑکانے کا اور بھی موقع مل گیا۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو بادشاہ نے پہلے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ امام صاحب نے فرمایا میرے پاس دور دور سے سائل اپنے مقدمات لے کر آتے ہیں اگر میں اسی وقت آجاتا تو انہیں پریشانی ہوتی۔ آپ کے پاس حاضر ہونے کی نسبت اپنے اصل فرض کی ادائیگی اور سائلوں کی پریشانی کا لحاظ رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ بادشاہ نے فضل بن ربیع کی گواہی کے استرداد کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے دربار میں ایک مرتبہ فضل بن ربیع کو آپ سے یہ کہتے سنا تھا کہ "میں تو آپ کا غلام ہوں"۔ اگر وہ واقعی غلام ہے تو غلام کی گواہی قبول نہیں ہوتی اور اگر وہ غلام نہیں تو اس نے جھوٹ بولا اور جھوٹے آدمی کی گواہی بھی قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے میں نے اس کی گواہی مسترد کر دی۔

۲۔ سلطان طغرل خاندانِ سلجوق کا ایک ذیشان بادشاہ تھا۔ وہ بادشاہ ہی نہ تھا جرنیل بھی تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ اس کا وزیر ابو منصور عالم فاضل اور عابدِ شب بیدار تھا۔ ایک دن صبح بادشاہ نے اسے دربار میں طلب کیا اور قاصد

کو حکم دیا کہ وہ جس حال میں ہو فوراً میرے پاس پہنچ جائے۔ قاصد پہنچا تو ابو منصور نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور نہ ہی اسے کوئی جواب دیا۔ قاصد نے سارا واقعہ دربار میں جا سنایا۔ بادشاہ کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی اور غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ ابو منصور عبادت سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا تو اس کے بہی خواہوں نے اسے بتایا کہ بادشاہ بڑے غصّے میں ہے۔ ذرا سنبھل کر بات کرنا۔ بادشاہ نے ابو منصور کو دیکھتے ہی غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ "آپ کو دربار میں طلب کیا گیا تھا، اتنی دیر سے کیوں آئے"؟ ابو منصور نے بڑے تحمّل سے جواب دیا " بادشاہ سلامت! میں خدا کا بندہ ہوں اور تیرا ملازم۔ جب تک میں اپنے مالکِ حقیقی کی بندگی سے فارغ نہ ہو جاؤں تیری نوکری پر حاضر نہیں ہو سکتا"۔ سلطان طغرل یہ جواب سن کر اپنی جگہ سے نیچے اترا اور قریب آ کر بولا "ابو منصور، خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو میری نوکری پر ہمیشہ مقدّم رکھنا۔ اس کی برکت سے ہمارے سب کام درست ہو جائیں گے"۔

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اب میں صراطِ مستقیم پر چل رہا ہوں تو تم میری اطاعت کر رہے ہو۔ اگر میں راہِ راست سے بھٹک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک بدو نے میان سے تلوار نکال لی اور کہا "اگر آپ سیدھے راستے پر چلتے رہے تو آپ ہمارے خلیفہ اور امیر، ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ لیکن اگر آپ راہِ راست سے بھٹک گئے تو ہم اس تلوار کے ذریعے تمہیں سیدھا کر دیں گے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت میں ایسے آدمی موجود ہیں کہ اگر میں سیدھے راستے سے بھٹک جاؤں تو وہ مجھے صراطِ مستقیم پر لے آئیں گے"۔

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

دیکھ تو اپنا عمل تجھ کو نظر آتی ہے کیا
وہ صداقت جس کی بیباکی تھی حیرت آفریں

اطاعتِ امیر

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے حضرت خالدؓ بن ولید کو سپہ سالاری کے منصب سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو سپہ سالارِ عساکر مقرر کر دیا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے شام میں بڑی فتوحات حاصل کی تھیں۔ رومیوں کے بڑے بڑے لشکروں کو مٹھی بھر فوج کے ساتھ شکست دے کر اسلامی ریاست کی حدود کو وسیع کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب دیا تھا۔ آپ کی بہادری اور شجاعت کو غیر مسلم بھی تسلیم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عامرؓ بن وقاص کو حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی اور ابوعبیدہؓ بن جراح کی تقرری کا حکمنامہ دے کر روانہ کیا۔ خالدؓ بن ولید مختلف علاقوں کو فتح کر کے دمشق تک پہنچ چکے تھے۔ حضرت عامرؓ بن وقاص نے لشکرِ اسلام میں حضرت عمرؓ کا مراسلہ پڑھ کر سنایا تو حضرت خالدؓ بن ولید نے اسی وقت اپنے عہدے کا چارج نئے امیرِ لشکر ابوعبیدہؓ بن جراح کے حوالے کر دیا۔ ایک امیر کا ماتحت اور ماتحت کا امیر بن جانا معمولی بات نہ تھی۔ کوئی ناپختہ کردار کا مالک ہوتا تو اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتا۔ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتا اور آئندہ عدم تعاون کا مظاہرہ کرتا لیکن حضرت خالد بن ولید نے یہ حکم سنتے ہی سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا میں اسلام کا ایک سپاہی ہوں۔ مجھے امارت یا سرداری کی خواہش نہیں۔ میں آئندہ بھی اشاعتِ اسلام اور دینِ حق کی سربلندی کے لئے ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑوں گا اور جو بھی میرا امیر مقرر ہوگا اس کی اطاعت مجھ پر فرض ہوگی۔

حضرت ابو عبیدہؓ ایک مہم پر حضرت خالدؓ بن ولید کو روانہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس خیال سے کہ وہ شاید اس بات کو محسوس کریں کہ پہلے وہ امیرِ لشکر تھے اور اب ماتحتی میں کام کر رہے ہیں، ان کی بجائے کسی اور کو لشکر کا سردار مقرر کیا۔ جب جنگ نے طول پکڑا تو آپ نے خالدؓ بن ولید سے اپنے خیال کا اظہار کر دیا اور کہا "میں پہلے ہی اس مہم پر آپ کو بھیجنا چاہتا تھا لیکن اس لیے اپنا خیال ظاہر نہ کر سکا کہ شاید آپ اس خدمت کو قبول نہ کریں کیونکہ آپ پہلے امیرِ لشکر تھے"

حضرت خالد بن ولید نے کہا "میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے خلیفۂ رسولؐ کا حکم بسر و چشم قبول ہے۔ میں اپنے آپ کو اسلام کا ایک ادنیٰ خادم سمجھتا ہوں اور اشاعتِ اسلام کے لیے اپنی جان خدا کی راہ میں قربان کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ آپ مجھے جس کام پر بھی مقرر فرمائیں گے مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ بلکہ میں اپنے عمل سے خلیفۂ ثانی پر ظاہر کروں گا کہ جیسا میں امارت میں اسلام کا جاں نثار تھا۔ ایسا ہی ایک سپاہی کی حیثیت سے وفادار ہوں۔" چنانچہ حضرت خالدؓ نے جو کچھ کہا تھا اسے سچ کر دکھایا اور بعد کی کئی جنگوں میں آپ کی بدولت فتح حاصل ہوئی ؎

قوم روشن از سوادِ سرگذشت
خود شناس آمد زیادِ سرگذشت
سرگذشتِ او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود
ربطِ ایام است مارا پیرہن
سوزنش حفظِ روایاتِ کہن
چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصۂ افسانہ

ایں ترا از خویشتن آگاہ کند
آشنائے کار و مردِ راہ کند
رُوح را سرمایۂ تاب است ایں
جسمِ ملّت را چو اعصاب است ایں
سَر زند از ماضیِ تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

قوم گذرے ہوئے واقعات کے نشان سے تابندہ ہوتی ہے۔ وہ ان واقعات کی یاد سے اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر گزرے ہوئے واقعات اس کی یاد سے محو ہو جائیں تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ دنوں کا باہمی ربط ہمارا لباس ہے اور اس کی سوئی پرانی روایات کو محفوظ کرنا ہے۔ اسے اپنے آپ سے ناواقف تاریخ کیا ہے؟ کیا یہ قصّہ، کہانی اور افسانہ ہے؟ یہ تجھے اپنے آپ سے واقف کرتی ہے۔ یہ تجھ کو کام سے آگاہ کرتی اور مَردوں کی طرح راستہ طے کرنے کے قابل بناتی ہے۔ یہ روح کے لئے یہ طاقت و قوّت اور جسم کے لئے اعصاب کی مانند ہے۔ تیرے ماضی سے تیرا حال اور تیرے حال سے تیرا مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ اگر تو لازوال زندگی کا متمنّی ہے تو حال اور مستقبل کو ماضی کے رشتے سے جدا نہ کر۔

بارہواں باب

مسلمان کا نصب العین - اعلائے کلمۃ اللہ

قرآن پاک میں ہے "(مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی (اے نبیؐ) ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔" (شوریٰ۔ ۱۳) گویا مسلمان کی زندگی کا نصب العین اقامتِ دین یا اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

یوں تو دنیا میں ہر ذی روح زندگی بسر کرتا ہے لیکن انسان کی زندگی بامقصد ہوتی ہے حیوانوں کی طرح کھانے پینے اور دنیا کی دوسری نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر موت کے منہ میں چلے جانے کا نام زندگی نہیں ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ انسان جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اقامتِ دین یا اعلائے کلمۃ اللہ کے نصب العین کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتے ہیں اور اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس غلبے کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھے رہنے والوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ علامہ اقبال نے اس نصب العین کی نشاندہی کرنے کے بعد اس کے حصول کے طریقے بھی بتائے ہیں اور وہ ہیں :

شہادتِ حق، امانتِ خلافت کا احساس اور جہاد فی سبیل اللہ۔

شہادتِ حق

اللہ تعالیٰ نے امّتِ مسلمہ کو امّتِ وسط اور امّتِ عادل کے خطابات سے نوازا ہے اور اس کے ذمّے یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اللہ تعالیٰ نے جس دین کی تکمیل کر دی ہے ، اسے پوری دنیا تک پہنچائے ۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم آخری نبی اور آپ کی امّت آخری امّت ہے ۔ اس لئے اب یہ اس امّت کا فریضہ ہے کہ اس دین کی روشنی کو ان لوگوں تک پہنچائے جو ابھی ضلالت و گمراہی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ اگر اس امّت نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا تو قیامت کے دن اس کے ہر فرد سے اس کے ذاتی اعمال کے ساتھ اس بات کا بھی حساب لیا جائے گا کہ جو صداقت اس کے پاس موجود تھی اس نے دوسروں تک اسے پہنچانے میں کہاں تک اپنی ذمہ داری پوری کی ۔

قرآن پاک میں ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝

اور اس طرح ہم نے تمہیں امّتِ وسط بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تم پر گواہ ہوں ۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک

راستی کی گواہی دینے والے بنو"۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو اپنی اطاعت اور بندگی کے لئے پیدا کیا اور اس دنیا کو دار العمل بنا کر آخرت کو دار الجزاء قرار دیا۔ انسان کو اس دنیا کے تمام اعمال کا آخرت میں جواب دینا ہوگا اور اس کی آئندہ زندگی کا انحصار اس کے اس دنیا کے اعمال پر ہوگا۔ اگر اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں زندگی بسر کی ہوگی تو اسے جنت کی شکل میں ایسا ملک اور ٹھکانہ ملے گا جسے زوال نہیں ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں زندگی گزاری ہوگی تو اسے جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، جو بدترین ٹھکانہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ اس کے انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ کسی کو اس وقت تک سزا نہ دے جب تک اسے اس بات سے آگاہ نہ کر دے کہ اس نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے، کن اعمال کو سرانجام دینا ہے اور کن اعمال سے بچنا ہے، دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کون سا، دنیا میں اس کے دوست کون ہیں اور دشمن کون، کن اعمال سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور کون سے اعمال اس کی ناراضگی کا سبب ہیں۔ اگرچہ روزِ ازل سے ہی اللہ تعالےٰ نے تمام روحوں سے اپنی ربوبیت کا اقرار لے کر انسان کی فطرت میں نیک و بد، خیر و شر، گناہ و ثواب اور حلال و حرام کی تمیز ودیعت کر رکھی ہے۔ جس کے ذریعے اسے حق کی معرفت حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اس نے اتمامِ حجت کے لئے دنیا میں پیغمبر بھیجے تاکہ کوئی شخص قیامت کے دن یہ اعتراض نہ کر سکے کہ اسے حق اور باطل کا پتہ نہ تھا یا اس کے پاس کوئی ہدایت اور رہنمائی نہ آئی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد اب کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے دین کو کامل کر کے قرآن پاک کی شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔ اسوۂ رسولؐ کے ذریعے اس پر عمل پیرا ہونے کا طریقہ بتا دیا ہے اور آئندہ کے لئے اس دین کو دوسروں تک پہنچانے

کا فریضہ امّت مسلمہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اب یہ امّت کے ہر فرد کا کام ہے کہ وہ حق کی شہادت دے کر اپنا فرض ادا کرے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

شہادتِ حق کا طریقہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو دین کی تعلیم سے روشناس کرائیں۔ فکر و عقائد اخلاق و سیرت، تمدّن و معاشرت، کسبِ معاش، لین دین، حکومت و سیاست، عدل و قانون اور انسانی زندگی کے متعلق دوسرے تمام پہلوؤں کے سلسلے میں اسلام نے جو تعلیم دی ہے اسے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچائیں اور دلائل و شواہد کے ذریعے اس کا برحق ہونا ثابت کر دیں اور اپنی تمام قوّتیں اور ذرائع اس کام پر لگا دیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہ شہادت لوگوں تک محض ہماری زبان کے ذریعے ہی نہ پہنچے بلکہ ہماری عملی زندگی اس کا پورا نقشہ پیش کرنے والی ہو۔ ہمارا اخلاق، ہمارا کردار، ہمارا لین دین، ہمارے علوم و آداب، ہمارے تمام معاملات دین کے احکام کے مطابق ہوں تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ اسلام کی بابرکت تعلیمات پر عمل کرنے سے کس طرح ایک صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ایسے معاشرے میں کس طرح برائیاں ختم ہوتی ہیں اور بھلائیاں فروغ پاتی ہیں۔ فتنہ و فساد اور استحصال کی کس طرح جڑیں کٹ جاتی، عدل و انصاف اور حرّیت و آزادی کے ذریعے کس طرح انسانی وقار بحال ہوتا ہے۔ ہماری دکانیں، ہمارے کارخانے، ہماری عدالتیں، ہمارے دفاتر، ہماری حکومت کے سارے کام کس طرح سنور جاتے ہیں اور اخوّت و محبّت کی فضا میں زندگی کس طرح امن اور چین سے بسر ہوتی ہے۔

اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہم زبان سے بے شک اسلام کا نام لیتے ہیں لیکن ہماری عملی شہادت سراسر اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہماری عدالتوں میں انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں، ہمارے زمیندار وراثت کی تقسیم کے سلسلہ میں اسلام کی تعلیمات کو چھوڑ کر رسم و رواج پر عمل کرتے ہیں، ہمارے تعلیمی اداروں کی اعلیٰ جماعتوں میں فلسفہ و حکمت، معاشیات و سیاسیات اور

دوسرے علوم میں غیروں کے نظریات ازبر کرائے جا رہے ہیں۔ ہمارے کاروبار سے یہ شہادت ملتی ہے کہ مغربی ممالک کے بنائے ہوئے اصولِ تجارت ہی بہتر ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنما قومیّت، وطنیت اور دوسرے غیر اسلامی نظریات پر اپنی سیاست کی بساط بچھاتے ہیں۔ الغرض ہمارا معاشرہ اسلام کی عملی شہادت کا مظہر نہیں ہے۔

دنیا کے سامنے حق کی شہادت پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے اندر مکمل اسلامی نظام نافذ کر کے اپنے معاشرے کو اسلامی بنیادوں پر استوار کر کے ان تمام خرابیوں کو دور کریں جو غیر اسلامی آئین کے نفاذ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ جب ہمارے معاشرے سے جھوٹ، خیانت، دھوکہ دہی، رشوت، چوری، قتل و غارت، بے حیائی، ظلم و زیادتی جیسی خرابیاں دور ہو جائیں گی اور ان کی جگہ حق و صداقت، اخوّت و محبّت، عدل و انصاف کا بول بالا ہو گا، ہر قسم کے تعصبات اور جھگڑوں میں کمی واقع ہو گی، باہمی اتفاق و اتحاد پیدا ہو گا، ہر شخص دوسروں کا خیر خواہ اور ان کے حقوق ادا کرنیوالا بن جائے گا تو ہم دوسروں کے سامنے دینِ حق کو پیش کر کے اس کی عملی شکل دکھا سکیں گے۔ غیر ہماری معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے طعن زنی نہیں کر سکیں گے تو پھر دوسروں کے لئے دینِ حق میں کشش پیدا ہو گی اور وہ اسلام کی طرف رجوع کر سکیں گے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو دنیا میں جو گمراہی پھیلے گی، جتنی بھی بداخلاقیاں اور بدکرداریاں عام ہوں گی ان کی ذمّہ داری ہم پر عائد ہو گی اور قیامت کے دن ہمیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات کی جواب دہی کرنی پڑے گی کہ ہمارے پاس دینِ حق کی روشنی موجود تھی، لوگ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے اور ہم نے انہیں صحیح راستہ نہ دکھایا۔ اس دن ہمارے پاس سوائے شرمندگی کے اور کوئی جواب نہ ہو گا۔ اس لئے ہمیں آج اس کی فکر کرنی چاہیئے اور اپنے معاشرے کی اصلاح کر کے پوری دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا چاہیئے ؎

می ندانی آیۂ اُمّ الکتاب
اُمّتِ عادل ترا آمد خطاب
آب و تابِ چہرۂ ایّامِ تو
در جہاں شاہد علی الاقوامِ تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ
از علومِ اُمّیے پیغام دہ
جلوہ در تاریکیٔ ایّام کن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن
لرزم از شرم تو چوں روزِ شمار
پرسدت آں آبروئے روزگار
حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

کیا تو قرآن پاک کی اس آیت کو نہیں جانتا جس میں تجھے اُمّتِ عادل کا خطاب دیا گیا ہے۔ تو زمانے کے چہرے کی چمک دمک ہے اور دنیا میں تو قوموں پر شاہد (گواہ) ہے۔ عقلمندوں کو دعوتِ عام دے اور نبیِّ اُمّی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علوم سے پیغام دے۔ دنیا کے اندھیروں میں روشنی کر۔ جو (دین) تجھے مکمّل کر کے دیا گیا ہے اسے عام کر۔ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تجھے ہماری طرف سے دینِ حق ملا تھا تو تو نے اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا۔ تو میں تیری شرم کی وجہ سے کانپ جاتا ہوں۔

امانتِ خلافت

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَان۔

بے شک ہم نے آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے امانت کو پیش کیا۔ پس انہوں نے اس کے اٹھانے سے معذوری ظاہر کی اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا ہے اپنی خلافت کی امانت اس کے سپرد کی ہے یہ امانت اللہ تعالیٰ کے احکام و فرائض ہیں۔ مسلمان چونکہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر ایمان لاتا ہے اور اس سے عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق بسر کرے گا اس لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی امانت بھی مسلمان کے سپرد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے اور سب سے بڑی ہستی ہے۔ وہ احکم الحاکمین ہے۔ اس لئے اس کی امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرنے والے تمام لوگوں سے بہتر ہیں۔ اسی امانت کی وجہ سے مسلمان کے پاس زندگی گزارنے کے بہترین اصول موجود ہیں۔ لباس، خوراک، تہذیب و تمدن، علوم و فنون، معیشت و معاشرت، حکومت و سیاست، غرضیکہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے لئے مسلمان دوسروں کی رہنمائی کا محتاج ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے اپنی تہذیب پر فخر کرنے کی بجائے دوسروں کی تہذیب کو اپناتے اور اسی پر فخر کرتے ہیں ؎

عصرِ ما، مارا ز ما بیگانہ کرد　　از جمالِ مصطفٰے بیگانہ کرد

ہمارے زمانے نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا اور ہمیں جمالِ مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ناآشنا کر دیا۔ ہم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے طریقوں کو چھوڑ کر غیروں کے آداب و رسوم کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ رویّہ غلامانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے اسے جس قدر ممکن ہو ترک کر کے ہمیں اپنی تہذیب و تمدّن، اپنے اصولِ زندگی اپنانے چاہئیں اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے اپنے آپ کو کفّار سے بہتر سمجھنا چاہیئے۔

جتنا کوئی شخص بڑا ہوتا ہے اس کی ذمّہ داری بھی بڑی ہوتی ہے۔ اس لئے اس امانت کے سلسلے میں مسلمان پر بہت بڑی ذمّہ داری عاید ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنا اور اس کے احکام کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اسی طرح ہی اس امانت کا صحیح معنوں میں حق ادا ہو سکتا ہے۔ مسلمان احکامِ الٰہی کی موجودگی میں غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین و احکام نافذ کرے یا ایسے احکام کی اطاعت میں برضا و رغبت زندگی بسر کرنا قبول کر لے تو یہ امانت میں خیانت متصوّر ہوگی۔ اگر مسلمان اس امانت کی موجودگی میں دوسروں کی تہذیب و تمدّن کو بہتر سمجھے اور ان کے احکام کی پیروی کرے تو یہ بھی امانت کی ناقدری کے مترادف ہے۔ افسوس ہے مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں اس امانت سے بے پروا ہو کر غیر اللہ کی اطاعت کر کے خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے اور اس کے دل میں اس کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ اس نے چاروں طرف سے اپنی آنکھیں کان اور لب بند کر رکھے ہیں اور خاموش تماشائی بنا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں فتنہ و فساد، ظلم و جور اور فسق و فجور عام ہے۔ انسان انسانوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں اور انہوں نے ان پر ان کے خالق کی حکمرانی قائم کرنے کی بجائے اپنی حکمرانی قائم کر رکھی ہے، اور اسے مستحکم کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حالات کا بغور جائزہ لے اور دیکھے کہ دنیا میں وہ کس طرح اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد طاغوتی نظام کے شکنجے میں کسی ہوئی انسانیت کی

دردناک آوازوں کو سُنے اور اس کے خلاف کلمۂ جہاد بلند کرے۔ جب تک مسلمان خود غیر اللہ کی اطاعت سے منحرف ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرے گا اس وقت تک اسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت دینِ حق موجود ہے اور ہم اس سے بے خبر ہو کر غیر اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ ہماری کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم غیر اللہ سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں۔ غیر اللہ سے مکمل بے نیازی اور اللہ تعالیٰ کی خالص اطاعت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالےٰ کے قانون کو بالادستی حاصل ہو۔ ہماری معاشرت، معیشت، لین دین، علوم و فنون، صنعت و تجارت، سیاست و حکومت ہر جگہ اللہ تعالےٰ کا حکم چلے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم گمراہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہیں گے اور راہِ حق سے محروم رہیں گے ؎

اے زِ آداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموزِ زندگی آگاہ شَو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شَو
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

اے امانت سے بے خبر اپنے آپ کو دونوں جہانوں سے بہتر شمار کر۔ زندگی کے بھید دل سے واقف ہو اور غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا۔ اے عقلمند! آنکھ، کان اور لب کھول۔ اگر تجھے حق کا راستہ نہ ملے تو مجھ پر ہنس۔

جہاد

علامہ اقبال نے جہاد کے سلسلے میں ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے تمام روئے زمین کو میری امّت کے لئے مسجد بنا دیا ہے۔ وہ جس جگہ بھی نماز پڑھیں گے درست ہو گی۔ مسجد کا انتظام و انصرام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہی اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم مسجد پر قبضہ کر لے تو وہ اس کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور اس کی خاطر جان دے کر شہادت کے مرتبے کو حاصل کرنا اپنے لئے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ یہ محض اعتقادی اور نظریاتی بات نہیں بلکہ عملی طور پر ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی کسی مسجد کے لئے بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ مسجد اقصیٰ اور برصغیر میں مسجد شہید گنج کے متعلق مسلمانوں کی قربانیوں سے ہر شخص واقف ہے۔ مسجد شہید گنج کو جب مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ہاتھ میں جاتے دیکھا تو وہ شمع کے پروانوں کی طرح اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لئے تیّار ہو گئے اور یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی اتنی غیرت موجود ہے کہ وہ اپنے جسم میں جان رکھتے ہوئے یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ زمین مسلمانوں کی مسجد ہے، اس پر جگہ جگہ غیر مسلم قابض ہیں اور اسکے بیشتر حصّے کا نظم و نسق غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمان یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش ہیں اور اس کے لئے کسی قسم کی حرکت تو کجا اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی تدبیر نہیں کرتے، بلکہ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ ان کا حق غیر مسلموں نے چھین رکھا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے انہیں کوشش کرنی چاہیئے۔ ان حالات میں مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جہاد کریں اور ایک ترتیب اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھیں اور روئے زمین کو غیر مسلموں کے تسلّط سے آزاد کرائیں۔ اس کام کی ترتیب اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ایک منظّم اور صالح جماعت اس کام کا بیڑا اٹھائے جو پہلے اپنے ملک میں فسّاق و فجّار اور خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو اقتدار سے ہٹا کر حکومت کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے اور اسے اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق چلائے اور پھر پوری زمین کو کفّار کے تسلّط سے آزاد کرانے کے لئے جد و جہد کرے۔

اس وقت زمین پر کفّار کا تسلّط صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے ان پاکیزہ طور طریقوں کو چھوڑ دیا ہے جن کی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تعلیم دی تھی اور جہاد کی بجائے آرام طلبی کی زندگی اختیار کر کے خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر اب بھی ہم اپنی سیرت و کردار کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیں، اپنے اندر جرأت و قوّت پیدا کر کے جہاد کریں تو زمین کو غیروں کے تسلّط سے آزاد کرا کر اللہ تعالےٰ کا کلمہ بلند کر سکتے ہیں ؎

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں
مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردشِ نُہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں!
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

دین کے بادشاہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مومنوں سے کہا کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔ آسمانوں کی گردش سے خدا کی پناہ کہ مومن کی مسجد دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ پاکیزہ طور طریقے رکھنے والا مسلمان بندہ سخت جد و جہد کرتا ہے تاکہ اپنے آقا کی مسجد حاصل کر سکے۔

مسلمان کی تمام زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے۔ اس کا ہر عمل جہاد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کبھی وہ زبان سے جہاد کرتا ہے اور کبھی قلم سے، کبھی وہ یہی فریضہ مال کے ذریعہ ادا کرتا ہے، اور کبھی جان کا نذرانہ پیش کر کے ـــــ اور جب جہاد کی ان سب اقسام سے فارغ ہوتا ہے تو اپنے نفس کے خلاف جہاد میں مصروف ہوتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ رہے

ہیں۔صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اپنے نفس کے خلاف جہاد۔ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا المُجاہِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِی طَاعَۃِ اللہ۔ حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔یہ ایسا جہاد ہے جو ہر لمحے جاری رہتا ہے۔ مسلمان ہر حال میں دین کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے، اور اسے دنیا میں غالب کرنے کی جد وجہد کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اگر ہم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوا۔آپ توحید کی تعلیم شروع کرتے ہیں تو لوگ مخالفت پر اُتر آتے ہیں۔جو شخص ان کی نظر میں پہلے سب سے زیادہ معزز، شریف النفس، صادق اور امین تھا اب وہی شخص برا نظر آنے لگتا ہے۔آپؐ جس طرف جاتے ہیں، بوڑھے جوان سب آپؐ کی تحقیر و تذلیل کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کا جو کلام پیش کرتے ہیں اسے وہ بگاڑ بگاڑ کر ایک دوسرے کو سناتے اور تمسخر اڑاتے ہیں۔لڑکے آپ کے پیچھے تالیاں بجاتے ہیں۔لوگ آپ کو دیوانہ، شاعر مجنون اور نہ جانے کن کن القاب سے نوازتے ہیں لیکن آپؐ اپنا کام جاری رکھتے ہیں، اور ان کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔آپؐ جہاں بھی پیغامِ حق سنانے کے لئے جاتے ہیں، قریش کے آوارہ لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اس کی باتوں میں نہ آنا، اس کے دین کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔یہ لوگوں کو اپنی خوش بیانی سے بہکاتا ہے اور گمراہ کرتا ہے۔اگر کہیں لوگ کفار کی باتوں پر کان نہیں دھرتے اور آپ کی باتیں سننے کے لئے تیار ہو جاتے تو وہ اتنے زور سے شور مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔اس طوفانِ بدتمیزی کے باوجود آپ استقامت کے ساتھ اس کام میں لگے رہتے ہیں۔جہاں کوئی شادی، جلسہ یا مجلس ہوتی ہے بے خوف ہو کر وہاں پہنچ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے ہیں۔اس اجتماعی تبلیغ کے علاوہ انفرادی طور

پر بھی ملاقاتیں کرتے ہیں اور جو شخص بھی ملتا ہے اسے ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر بدمعاش قسم کے لوگ وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں اور طعن و تشنیع سے ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں، آپؐ کو پتھر مارتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، لیکن آپؐ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ تین سال تک ایسے حالات میں آپؐ تبلیغ کا کام کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اور قریبی رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ تو آپ اپنے خاندان کے لوگوں کو ہ صفا پر جمع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں "آپ مجھے سچا جانتے ہیں یا جھوٹا؟" اس پر سب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہم نے آپ کی زبان سے جھوٹ نہیں سنا۔ اس پر آپؐ فرماتے ہیں کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑی فوج ہے جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو اس پر یقین کر دگے؟ سب کہتے ہیں کہ آپؐ صادق اور امین ہیں۔ ہم آپؐ کی بات پر یقین کریں گے۔ یہ جواب سن کر حضورؐ فرماتے ہیں:

"سنو عنقریب بہت ہی بُرا وقت آنے والا ہے۔ اس سے ڈرو۔ بُری باتوں سے باز آجاؤ۔ کفر اور بت پرستی کو چھوڑ دو کہ یہ خدا کو سخت ناگوار ہے۔ اگر خدا کا غضب نازل ہو گیا تو تمہاری یہ سب شان و شوکت خاک میں مل جائے گی۔ اس لئے توبہ کرو۔ بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور سب لوگ اللہُ وَحدَہٗ لاشَرِیکَ کی توحید کا اقرار کر لو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے علانیہ اپنے بتوں کی مذمت اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر سن کر کفار اور بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مکے کے نومسلموں کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرنے کی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی راہ چلتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر خاک ڈال دی جاتی ہے، کبھی آپؐ کا تمسخر اڑایا جاتا ہے کبھی کوڑا کرکٹ آپؐ پر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابولہب کی بیوی آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک بدمعاش حضورؐ کے گلے میں چادر ڈال کر اس قدر بل دیتا ہے

کہ حضورؐ کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔ آپ ایک دن کعبہ میں سربسجود ہوتے ہیں کہ ایک آدمی اونٹ کی اوجھری لاکر آپ کی پیٹھ پر رکھ دیتا ہے جس کے بوجھ سے آپ کے لئے سر اٹھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ دشمنیاں اور عداوتیں اس قدر بڑھتی ہیں کہ آپ کو زہر دینے اور قتل کرنے کی سازشیں کی جاتی ہیں لیکن حضورؐ مرعوب ہونے کی بجائے پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد میں جوں جوں اضافہ ہوتا ہے قریش کا غیظ و غضب اور بھی بھڑکتا ہے۔ آخر اتمامِ حجت کے لئے اکٹھے ہو کر ابوطالب کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں تمہاری بزرگی اور عمر کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم اب تک کچھ نہ کچھ کر کے دکھا چکے ہوتے۔ ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ تمہارا بھتیجا کھلم کھلا ہمارے بتوں کی مذمت کرتا ہے۔ آبا و اجداد کی توہین کرتا ہے۔ اب ہمارے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے۔ کہ ہم یوں شارعِ عام اپنے بتوں کی توہین ہوتے دیکھیں اور کچھ نہ کریں تم اس کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ابوطالب حضورؐ سے کہتے ہیں، بیٹا یہ کام اچھا نہیں ایسا نہ کیا کرو۔ حضورؐ فرماتے ہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ سچ کو جھوٹ سے دبا دوں اور خدا کے احکام ظاہر نہ کروں۔ اس سلسلے میں خواہ آپ بھی مجھ سے کنارہ کش ہو جائیں اور خواہ میں بھی شہید ہو جاؤں لیکن میں تبلیغِ حق سے باز نہیں آؤں گا۔ کفار کا جب یہ حربہ ناکام ہوتا ہے تو وہ کچھ عرصے بعد مشورہ کر کے طے کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دنیوی لذتوں اور نعمتوں کا لالچ دیا جائے۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا جاتا ہے۔

عتبہ خانہ کعبہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے "اے ابنِ عم! تم ہماری قوم میں شریف اور معزز ہو، بچپن سے صادق اور امین ہو۔ تم نے قوم کو کئی بار اپنی ذہانت سے کشت و خون سے بچا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں تمہارا لحاظ ہے۔ تم ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے ہو ہم تمہاری جان نہیں لیتے۔ آخر اس سے تمہارا منشا کیا ہے؟ تم خواہ مخواہ سارے عرب میں بدنام ہو رہے ہو اور ہمیں بھی رسوا کر رہے ہو۔ کوئی تمہیں جادوگر کہتا ہے، کوئی مجنون کہتا ہے۔

ہر قسم کے طعنے سنتے اور ذلّتیں اٹھاتے ہو۔ صاف صاف کہدو کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تمہیں کسی خوبصورت دوشیزہ سے محبّت ہے تو وہ جس خاندان کی ہے تم ظاہر کردو ہم اس سے تمہارا نکاح کردیں گے۔ دولت چاہتے ہو تو جتنی دولت چاہو ہم جمع کردیں گے۔ حکومت چاہتے ہو تو ہم تمہاری حکومت کو تسلیم کرلیں گے۔ لیکن ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دو اور نئے مذہب کا جھگڑا نہ پھیلاؤ۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کے جواب میں فرماتے ہیں "سنو! جو کچھ میں کہتا ہوں وہ وحیِ الٰہی ہے۔ خدا کے احکام مجھ پر عربی زبان میں نازل ہوتے ہیں۔ ان احکام کی تعمیل میں تمہارا دونوں جہانوں کا فائدہ ہے۔ اگرچہ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں مگر مجھ پر خدا نے یہ بات واضح کردی ہے کہ میں اس بدترین حالت کو درست کردوں، بتوں کی پرستش اور دوسری مشرکانہ رسموں کو ختم کردوں۔ میں تمہیں مطلع کرتا ہوں کہ تمہارا خدا ایک ہے۔ قیامت برحق ہے۔ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائیں گے، نیک عمل کریں گے، وہی بہترین لوگ ہیں۔ میری نہ کوئی خواہش ہے نہ میں دولت اور حکومت چاہتا ہوں۔ میری بات مانو یا نہ مانو تمہیں اختیار ہے لیکن جو لوگ مشرک ہیں اور خدا کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں، خدا انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ اور جو ایمان لائیں گے انہیں اس کا اجر ملے گا۔" عتبہ حضورؐ کی اس تقریر سے متاثر ہوتا ہے اور قریش میں آکر کہتا ہے کہ میں نے کسی کی تقریر میں ایسا اثر نہیں دیکھا جیسا حضورؐ کی زبان میں پایا ہے۔ میں نے جو کچھ حضور سے سنا ہے وہ نہ تو شاعری ہے نہ جادو ہے۔ جو کچھ میرے دل پر اثر ہوا وہ میں نے ظاہر کردیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں اس میں دخل نہ دوں گا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کعبہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ مشرکین آپ کو تنہا سمجھ کر گھیر لیتے ہیں اور آپؐ سے پوچھتے ہیں "اب کیا ارادہ ہے؟ تم ہمارے بتوں کو کیوں برا کہتے ہو؟" حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس خطرناک حالت میں بھی جواب دیتے ہیں "بے شک تمہارے معبود جھوٹے ہیں۔ خدا سچّا ہے"۔ یہ سنتے ہی مشرکین جھپٹ پڑتے ہیں۔ قریب تھا کہ آپؐ کی جان خطرے میں پڑ جاتی کہ اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ صدّیق وہاں پہنچتے ہیں اور آپؐ کو بچانے کی کوشش

کرتے ہیں۔ مشرکین آپؐ کو چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اس قدر مارتے ہیں کہ آپؓ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

انہیں دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر دعوتِ دین کے کام میں مصروف ہوتے ہیں کہ ابوجہل وہاں پہنچ جاتا ہے۔ آپؐ کو گالیاں دیتا اور مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور حضورؐ بڑے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپؐ کے چچا حضرت حمزہ کو پتہ چلتا ہے تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارا چچا تمہارے دشمن سے بدلہ لینے کے لئے آیا ہے بتاؤ ابوجہل نے تم سے کیا سلوک کیا تھا۔ حضورؐ فرماتے ہیں" ایسے شخص سے آپ کو کیا واسطہ جس کی نہ ماں ہے نہ باپ ہے۔ نہ کوئی عزیز ہے نہ ہمدرد۔ آپ میرے چچا ہیں تو کیا، اس مشرکانہ حالت میں خواہ آپ کافروں کے خون سے عرب کی زمین بھی سُرخ کر دیں تو اس سے کیا ہو سکتا ہے، جب تک آپ خدائے واحد پر ایمان نہ لائیں۔ اگر آپ مسلمان ہو کر دینِ اسلام کی مدد کر سکتے ہیں تو یہ امداد آپ کے لئے باعثِ ثواب ہو گی ورنہ میں اپنی ذات کے لئے سوائے خدا کے کسی اپنے یا پرائے کی امداد کا طالب نہیں ہوں۔ جس کام میں کام کر رہا ہوں وہی میری مدد کرے گا۔ حضرت حمزہ بھتیجے کا یہ عزم و استقلال دیکھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں۔

حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے پر کفار اور بھی برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ ابوجہل اعلان کرتا ہے کہ جو اس نئے پیغمبر کا (نعوذ باللہ) سر قلم کر کے لائے گا میں اسے ایک ہزار عمدہ قسم کے اونٹ اور ایک ہزار اوقیہ چاندی دوں گا۔ حضرت عمر بن الخطاب اس لالچ میں تلوار لے کر نکلتے ہیں لیکن بہن کے گھر سے قرآن پاک سنتے ہیں تو ان کی کایا پلٹ جاتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان سے مشرف ہو جاتے ہیں۔

کفار دشمنی کی آگ میں جل اٹھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا رسانی کا کام اور تیز کر دیتے ہیں۔ آپ کے دروازے پر گوبر پھینکتے ہیں۔ دروازے کے سامنے پتھر

رکھ دیتے ہیں۔ آپؐ رات کی تاریکی میں نماز تہجد کے لئے نکلتے ہیں تو ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں لیکن ان حالات میں بھی صبر و کرم اور رحمت کے پیکر تبلیغ دین کا کام جاری رکھتے ہیں۔

کفارِ مکہ مشتعل ہو کر مشورے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "کہ ہم اس نبوت کے مدعی کو مجنون اور جادوگر ہی سمجھتے رہے لیکن وہ آہستہ آہستہ اپنی قوت بڑھا رہا ہے حضرت عمرؓ بن الخطاب مسلمان ہو گئے ہیں۔ آلِ ہاشم اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ اور اس کے ساتھی ہمارے منہ پر ہمارے معبودوں کو گالیاں دیں گے اور ہمیں سننا پڑیں گی ۔ اس کا ابھی سے انسداد ہونا چاہیئے۔ ایک شخص تجویز کرتا ہے کہ بنو ہاشم نئے پیغمبر اور اس کے ماننے والوں کا ساتھ دیتے ہیں تو کیوں نہ ان سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔ اس طرح ان کے کس بل نکل جائیں گے اور اس نئے مذہب کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ تجویز پاس ہو جاتی ہے اور اسے ایک عہد نامے کی شکل میں تحریر کر کے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جاتا ہے اور اس پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ابو طالبؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ خاندان کو لے کر ایک گھاٹی جو بعد میں شعبِ ابی طالب کے نام سے مشہور ہوئی، میں چلے جاتے ہیں۔ کفار اس مقاطعے پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ شعبِ ابی طالب تک کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں پہنچنے دی جاتی۔ تین سال بے سروسامانی کے عالم میں گزرتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا ہے۔ محصورین جنگلی بوٹیاں اور درختوں کے پتے کھا کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ خشک چمڑے کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر آتشِ شکم بجھاتے ہیں۔ ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ شیر خوار بچے بھوک سے چلاتے ہیں، بوڑھے اور ضعیف العمر اشخاص کمزوری اور نقاہت سے کراہتے ہیں۔ جوان بھوک سے تڑپتے ہیں۔ دشمنانِ دین گھاٹی کے باہر مظلوموں کی آہ و بکا کو سنتے ہیں لیکن انہیں ترس نہیں آتا۔ آخر اللہ تعالیٰ قریش کے چند آدمیوں کے دلوں میں رحم کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ اکٹھے ہو کر عہد و پیمان کرتے ہیں کہ یہ مقاطعہ سراسر ظلم پر مبنی ہے۔ اسے ختم کرنا چاہیئے۔ زہیر نامی ایک شخص اس میں پہل کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اگلے روز وہ بیت اللہ کا طواف

کر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے "اے اہلِ مکہ تمہارے پاس ہر قسم کا کھانا اور لباس موجود ہے۔ لیکن بنی ہاشم پانی کے ایک گھونٹ کو ترس رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کچھ کھانے کو ہے نہ پہننے کو، نہ وہ کچھ خرید سکتے ہیں جب تک میں اس ظالمانہ عہد نامے کو چاک نہ کر لوں گا خاموش نہ بیٹھوں گا۔ ابوجہل وہاں موجود ہوتا ہے۔ وہ زہیر سے کہتا ہے "میں اسے ہرگز چاک نہ کرنے دوں گا"۔ اسی دوران مطعم نامی ایک شخص آگے بڑھ کر عہد نامے کو چاک کر ڈالتا ہے۔ اس عہد نامے کی تمام عبارت کو دیمک کھا چکی ہوتی ہے۔ صرف "اللہ" کا نام اس میں باقی ہوتا ہے۔

شعبِ ابی طالب کے محصورین گھر آجاتے ہیں لیکن اس واقعے کو ایک ہی سال گزرتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مشفق چچا دنیا سے رحلت کر جاتے ہیں۔ ابھی اس صدمے کو چند ہی روز گزرتے ہیں کہ آپ کی غم گسار اور مونس بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہتی ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس سے بہت صدمہ ہوتا ہے اور یہ سال عامُ الحزن (غم کے سال) کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے

مشرکینِ مکّہ کی مخالفت پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے شروع ہو جاتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم زید بن حارث کی معیت میں طائف کی طرف روانہ ہوتے ہیں تاکہ وہاں دعوتِ دین کا کام کریں۔ وہاں بنی ثقیف کی ایک جماعت کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قبیلے کا ایک معزز سردار آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ بس آپ ہی تو رہ گئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو رسالت پر مامور کیا اور تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا۔ ایک دوسرا سردار کہتا ہے کہ میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا کیونکہ اگر تم نبی ہو تو یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ میں تمہیں کوئی جواب دوں اور اگر تم نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے تو تم اس لائق نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور شہر کے جاہلوں اور لڑکوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ ہر شخص بدکلامی پر اتر آتا ہے۔ آپ واپس لوٹنے

کا ارادہ فرماتے ہیں لیکن لوگ آپؐ کا واپس لوٹنا بھی مشکل کر دیتے ہیں۔ آپ کو پتھر مارتے ہیں، سر پر خاک ڈالتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ آپؐ پر اتنے پتھر برسائے جاتے ہیں کہ پنڈلیاں لہولہان ہو جاتی ہیں۔ آپؐ صبر و استقلال کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔ آپؐ کو ان کے حق میں بد دعا کے لئے کہا جاتا ہے تو آپؐ فرماتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لائے تو مجھے امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ایمان لے آئیں گی اور دعا فرماتے ہیں کہ یا اللہ ان کو ہدایت دے اور میری مدد فرما بغیر تیری مدد کے کامیاب ہونا مشکل ہے۔

آپؐ مکّہ واپس آکر پھر تبلیغِ اسلام شروع کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اسلام کا پیغام یثرب تک پہنچ جاتا ہے۔ آپؐ کی اجازت سے مکّے کے مسلمان یثرب کی طرف ہجرت شروع کر دیتے ہیں۔ کفّار سوچتے ہیں کہ اگر مسلمان یونہی ہجرت کر کے یثرب پہنچتے رہے تو ایک دن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی ہجرت کر کے چلے جائیں گے اور اگر یثرب کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے تو ہمارے لئے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ چنانچہ وہ دارالندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کرتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قتل کر دیا جائے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہجرت کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ رات کے وقت کفّار آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹا کر اور مکّے والوں کی امانتیں ان کے سپرد کرنے کی ہدایت کر کے حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی معیت میں یثرب کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ مکّے سے کچھ فاصلے پر غارِ ثور میں تین دن قیام کے بعد یثرب پہنچ جاتے ہیں۔

یثرب پہنچ کر آپؐ کچھ جگہ خرید کر مسجد تعمیر کرتے ہیں۔ آپؐ بنفسِ نفیس اس کی تعمیر میں حصّہ لیتے ہیں۔ مدینے کے دو قبیلوں اوس و خزرج کی صدیوں کی باہمی رقابت آپؐ کی برکت سے ختم ہو جاتی ہے اور سب مسلمان بھائی بھائی بن کر رہنے لگتے ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم یہود سے ایک معاہدہ کرتے ہیں جس میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تمام قضیوں کے آخری فیصلے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ یثرب کا نام پہلے مدینۃ النبی (نبی کا شہر) بعد میں صرف مدینہ مشہور ہوتا ہے۔ اس طرح اسلام کی پہلی باقاعدہ ریاست وجود میں آتی ہے جس کے پہلے سربراہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہوتے ہیں۔ اب دین اپنی اصلی قوّت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اردگرد کے قبائل کے ساتھ بھی اسی قسم کے معاہدے کرتے ہیں تاکہ اگر مشرکینِ مکّہ مدینہ پر حملہ آور ہوں تو یا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں یا غیر جانب دار رہیں۔

رمضان ۲ھ میں کفّارِ مکّہ تقریباً ایک ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر حملے کے لئے نکلتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو علم ہوتا ہے تو آپ بھی اپنے تین سو تیرہ جاں نثاروں کو لے کر مقابلے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ بدر کے مقام پر مقابلہ ہوتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ان مجاہدوں کو صف بستہ کر کے خدا کے حضور کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔ مسلمان جان توڑ کر لڑتے ہیں اور شوقِ شہادت سے سرشار شجاعت و جوانمردی کی نئی داستانیں رقم کرتے ہیں۔ کفّار شکست کھا کر بھاگ جاتے ہیں اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہتا ہے۔

معرکۂ بدر سے فارغ ہو کر آتے ہیں تو مدینے میں یہودیوں کی شرارتوں کا علم ہوتا ہے۔ آپؐ یہود بنی قینقاع کے محلّے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہودیوں کے ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں، اور وہ اس شرط پر صلح کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مال و اسباب اور اہل و عیال کو لے کر مدینے سے نکل جائیں گے۔

ذوالحجّہ ۳ھ میں ابوسفیان مقتولینِ بدر کا بدلہ لینے کے لئے مدینے سے تین میل مقام عریض تک پہنچ جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم دو سو جاں نثاروں کو لے کر مقابلے کے لئے نکلتے ہیں۔ ابوسفیان پر ایسی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ وہ مقابلہ کئے بغیر واپس بھاگ جاتا ہے اور ستّو کے بورے بھی چھوڑ جاتا ہے۔ اسی لئے یہ غزوہ "السّویق" کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ "السّویق" کے معنی ستّو کے ہیں۔

ابھی آپؐ اس مہم سے فارغ بھی نہیں ہو پاتے کہ محرّم میں بنی سلیم کے یہودی مدینے پر حملہ کرنے کے لئے مدینے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ اتنے میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم واپس مدینے تشریف لے آتے ہیں۔ یہودیوں کو آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہوتی اور واپس لوٹ جاتے ہیں۔

اس کے بعد ربیع الاول کے مہینے میں بنی ثعلبہ سر اٹھاتے ہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ مدینے میں لوٹ مار مچائیں اور قتل و غارت کا بازار گرم کریں۔ ایّوب نامی ایک یہودی دعثور کا لقب اختیار کر کے ان کا سرغنہ بن جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس کا علم ہوتا ہے تو ساڑھے چار سو جاں نثاروں کو لے کر ان کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ بنی ثعلبہ پر ایسی ہیبت چھاتی ہے کہ اپنے سردار کو چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ جاتے ہیں۔ اس دن اتفاق سے بارش ہو جاتی ہے۔ تمام مجاہدین اپنے کپڑے خشک کرنے کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اپنے کپڑے خشک ہونے کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہوتے ہیں کہ یہودیوں کا سرغنہ دعثور وہاں پہنچ جاتا ہے اور تلوار سونت کر حضور سے سوال کرتا ہے، بتاؤ اب میری تلوار سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ آپ فرماتے ہیں: اللہ! حضورؐ کی زبانِ مبارک سے خدائے ذوالجلال کا نام سنتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور تلوار گر پڑتی ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم تلوار ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں "بتاؤ اب میرے ہاتھ سے تمہیں بچانے والا کون ہے؟" وہ افسوس بھرے لہجے میں کہتا ہے "کوئی نہیں"۔ آپؐ تلوار پھینک کر فرماتے ہیں "رحم کرنا مجھ سے سیکھو"۔ وہ شخص اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔

اسی سال یعنی ۲ھ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کرتے ہیں۔ نہ کوئی باجا گاجا ہوتا ہے، نہ شور و ہنگامہ، نہ کوئی نقارہ ہوتا ہے نہ دمامہ۔ نہ رنگا رنگ پوشاکیں ہوتی ہیں نہ سہرے کی رسم ادا ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ اپنی

زرہ بیچ کر شادی کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جہیز میں آٹا پیسنے کی چکّی، مشک، کھجوری بان کی بنی ہوئی چارپائی اور اسی نوع کی چند سادہ اشیا ملتی ہیں اور صبر و رضا کی پیکر خاتونِ جنّت باپ کے گھر سے رخصت ہو کر شوہر کے گھر آجاتی ہیں۔ ان کا اصل جہیز وہ تعلیم و تربیت تھی جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے انہیں مہیّا ہوئی تھی اور جو ساری زندگی ان کے کام آتی رہی۔

۳ھ میں ابوسفیان تین ہزار کا لشکر لے کر پھر مدینے پر چڑھ آتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلتے ہیں۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ سلول اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جاتا ہے۔ اب سات سو جاں نثار اُحد کے مقام پر مقابلہ کرتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جنگی حکمتِ عملی کے طور پر ایک درّے میں پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ متعیّن فرماتے ہیں۔ مسلمانوں کو فتح ہوتی ہے تو ان تیراندازوں میں سے اکثر فتح ہو جانے کے خیال سے حضورؐ کی اجازت کے بغیر اس جگہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ خالد بن ولید جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے واپس لَوٹ کر اس طرف سے حملہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو وقتی طور پر سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کی صفیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ بعض مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں ہی شہید ہو جاتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی ایک پتھر لگتا ہے، جس سے نچلے چار دانتوں میں سے ایک شہید ہو جاتا ہے۔ عارض مبارک اور جبینِ اطہر پر بھی زخم آتے ہیں۔ جنگ کے دوران یہ بات مشہور ہو جاتی ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم شہید ہو گئے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک جگہ کھڑے ہو کر آواز دیتے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ مسلمان دوبارہ آپؐ کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کفّار مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچا لینا ہی غنیمت سمجھتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس جنگ میں حضورؐ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ بھی شہید ہو جاتے ہیں جس کا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بہت صدمہ ہوتا ہے۔

غزوۂ اُحد سے فارغ ہو کر آپؐ مدینے تشریف لے جاتے ہیں اور مسجدِ نبوی میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عقیدت مند آپؐ کو زندہ و سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور فرطِ مسرت سے آپؐ کے قدم چومنا چاہتے ہیں لیکن آپؐ منع فرما دیتے ہیں اور سب کو پاس بٹھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک بدوی یہ اطلاع دیتا ہے کہ کفار نے مشورہ کیا ہے کہ انہوں نے مدینہ فتح کئے بغیر واپس لوٹ کر غلطی کی ہے۔ ان کا اصل ہدف مدینہ تھا اس لئے وہ دوبارہ مدینے کی طرف حملے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت لوگوں کو اطلاع کرتے ہیں کہ جو لوگ جنگِ اُحد میں شریک تھے وہ مشرکین کے مقابلے کے لئے پھر تیار ہو جائیں۔ مسلمان زخموں سے چور چور ہیں لیکن حضور کا فرمان سنتے ہی مسلح ہو کر مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے باہر سات میل تک سفر کرتے ہیں۔ مشرکین کی جماعت کی معبد الخزاعی سے ملاقات ہوتی ہے تو اس سے مسلمانوں کا حال پوچھتے ہیں۔ معبد سے یہ سن کر کہ مسلمان پھر مقابلے کے لئے آ رہے ہیں، ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ واپس لوٹ جاتے ہیں۔

شعبان ۳ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملتی ہے کہ ابو سفیان پھر بدر کے میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک عظیم لشکر تیار کیا ہے اور دور دور سے اچھی قسم کا اسلحہ حاصل کیا ہے، آپ پھر جاں نثاروں کا لشکر لے کر میدانِ بدر کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور آٹھ روز تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ لیکن ابو سفیان کو جب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مقابلے کے لئے تیار ہیں تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ قحط سالی کا بہانہ بنا کر جنگ کئے بغیر واپس لوٹ جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کفار کی اس پسپائی کا علم ہوتا ہے تو آپؐ بھی مدینے تشریف لے آتے ہیں۔

شعبان ۵ھ میں بنی المصطلق کے لوگ علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لئے نکلتے ہیں۔ باغیوں کو ایسی شکست ہوتی ہے کہ وہ اہل و عیال کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

اس واقعے کو صرف تین چار مہینے ہی گزرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ کفار اردگرد کے قبائل اور یہودیوں کو جمع کر کے ایک بہت بڑا لشکر تیار کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو آپؐ صحابہ سے مشورہ کرتے ہیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ مدینے کے گرد خندق کھود کر دفاعی جنگ کا مشورہ دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ تین ہزار صحابہؓ خندق کھودنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آپؐ دس دس صحابہؓ کو دس دس گز زمین تقسیم کر دیتے ہیں۔ سخت جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن فاقے سے گزر رہے ہیں، صحابۂ کرامؓ نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے ہیں لیکن عزم و استقلال کا یہ عالم ہے کہ اپنی پیٹھوں پر مٹی لا لا کر پھینکتے ہیں اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ ہم وہ ہیں جنھوں نے ہمیشہ کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی طرح خندق کھودنے میں بھی بہ نفسِ نفیس حصّہ لیتے ہیں۔ آپؐ خندق کھودتے ہیں، پتھر توڑتے ہیں، مٹی ہٹانے میں صحابہؓ کی مدد کرتے ہیں اور باقی سب کاموں میں برابر حصّہ لیتے ہیں۔ پتھر کھودتے کھودتے ایک سخت چٹان آجاتی ہے جہاں کسی کی ضرب کام نہیں کرتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لاتے ہیں۔ تین دن کے فاقے سے پیٹ پر پتھر بندھا ہے۔ اپنے دستِ مبارک سے پھاوڑے کی ضرب لگاتے ہیں تو چٹان دو ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ خندق مکمّل ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کفار چوبیس ہزار کے لشکر کے ساتھ محاصرہ کرتے ہیں۔ بیس دن تک محاصرہ جاری رہتا ہے۔ مدینے کے یہودی بنو قریظہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کفّار کا ساتھ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے ایک نئی پریشانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے کفّار کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ نامراد واپس لوٹ جاتے ہیں۔

بنو قریظہ نے عین وقت پر دغا دی تھی۔ اس لئے حضورؐ جنگِ خندق سے فارغ ہو کر ان کا محاصرہ کرتے ہیں وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر مقابلے کی ہمت نہیں رہتی تو پیغام بھیجتے ہیں کہ ہم بنی نضیر کی طرح مدینے سے جلاوطن ہونے کے لئے تیار ہیں۔ انہیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ انکار کرتے ہیں آخر ان کی مرضی کے مطابق سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصلے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ ان کے فیصلے کے مطابق ان دغابازوں کے مرد قتل کر دیئے جاتے ہیں، عورتیں اور بچے لونڈی غلام بنا لئے جاتے ہیں، سامان مجاہدوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہودیوں کی شورش کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔

اس مہم کے فارغ ہونے کے پانچ چھ ماہ بعد ربیع الاوّل ۶ھ میں حضورؐ شہدائے رجیع کا انتقام لینے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ شہدائے رجیع وہ لوگ تھے جنہیں عقیل اور قارہ کے لوگ احکام سیکھنے کے بہانے مدینے سے لائے تھے لیکن راستے میں رجیع کے مقام پر چھ کو انہوں نے دھوکے سے شہید کر دیا اور تین کو کفارِ مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ بنی لحیان کی طرف تشریف لے جاتے ہیں۔ وہ آپ کی خبر سنتے ہی پہاڑوں میں چھپ جاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آتے ہیں۔

ربیع الآخر ۶ھ میں عتیبہ بن حصن الفزاری بنی غطفان کے آدمیوں کے ہمراہ مسلمان قبیلے بنی غفار کے اونٹ ہنکا کر لے جاتا ہے۔ بنی غفار کا ایک آدمی قتل کر کے اس کی بیوہ کو پکڑ کر لے جاتا ہے۔ ایک مسلمان سلمہ بن عمرو ان کا تنہا تعاقب کرتا ہے، وہ لوگ اونٹ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا ہے تو آپ کچھ مجاہدوں کو سعد بن زید کی سرکردگی میں ان کی سرکوبی کے لئے بھیجتے ہیں اور بعد میں خود بھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ غابہ کے قریب معمولی سی لڑائی ہوتی ہے۔ لٹیرے

شکست کھا کر بھاگ جاتے ہیں اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کامیاب واپس تشریف لاتے ہیں۔

جمادی الاوّل ۶ھ میں بنی المصطلق مسلمانوں کے خلاف حارث کی سپہ سالاری میں ایک گروہ جمع کرتے ہیں۔ حضورؐ کو علم ہوتا ہے تو بروقت ان کے پڑاؤ کی طرف بڑھتے ہیں۔ معمولی سے مقابلے کے بعد وہ لوگ شکست کھا کر بھاگ جاتے ہیں اور مسلمانوں کی یہ مہم بھی کامیاب رہتی ہے۔

ذیقعد ۶ھ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لوگوں کو حج کی تیاری کا حکم دیتے ہیں۔ چودہ سو مسلمان تیار ہو جاتے ہیں۔ آپؐ ان جان نثاروں کے ہمراہ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ کفّار مسلمانوں کو مکّے میں آنے سے روک دیتے ہیں۔ بات چیت شروع ہوتی ہے۔ پہلے کفّار کی طرف سے ایک آدمی بات کرتا ہے پھر مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ اس مقصد کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں واپسی میں دیر ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہو جاتی ہے کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمان لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور ایک درخت کے نیچے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ پر جان کی بازی لگانے کی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب بیعت کنندگان سے راضی ہو جاتا ہے اور یہ بیعت بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ آخر کار کفّار اور مسلمانوں کے درمیان کچھ شرائط پر صلح ہو جاتی ہے۔ صلح کی ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ اگر قریش میں سے کوئی آدمی مسلمانوں کے پاس آجائے گا تو واپس کر دیا جائے گا لیکن کوئی مسلمان قریش کے پاس جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ معاہدہ لکھا جا چکا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ابوجندلؓ کفّار کی اذیتوں سے تنگ آکر مسلمانوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ابوجندلؓ کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، جسم زخموں سے چور چور ہے، مسلمانوں کے دل ان کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں واپس نہ کیا جائے لیکن ختم المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم معاہدے کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں واپس کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں "جاؤ اللہ تعالےٰ تمہارے لئے

کوئی اور راہ نکال دے گا مسلمان صلح کی شرائط کے مطابق حج کئے بغیر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ یہ صلح صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم صرف عرب کے لئے نبی مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ دنیا کے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس لئے آپؐ صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر مختلف بادشاہوں کے نام سفیروں کے ہاتھ مراسلات روانہ کرتے ہیں جن میں توحید پر ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان نامہ ہائے مبارک کا ملا جلا ردّ عمل ہوتا ہے بعض بادشاہ مسلمان ہو جاتے ہیں اور بعض دل سے اس کو برحق سمجھتے ہیں اور حضورؐ کے سفیروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں لیکن اپنی مجبوریوں کی بنا پر ایمان نہیں لاتے اور بعض اپنی بدبختی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سب میں نجاشی حکمرانِ حبشہ اور بحرین کا حاکم منذر بن ساوی خوش نصیب ثابت ہوتے ہیں۔ وہ نامۂ مبارک دیکھتے ہی مسلمان ہو جاتے ہیں۔ خسرو پرویز شاہِ ایران سب سے بدقسمت نکلتا ہے۔ وہ نامۂ مبارک کو دیکھتے ہی چاک کر دیتا ہے اور اپنے ماتحت صوبہ یمن کے حاکم باذان کو خط لکھتا ہے کہ اپنے دو سرداروں کو بھیجے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو لا کر میرے سامنے پیش کرے۔ باذان شہنشاہ کے حکم کی تعمیل میں دو سرداروں کو ایک خط کے ساتھ روانہ کرتا ہے جس میں حضورؐ کو دربار میں حاضر ہونے کے لئے لکھتا ہے۔ سفیر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر آپ بادشاہ کے سامنے پیش ہو گئے تو ہمارے حاکم باذان آپ کی سفارش کریں گے، اور اگر پیش نہ ہوئے تو بادشاہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کرا دے گا۔ حضورؐ انہیں دوسرے دن آنے کا حکم دیتے ہیں۔ دوسرے دن وہ حاضر ہوتے ہیں تو آپ انہیں وحیٔ الٰہی سے مطلع کرتے ہیں کہ جاؤ تمہارا بادشاہ قتل ہو چکا ہے اور اس کا بیٹا شیریہ اس کی جگہ بادشاہ بن چکا ہے۔ لہٰذا نہ وہ خود رہا نہ اس کا حکم۔ آپؐ انہیں یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ دینِ اسلام کسریٰ کے ملک میں پہنچ جائے گا اور وہاں اسلامی حکومت قائم ہو گی بلکہ جہاں تک انسان کے قدم اور گھوڑوں کے سُم پہنچ سکتے ہیں وہاں تک کلمۂ توحید بھی پہنچ جائے گا۔

سفیر واپس لوٹتے ہیں تو خبر درست ثابت ہوتی ہے ۔ لہٰذا خود باذان اور یمن کے تمام لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں ۔

صلح حدیبیہ سے تقریباً دو ماہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا ہے کہ خیبر کے سرکش یہودی مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو آپ چودہ سو جاں نثاروں کو لیکر ان کی سرکوبی کے لئے خیبر کی طرف روانہ ہوتے ہیں ۔ یہودی کھلے میدان میں لڑنا چاہتے تھے لیکن لشکرِ اسلام اتنی تیزی سے حرکت میں آتا ہے کہ انہیں اس وقت خبر ہوتی ہے جب مسلمان ان کے قلعوں کا محاصرہ کر چکے ہوتے ہیں ۔ یہودیوں کے مختلف قلعے چند روز میں مسخر ہو جاتے ہیں ۔ صرف قلعۂ خیبر باقی رہ جاتا ہے ۔ اس قلعے کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ باری باری مسخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر قلعہ سر نہیں ہوتا ۔ کئی دنوں کی کوششوں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: خدا کی قسم کل میں ایسے شخص کو علم دے کر بھیجوں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں قلعے کو مسخر کر دے گا ۔ چنانچہ اگلے دن آپ حضرت علیؓ کو علم دے کر بھیجتے ہیں اور قلعہ ان کے ہاتھوں فتح ہو جاتا ہے ۔ یہودی امان کے طالب ہوتے اور کچھ شرائط پر انہیں امان دے دی جاتی ہے ۔

اس مہم میں قلعے کے مقتول سردار مرحب کے بھائی حارث کی بیٹی زینب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرتی ہے ۔ آپؐ اپنی عادتِ مبارک کے پیشِ نظر دعوت قبول کر لیتے ہیں ۔ زینب گوشت میں زہر ملا دیتی ہے ۔ آپ ایک ہی لقمہ لے کر فرماتے ہیں کہ یہ بکری جس کا گوشت ہے مجھے کہتی ہے کہ مجھ میں زہر ملا ہوا ہے ۔ حضرت بشرؓ جو آپؐ کے ساتھ شریکِ طعام تھے دو چار لقمے کھا جاتے ہیں ۔ اس لئے شہید ہو جاتے ہیں ۔ زینب جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ میں نے اس خیال سے زہر ملا دیا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں تو آپ کو علم ہو جائے گا اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہمیں آپ سے نجات مل جائے گی ۔ آپؐ اس کا قصور معاف فرما دیتے ہیں ۔

خیبر کی فتح کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کو فدک کے یہودیوں کے پاس تبلیغِ اسلام کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ وہ اسلام تو قبول نہیں کرتے لیکن خراج گزار بن کر اطاعت قبول کر لیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ فدک کے باغ کی آدھی آمدنی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہو گی چنانچہ آپ صحابہ کرامؓ کے مشورے سے فدک کی آمدنی کے اس نصف حصّے سے ازواجِ مطہرات کی خبر گیری فرماتے اور جو بچ جاتی اسے غربا اور مساکین میں تقسیم فرما دیتے۔

ذی الحجہ ۶ھ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم صلح حدیبیہ کے موقع پر موجود اصحاب کے ساتھ مکّہ پہنچ کر عمرہ ادا کرتے ہیں اور مکّہ میں تین دن قیام کرنے کے بعد واپس آجاتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی پابندی کرتے ہوئے اس سال عمرہ ادا کرنے سے قریش کے سرداروں پر اچھا اثر پڑتا ہے اور حضرت خالدؓ بن ولید، عمرؓ بن ابی طلحہ اور عمروؓ بن العاص جیسے باثر بہادر آدمی ۸ھ میں خود مدینے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حارث بن عمر کے ذریعے ایک خط بصرہ کے فرمانروا کے پاس بھیجا تھا لیکن جب وہ موتہ کے مقام پر پہنچے تو عمرو بن شرجیل نے انہیں شہید کر دیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کا انتقام لینے کے لئے جمادی الاوّل ۸ھ کو تین ہزار جاں نثاروں کا لشکر روانہ فرماتے ہیں۔ زید بن حارثؓ کو سپہ سالار مقرر کر کے فرماتے ہیں کہ اگر یہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب کو سردار بنا لینا۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ کو علمبردار بنا لینا۔ اس لشکر کے مقابلے میں رومیوں کے لشکر کی تعداد دو لاکھ ہوتی ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ تینوں سپہ سالار باری باری شہید ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت خالدؓ بن ولید کو سپہ سالار مقرر کیا جاتا ہے۔ آپ عَلَم ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتے ہیں اور اس زور سے وار کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے نو تلواریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ دشمن کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ

رہتا ہے۔

بنی بکر مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے بنی خزاعہ پر حملہ کرتے ہیں تو کفارِ مکّہ صلح نامہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنی بکر کی مدد کرتے ہیں۔ وہ حرم میں پناہ لیتے ہیں تو کفار وہاں بھی ان کا پیچھا کرتے ہیں اور انہیں بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ بنی خزاعہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ کفار کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو ابوسفیان کو صلحنامہ کی تجدید کے لئے بھیجتے ہیں۔ ابوسفیان حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مقصد بیان کرتا ہے تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم خاموش رہتے ہیں۔ وہ مقتدر صحابہؓ سے سفارش کرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن کوئی اس کی حامی نہیں بھرتا آخر ناکام ہو کر واپس لوٹ جاتا ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم دس ہزار جاں نثاروں کا لشکر تیار کر کے مکّے کی طرف روانہ ہوتے ہیں کفار کو مزاحمت کی ہمّت نہیں پڑتی۔ مسلمان بڑے امن کے ساتھ مکّے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک طرف عکرمہ بن ابی جہل اور اس کے ساتھی معمولی سی مزاحمت کرتے ہیں، اٹھائیس مشرکین ہلاک ہوتے ہیں اور تین مسلمان شہید ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کسی بڑی خوں ریزی کے بغیر مکّہ فتح ہو جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فاتح مکّہ کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں۔ آپ کو اذیتیں دینے والے مجرموں کی طرح حاضر ہوتے ہیں۔ آپؐ کسی سے انتقام نہیں لیتے بلکہ سب کو معاف فرما دیتے ہیں۔ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ جو لوگ انتقام کے خوف سے بھاگ گئے تھے وہ بھی حاضرِ خدمت ہو کر عفو و کرم سے حصّہ پاتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

مکّہ اور طائف کے درمیان قبیلہ ہوازن کو فتح مکّہ کا علم ہوتا ہے تو وہ اس خیال سے کہ مسلمان ان کی طرف پیش قدمی نہ کریں، ان کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بارہ ہزار کا لشکر لے کر ان کے مقابلے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

ان میں وہ دو ہزار نو مسلم صحابہ بھی شامل ہوتے ہیں جو فتح مکّہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ مسلمان صبح کی تاریکی میں وہاں پہنچتے ہیں ۔ دشمن کی فوج گھات میں ہوتی ہے اور اچانک حملہ کرتی ہے۔ مسلمان اس اچانک حملہ سے گھبرا جاتے ہیں لیکن پھر مجتمع ہو کر حملہ کرتے ہیں تو فتح یاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے بے شمار مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے جس کا زیادہ حصّہ تالیفِ قلوب کے لئے مکّہ کے نو مسلموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

سنہ ۹ھ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم معرکۂ حنین سے فارغ ہو کر مدینے پہنچتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ رومی بہت بڑا لشکر تیار کر کے مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ان کے لشکر میں رومیوں کے علاوہ عرب عیسائی بھی شامل ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کے مقابلے کے لئے اعلانِ جہاد کرتے ہیں۔ گرمی کا موسم اور قحط سالی کا زمانہ ہے، کھجوروں کے پھل پکے ہوئے ہیں، اس موسم میں عرب عام طور پر گھر سے نہیں نکلتے اور پھلوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حکم سنتے ہی بلا تامّل تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی معرکے میں حسرت عمرؓ گھر کا آدھا سامان اور حضرت ابوبکرؓ گھر کا سارا سامان حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ سرحدِ روم کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ رومیوں کو مقابلے میں آنے کی ہمّت نہیں پڑتی اور سرحدِ شام ہی سے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کچھ دن قیام کرتے ہیں۔ اس دوران اردگرد کے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کا کام ہوتا ہے، ایک مسجد تعمیر کی جاتی ہے اور دس روز قیام کر کے آپؐ واپس تشریف لے آتے ہیں۔

حج کے دن قریب آجاتے ہیں تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کی امارت میں ایک قافلۂ حج روانہ کرتے ہیں تاکہ حج کی غلط رسوم کو مٹا کر اصلاح کر دی جائے اور آئندہ مشرکوں کو حج کے لئے آنے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ صدّیق رضؓ بیت اللہ پہنچ کر حج ادا کرتے ہیں، لوگوں کو حج کے مسائل بتاتے ہیں اور آئندہ مشرکوں کو

حج سے روک دیتے ہیں ۔

ذیقعد ۱۰ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود حج کا ارادہ فرماتے ہیں تقریباً ایک لاکھ چوالیس ہزار شمع نبوّت کے پروانے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ آٹھ روز کے سفر کے بعد ۴ ذی الحجہ کو حضورؐ مکّہ مکرمہ پہنچ جاتے ہیں اور حج کے ارکان ادا کرتے ہیں۔ میدانِ عرفات میں آخری یادگار خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جس میں عورتوں سے حسنِ سلوک کی تلقین کرتے ہیں، سود حرام قرار دیتے ہیں، رنگ و نسل اور حسب و نسب کی بنا پر فضیلت کے معیار کو ختم کر کے تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیتے ہیں ۔ ارکانِ اسلام کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں اور کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کو مضبوطی سے تھامنے کی ہدایت کرتے ہیں ۔

حج سے واپسی پر ۱۱ھ کے آغاز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر فلسطین و شام کی طرف روانہ کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کا سپہ سالار اسامہ بن زید کو مقرر فرماتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدّیق اور حضرت عمرؓ کو لشکر کے ساتھ جانے کی ہدایت فرماتے ہیں ۔

صفر کے آخری دنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اچانک خراب ہو جاتی ہے مرض شدّت اختیار کرتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے ہیں ۔ مرض سے معمولی افاقہ ہوتا ہے تو دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے ہیں اور نصیحتیں کرتے ہیں چند دن کے لئے مرض میں افاقہ ہو جاتا ہے ۔ مرض پھر عود کر آتا ہے اور آخر کار آپؐ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ بروز سوموار بہ وقت چاشت خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بھرپور اور مصروف زندگی گزاری کہ آپؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہے ۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کا

یہ انداز ہے کہ ساری زندگی جہاد میں گذار دیتے ہیں۔ دوسری طرف حقوق العباد کی ادائیگی کا یہ عالم کہ کسی کو زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہیں پہنچاتے، کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیتے، جہاد کے علاوہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ مدینہ کی ایک بوڑھی کنیز کو بازار سے سودا سلف لا دیتے، ازواجِ مطہراتؓ کی ضروریات کا خود خیال رکھتے، جب کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک ہاتھ نہ ہٹاتے جب تک وہ خود نہ کھینچ لیتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی لیکن آپ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔ بیماروں کی عیادت کے لئے دور دور تک تشریف لے جاتے۔ عذر کرنے والوں کا عذر قبول فرماتے۔ ہر قوم کے بزرگوں کی تعظیم کرتے۔ جو کوئی آپ کے پاس آتا اس کی قدر کرتے، کبھی اس کے لئے چادر بچھا دیتے، کبھی تکیہ آگے بڑھا دیتے، باہر سے آنے والے وفود سے ملاقات کرتے، صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت نکالتے اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رو رو کر دعائیں کرتے۔ کم سے کم سامان کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی تین روز تک متواتر گیہوں کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی۔ جود و ایثار کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ آتا حاجتمندوں میں تقسیم فرما دیتے۔ ایک بار نوّے ہزار درہم آپؐ کے پاس آئے۔ آپ نے ایک نشست میں یہ ساری رقم تقسیم کر دی۔ ہم بھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو کسوٹی قرار دے کر اپنے آپ کو پرکھیں اور اپنی زندگی کو آپؐ کے دستورِ حیات کے مطابق ڈھال لیں، اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے اسی طرح جہاد کریں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تو ہم بھی اللہ کے دین کو غالب کر کے دنیا میں باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں ؎

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن — اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را — جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اے مسلمان دینی غیرت و حمیّت کے بغیر کب تک زندہ رہے گا۔ تیری یہ زندگی تو مرنے کے مترادف ہے۔ مردِ مومن اپنے اندر نئے سرے سے زندگی پیدا کرتا ہے۔ اپنے آپ کو نورِ حق سے دیکھتا ہے اور خود کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تاکہ دوسرا جہان پیدا کرے۔

دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان جہاد کرے اور معرکہ آرائی کے ذریعے اپنا کھویا ہوا منصب دوبارہ حاصل کرے۔ اپنے مقصد اور نصب العین سے عشقِ کامل ہی کے ذریعے ایسے معرکے سر ہوتے ہیں۔ ایک منزل حاصل کر لینے کے بعد اس سے اگلی منزل کے لئے جد و جہد کرنا ہی اصل زندگی ہے۔ جب دل میں عشقِ حقیقی موجزن ہو اور نئے نئے مرحلے طے کرنے کا شوق پیدا ہو جائے تو ہر مرحلہ طے کرنے پر جلوۂ طور کا سا سماں نظر آنے لگتا ہے، مشکلات کا پہاڑ کوہِ طور بن جاتا ہے جسے سر کرنے پر رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے اور انسان کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ گھر میں بیٹھ رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آسمانوں کے نیچے ایسی کوئی دنیا نہیں جہاں محنت و مشقّت اور تکلیف کے بغیر بادشاہوں کا تخت میسّر آئے۔ حکومت حاصل کرنے کے لئے معرکہ آرائی ضروری ہوتی ہے ؎

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی!
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

دین کے ساتھ حکومت کی طاقت مہیا کرنے کی بات آرام طلب مذہبی پیشواؤں کو بری

محسوس ہوتی ہے۔ عُزلت نشینی اور سکون طلبی کی عادت نے انہیں جہاد کے فریضے سے غافل کر رکھا ہے۔ وہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے خود بھی جہاد نہیں کرتے اور اپنے پیروکاروں میں بھی یہ روح پھونکنے کی کوشش نہیں کرتے جس کا نتیجہ ہے کہ دنیا پر غیر مسلم اقوام نے غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔ اگرچہ اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ دنیا کی یہ پرانی روایت ہے کہ یہاں کسی چیز کو ثبات میسّر نہیں آج کوئی قوم غالب ہے تو کل کسی دوسری قوم کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن ایک چیز اٹل اور مسلّم ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں حکومت اسی قوم کو حاصل ہوتی ہے جس کے جوان زندگی کی تلخیوں کو شہد سمجھتے ہیں اور اپنے مقصد کی خاطر ہر قسم کی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ علّامہ اقبال "حکومت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ؎

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و مُلّا کو بُری لگتی ہے درویش کی بات
گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملّت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

تاریخ شاہد ہے کہ جو قوم شمشیر و سناں کے زیور سے آراستہ ہو کر معرکہ آرائی کے لیے تیار رہتی ہے وہ دنیا میں سربلند ہو کر زندگی بسر کرتی ہے اور جس قوم میں آرام طلبی اور عیش کوشی راہ پا جائے اور وہ تیر و تلوار کی بجائے باجوں گاجوں اور ساز و آواز میں مست رہنے لگے تو وہ زوال پذیر ہو کر محکوم ہو جاتی ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

مسلمان تو دنیا میں پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و جور اور فتنہ و فساد ختم کر کے عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرے۔ ظاہر ہے دنیا سے فتنہ و فساد گھر بیٹھے ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مسلسل جہاد، تگ و دو اور عمل کی ضرورت ہے۔ مسلمان شاہین ہوتا ہے اور شاہین کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اگر شاہین آسمانوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں شاہینی صفات باقی نہیں رہیں۔ اسی طرح مسلمان پر جمود کی کیفیت طاری ہو جائے اور وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جد و جہد نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں والی صفات باقی نہیں رہیں۔ وہ صحیح معنوں میں مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنے اندر مجاہدانہ صفات پیدا کرے ؎

حل نشد ایں معنیٔ مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا
در کنامے ماند زار و سرنگوں
پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں

مجھے یہ مشکل بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شاہین آسمانوں سے کیوں گریز کرتا ہے وہ سرنگوں اور بے کس اپنے آشیانے میں پڑا رہتا ہے اور فضائے نیلگوں کے اندر پرواز نہیں کرتا۔

اس وقت دنیا یورپی اقوام کی بربریت سے فسق و فجور اور ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے۔ ان اقوام کی چیرہ دستیوں نے دنیا کا امن و سکون غارت کر دیا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی قوت کو منظم کرے۔ پہلے اپنے معاشرے کی خرابیوں کو دور کرے اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیلِ نو کر کے دنیا کو ایک اسلامی وحدت میں تبدیل کرنے کے لئے جد و جہد کرے۔ افسوس! مسلمان گہری نیند سویا ہوا ہے۔ اسے اپنے فرائض اور اپنے مقام سے آگاہی نہیں۔ اگر وہ کمرِ ہمت باندھ کر عزمِ نو کے ساتھ اس کام میں لگ جائے تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے کر دنیا

کی تعمیرِ نو کا فریضہ ادا کر سکتا ہے ؎

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ حرم خیز!
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز !!

تمام جہان یورپی اقوام کی چیرہ دستیوں سے ویرانہ بنا ہوا ہے۔ اللہ کے گھر کا معمار بن اور دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ۔ گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے بیدار ہو۔ اسلام کی سربلندی کا کام حجروں میں بیٹھ کر باتیں بنانے سے نہیں ہوتا۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ وقت کے نمرودوں ظالموں اور خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرے اور انہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ کے سوا تمام خوف دل سے نکال دے، غیر اللہ کی حکمرانی قبول کرنے سے انکار کر دے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے کے لئے جہاد کرے۔ جب وہ اس کام کے لئے نکلے گا تو اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہو گی اور اللہ تعالیٰ اسے دنیا پر حکمرانی کا موقع عطا کرے گا ؎

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرماں رواست

اے حجروں میں بیٹھ کر باتیں بنانے والے! کسی نمرود کے سامنے "لا" کا نعرہ بلند کر کیونکہ جس شخص کے ہاتھ میں "لا" کی تلوار ہو وہ تمام دنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔

قرونِ اولیٰ میں مسلمان کفار سے جنگ کرتے تھے اور ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی جاری رکھتے تھے اسی لئے انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی تھی اور وہ ہر معرکے میں کامیاب ہوتے تھے۔ ان کے نعرۂ تکبیر سے کفار کے دلوں پہ رعب طاری ہوتا تھا۔

وہ عین جنگ کی حالت میں بھی نماز ادا کرتے تھے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں نماز ادا کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے اب بھی مسلمان جہاد کریں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی جاری رکھیں، نماز ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی مدد مانگیں تو وہ مشرق و مغرب کو فتح کر سکتے ہیں ؎

بانگِ تکبیر و صلوٰۃ و حرب و ضرب
اندر آں غوغا کشادِ شرق و غرب

اللہ اکبر کی آواز، نماز اور جنگ و جدل، اسی ہنگامے میں مشرق و مغرب کی فتح پوشیدہ ہے۔

حق و باطل کا معرکہ دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں بلکہ جب سے دنیا بنی ہے حق و باطل کا معرکہ جاری ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹے، روشنی کے ساتھ تاریکی اور خیر کے ساتھ شر کا وجود ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ کامیاب انسان وہی ہے جو فطرت کے اس قانون کو سمجھ کر حق کو باطل پر غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باطل کبھی نمرود بن کر سامنے آتا ہے اور کبھی فرعون بن کر مقابلہ کرتا ہے، کبھی ابوجہل اور ابولہب بن کر مدِ مقابل ہوتا ہے اور کبھی یزید کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، کبھی وہ جدید روشنی اور جدید تہذیب کا نام اختیار کرتا ہے اور کبھی سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی بے زمام جمہوریت کا روپ دھارتا ہے۔ الغرض جب تک نور و ظلمت موجود رہیں گے کلیم و فرعون کا معرکہ بھی تازہ رہے گا۔ حق کا کلمہ بلند کرنے والوں نے کبھی بدر و حنین کے معرکوں میں حق کی شہادت دی اور کبھی کربلا کے میدان کو اپنے خون سے سرخ کیا۔ کبھی گرم پتھروں کے نیچے "اللہ ایک ہے" کا نعرہ لگایا اور کبھی سولی پر چڑھ کر توحید کا گیت گایا۔ مجاہدوں کی زندگی میں کیف و سرور اسی کشاکشِ حق و باطل سے پیدا ہوتا ہے۔ جو قومیں دنیا میں اس معرکے کا سامنا کرنے سے گریز کرتی ہیں وہ دنیا سے مٹ جاتی ہیں اور جو قومیں ان معرکوں میں جان کی بازی

لگاتی ہیں وہ زندہ رہتی ہیں۔ باطل کی موجودگی مومن کے لئے سامانِ زندگی ہے۔ مسلمانوں میں اسی سے حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی!

باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے حق کی خاطر جان دینے میں ہی اصل شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں شمع پر جان دینے سے گریز کرنے والے پروانوں کے قبیلے سے نہیں ہوتے۔ مسلمان بھی وہی ہے جو حق و باطل کے معرکے میں جان کی بازی لگادے۔ ایسے موقع پر زندگی سے محبت کرنے والا مسلمان نہیں ہوتا۔ مومن کو زندگی کی نسبت شہادت کی موت زیادہ عزیز ہوتی ہے ؎

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعۂ نظیری را
"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

میں نظیری کے اس مصرعے کو جمشید بادشاہ کے ملک کے بدلے میں بھی نہ دوں کہ جو کوئی مارا نہ جائے وہ ہمارے قبیلے سے نہیں۔

قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

اللہ کے راستہ میں اس طرح جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے۔

(الحج)

ایک دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(الانفال)

نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو تو بھی بھاری ہو تو بھی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

سورۂ توبہ میں ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور جنہوں نے اللہ اور رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں سے اندرونی تعلق رکھا۔

سورۂ انفال میں ارشاد ہے:

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج۔

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کون سا عمل سب اعمال سے افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا"۔ پھر عرض کیا گیا "اس کے بعد کس کا درجہ ہے؟" فرمایا "اللہ کے راستے میں جہاد کرنا"۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو شخص مر جائے حالانکہ نہ اس نے جہاد کیا ہو اور نہ جہاد کا ارادہ کیا ہو تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا"۔

(مسلم) ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جو شخص نہ جہاد کرے اور نہ غازی کا سامان تیار کرے نہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے بال بچوں کی بھلائی کے ساتھ نگرانی کرے تو قیامت سے پہلے اللہ تعالےٰ اس کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا"

دنیا میں ہر انسان کی کوئی نہ کوئی آرزو ہوتی ہے۔ کوئی شخص مال و دولت کا تمنّائی ہوتا ہے تو کوئی جاہ و منصب کا شیدائی۔ کسی کو سیر و سیاحت کی تمنّا ہوتی ہے تو کسی کو گوشۂ عزلت میں آسودگی کی تلاش۔ مسلمان کے دل میں نہ دولت کی تمنّا ہوتی ہے اور نہ کسی عہدے اور منصب کی خواہش۔ اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنّا باطل کے ساتھ ٹکرا کر حیاتِ جاودانی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ جہاد کے متعلق اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں اس لئے اس کی آرزو تیروں اور تلواروں کے سائے میں ہی پوری ہوتی ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ جنّت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مکّے اور مدینے میں بڑی پرسکون زندگی بسر کر سکتے تھے اگر وہ چاہتے تو مال و دولت بھی ان کے قدموں میں ڈھیر ہو سکتے تھے لیکن مردِ مجاہد کے دل کی خلش اس وقت دور ہوتی ہے جب اسے باطل کے ساتھ ٹکرانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی تصادم سے اسے اپنے ایمان کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ دوست کے دشمنوں سے جنگ ہی سے دوست کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ جہاد کے ذریعے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے نکلے تھے۔ مسلمان کا مسلک بھی وہی ہوتا ہے جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا تھا اور ان کا مسلک یہ تھا کہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بذاتِ خود ایک ظلم ہے۔ اللہ تعالےٰ کا دین غالب نہ ہو تو مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور اس راستے میں سر پر کفن باندھ کر نکلتا ہے۔ ایسے مردِ مجاہد کا ساتھ بھی وہی لوگ دے سکتے ہیں جو جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بزدل اور صرف نام کے مسلمان اس مسلک کو اختیار نہیں

کر سکتے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر کے اس کے ہاں بلند مقام حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ اس مسلک کو اختیار کریں اور اس آرزو کو دل میں جگہ دیں اور جو لوگ دینِ حق کی پیروی بھی کرنا چاہیں مگر آرام کے بھی طلب گار ہوں وہ گھر میں بیٹھے اپنے نفس کی خدمت کرتے رہیں اور مختلف تاویلات کے ذریعے بیٹھے رہنے کا کوئی جواز تلاش کر لیں۔ بس ایمان کے زبانی دعوے کرتے رہیں۔ عملی میدان میں قدم رکھ کر مجاہدوں کا ساتھ دینا ان کے بس کا روگ نہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

تیر و سنان و خنجر و شمشیر م آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبّیر م آرزوست

تیر، نیزہ، تلوار اور خنجر میری آرزو ہے۔ میرے ساتھ مت آ کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا مسلک میری تمنا ہے۔

اسلام کی داستان بڑی انوکھی اور سادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوشنما بھی ہے اس کی ابتدا اطاعت سے ہوتی ہے۔ رسم و رواج شعوب و قبائل اور حسب و نسب کے بتوں کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے سے اسلام کی صرف ابتدا ہوتی ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی طرح اللہ تعالیٰ کا حکم سنتے ہی اپنی گردن چھری کے نیچے رکھ دینا تسلیم و رضا کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ اسلام کی انتہا یہ ہے کہ مومن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح گھر سے نکل کھڑا ہو اور باطل قوتوں سے معرکۂ کارزار گرم کر کے تن من دھن کی بازی لگا دے۔ اس راہ میں جو تکلیفیں آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ اللہ کے دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھائے اور پھر اپنے خون سے چمنِ اسلام کی آبیاری کر کے اسے سدا بہار گلستان بنا دے ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

باطل کو مٹانے اور حق کو غالب کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اس راہ میں مسلمان ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر مال و جان کی قربانی دے۔ اس ابدی حقیقت کو قرآنِ پاک نے بار بار بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے دوسرے لوگوں پر فضیلت دی ہے اور آخرت میں انہیں بڑے بڑے انعام و اکرام دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن کفر اور باطل کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ حق کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور کبھی زیرِ زمین سازشیں تیار کر کے منافقانہ روش اختیار کرتا ہے کبھی وہ مساواتِ محمدی کے نام سے دھوکا دیتا ہے اور کبھی سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اہلِ حق کا طریقہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ علانیہ طور پر باطل کا راستہ روکا جائے۔ یہ وہ ابدی حقیقت ہے جس کی نشاندہی حضرت امام حسینؓ نے کربلا کے میدان میں مال و جان اور اعزہ و اقربا کی قربانی دے کر کی ہے ؎

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو۔ مسلمان جب اللہ کی راہ میں خلوصِ نیت سے جہاد کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے لئے گئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا "لَا تَخَفْ" "خوف نہ کر۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بغیر کسی خوف کے فرعون کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی، آپ کے عصا کی ضرب سے دریا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اس میں مختلف راستے بن گئے اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر صحیح سلامت پار چلے گئے لیکن اسی دریا میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا۔ اب بھی مسلمان اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے

نکلے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوگی اور اس کی ضرب بھی عصائے کلیمی کی طرح کام کرے گی ؎

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم ! تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم

فرعونوں (جابر حکمرانوں) کے سامنے کلمہ رحق بلند کر تاکہ تیری ضرب دریا کو پھاڑ سکے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

مسلمان کو اپنے عمل سے پہلے اپنی نیت کا جائزہ لینا چاہیئے اور ہر کام صرف خدا کی رضا کے لئے سرانجام دینا چاہیئے۔ اس کی صلح اور جنگ، دوستی اور دشمنی صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے اس نیت سے اگر وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا تو اس کے ذریعے خدا کا جلال آشکارا ہوگا اور اس کے ہاتھوں دشمنانِ دین ذلیل و خوار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے علاوہ کسی اور غرض کے لئے صلح بھی کی جائے گی تو وہ شر ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جنگ بھی کی جائے گی تو وہ خیر بن جائے گی ؎

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار تا ز تو گردد جلالش آشکار

صلح شر گردد چو مقصود است غیر گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

ہر کام اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے سرانجام دے تاکہ تیرے ذریعے اس کا جلال ظاہر ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے صلح بھی کی جائے تو وہ شر بن جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جنگ بھی کی جائے تو وہ خیر بن جاتی ہے۔

مسلمانوں کو موجودہ حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ امتِ مسلمہ اپنے عروج و زوال کے ایک سے زائد ادوار دیکھ چکی ہے۔ موجودہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پھر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے" یہ دین ان تمام جگہوں پر پہنچے گا جہاں دن رات پہنچیں گے۔ کوئی کچا پکا گھر ایسا باقی نہ رہے گا جہاں اللہ عزوجل اسلام کو نہ پہنچائے۔ وہ عزت والوں کو عزت دے گا اور

ذلیلوں کو ذلیل کرے گا۔ اسلام کو عزت دینے والوں کو عزت ملے گی اور کفر کو ذلت نصیب ہوگی۔" مسلمان متحد ہو کر اسلام کی سربلندی کے لئے جہاد کریں تو ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ شہیدوں کا خون آخر کار رنگ لائے گا اور ان کے خون کی سُرخی چمنِ اسلام میں نئی بہاروں کا موجب بنے گی، اسلام کی مخالف طاقتیں جنہیں ہم باطل اور طاغوت کہتے ہیں سرنگوں ہو جائیں گی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے گا۔ اس وقت جو آثار نظر آ رہے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جہاد جاری رکھنا چاہیئے۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں اور اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنی ساری صلاحیتیں اس کے لئے صرف کر دیں تو آخر کار ظلمت و جہالت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ تمام دنیا پر مسلمانوں کے اعمال صالحہ کا اثر ہوگا اور وہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگیں گے۔ ایک وقت آئے گا کہ اسلام قرونِ اولیٰ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوگا۔ یہ دنیا عدل و انصاف سے بھر جائے گی اور نورِ توحید سے جگمگا اٹھے گی۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ۝

ہماری مطبوعات

اقبالیات

- روزگارِ فقیر — اوّل دوم مکمل سِٹ
  (علّامہ اقبالؒ کی سرگزشت) — سید وحید الدین فقیر
- اقبالؒ اور محبّتِ رسولؐ — ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی
- علّامہ اقبالؒ اور قرنِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین — سید عبد الصبور طارق
- اقبالؒ کا تصوّرِ دین — پروفیسر شفیق الرحمٰن ہاشمی

خواتین کے لیے کردار ساز کتابیں

- حضرت عائشہؓ
  (جلال الدین سیوطی، عباس محمود العقاد)
- تجلّی — شاہ بلیغ الدین
- قرآنی خواتین — سطوت ریحانہ
- اسوۂ حسنہؐ — بنت الاسلام
- خواتین اور دینی مسائل — سیّد ابو الاعلیٰ
- اوصافِ حمیدہ — عبد الغنی فاروق
- اسلامی انقلاب میں خواتین کا کردار — نعیم صدیقی

دلچسپ اور نصیحت آموز

حکایاتِ سعدی
صفائی کے آداب
کھانے پینے کے آداب
کیا کریں کیا نہ کریں
اطاعتِ رسولؐ
قرآن اور سائنس

تاریخ، سوانح، ثقافت وجمالیات

- حضرت ابوبکرؓ صدیق — محمد حسین ہیکل
- حضرت عثمان بن عفّانؓ — محمد حسین ہیکل
- تعلیماتِ امام غزالیؒ — مولانا محمد حنیف ندوی
- حضرت علیؓ فاتح خیبر — علی اصغر چوہدری
- آسمانِ ہدایت کے ستّر ستارے — طالب الہاشمی
- افغانستان کے پہلے مردِ مجاہد سید جمال الدینؒ افغانی — شاہد حسین رزاقی
- مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج وزوال — فیض احمد شہابی
- تاریخِ اسلام (مکمل ایک جلد میں) — ڈاکٹر حمید الدین
- کتابِ زندگی — ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
- مسلمان قاضیوں کا بے لاگ عدل — سید عبد الصبور طارق

مذہب تصوّف

- ذخیرۃ الملوک — سید امیر کبیر علی ہمدانی
- ویدک دھرم اور اسلام — سید اخلاق حسین
- اسلام، مسلمان اور غیر مسلم — یوسف قرضاوی
- مسلکِ اعتدال (حضرت علیؓ کے اقوال کی روشنی میں) — ڈاکٹر موسیٰ موسوی
- اسلام کا نظامِ تربیّت — محمد قطب
- اسلامی ریاست — سیّد ابو الاعلیٰ
- تقدیر ومشیتِ الٰہی کی حقیقت قرآن کی روشنی میں — سید ابو الاعلیٰ

اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۷۸۱ حوض سوئی والان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲